زیرِ نظر: استاد محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

۱۰

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی

اشتراکِ کاوش
اہلِ قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

زیرِ نظر: استادِ محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد دہم

ترجمہ:
سید صفدر حسین نجفی
پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور

اثرِ نگارش:
اہلِ قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

Marfat.com

پیشکش: حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب ——— تفسیر نمونہ جلد ۱۰

تالیف ——— آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ ——— سید صفدر حسین نجفی، پرنسپل جامعۃ المنتظر، لاہور

تصحیح تجدید نظر ——— ثاقب نقوی

کتابت ——— ثناءاللہ

ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ،

۱۰۔ گنگارام بلڈنگ، شاہراہ قائداعظم، لاہور

مطبع ——— آر۔ آر پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ——— ۲۰ر جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ

ہدیہ ——— ۶۵ر روپے

ہول سیل ڈیلر

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

Marfat.com

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

مدینۃ العلم دار العلوم مجددیہ
نور آباد ... کراچی

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئینِ محترم !

سلام و رحمت تفسیرِ نمونہ کی دسویں جلد کا ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اِس جلد پر کام جاری تھا تو معلوم ہوا کہ کُل جلدوں کی تعداد ستائیس ہوگئی ہے۔ فارسی میں چھبیسویں جلد چھپ گئی ہے۔ آخری جلد ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی۔

شروع شروع میں خیال تھا کہ کُل جلدیں بیس سے چوبیس کے درمیان ہوں گی۔ بعد میں یہ اندازہ چھبیس تک پہنچا اور اب ستائیس تک بات جا پہنچی ہے۔ خود مؤلف گرامی آیۃ اللہ مکارم شیرازی نے اس کی جو وجوہات بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آخری پارے کی سُورتیں اگرچہ دیکھنے میں مختصر ہیں لیکن وسیع مفاہیم و مطالب کی حامل ہیں اور زیادہ تشریح طلب ہیں۔

ہماری معلومات کے مطابق تفسیرِ نمونہ کا ترجمہ عربی، انگریزی اور دیگر مختلف زبانوں میں بھی شائع ہو رہا ہے۔ یہ امر اس دَور کی اس عظیم تفسیر کی ہمہ گیر مقبولیت و اہمیت کا ایک اور مظہر ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ کے پروگرام کے مطابق باقی ماندہ جلدوں کے تراجم اِنشاء اللہ نہایت مختصر مدّت میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں گے تاکہ قرآنِ حکیم سے متعلق دیگر کُتب اور تفاسیر کی اشاعت کا کام بہتر رفتار سے شروع ہو سکے۔ اِس سلسلے کی متعدد کتابوں کے تراجم وغیرہ کا کام پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔

اِس سال جنوری سے تفسیر کے ہدیے میں معمولی سا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اضافہ بازار میں کاغذ اور دیگر لوازمات کی ہوش رُبا گرانی کے باعث انتہائی مجبُوری کے عالم میں کیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب بھی اصل لاگت سے قیمت کم ہے اور یہ کمی ہم اہلِ خیر کے تعاون سے پُوری کرتے ہیں کیونکہ ہمارے پیشِ نظر کاروبارِ دُنیا نہیں بلکہ خدمتِ قرآن کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اسی جذبے سے ہمارے تمام کارکن اور اراکین کام کر رہے ہیں۔

دوست احباب کی طرف سے آراء، راہنمائی اور مثبت تنقید کو ہم آج بھی ہمیشہ کی طرح خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کے گراں قدر مشوروں اور راہنمائی سے ہم نے ہمیشہ استفادہ کیا ہے۔

دسویں جلد کے اِس ایڈیشن کی اشاعت میں ہم سے ہمارے محترم و مخلص مہربان سیّد اعزاز حسن گردیزی نے اپنی والدہ مرحومہ اور سسر مرحوم سیّد محمد رضا گردیزی کے ایصالِ ثواب کی غرض سے تعاون کیا ہے۔ خداوندِ کریم بتصدق قرآن و اہلِ بیتؑ ان کے مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور برادر سیّد اعزاز حسن گردیزی اور ان کے اہلِ خانہ کے حسنات میں اضافہ فرمائے۔

والسلام مع الاکرام

اللّٰھم صلِّ علٰی محمّدٍ و آلِ محمّد

مصباح القرآن ٹرسٹ

Marfat.com

اِھدَاء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

Marfat.com

یہ تفسیر

حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبدالرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبداللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

Marfat.com

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱ تفسیر مجمع البیان ——— تالیف ——— مشہور مفسر طبرسی
۲ تفسیر تبیان ——— تالیف ——— عظیم و فقید عالم شیخ طوسی
۳ تفسیر المیزان ——— تالیف ——— علامہ طباطبائی
۴ تفسیر صافی ——— تالیف ——— ملا محسن فیض کاشانی
۵ تفسیر نور الثقلین ——— تالیف ——— عبد علی بن جمعہ حویزی
۶ تفسیر برہان ——— تالیف ——— سید ہاشم بحرانی
۷ تفسیر روح المعانی ——— تالیف ——— علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸ تفسیر المنار ——— تالیف ——— محمد رشید رضا (تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ)
۹ تفسیر فی ظلال القرآن ——— تالیف ——— سید قطب
۱۰ تفسیر قرطبی ——— تالیف ——— محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱ اسباب النزول ——— تالیف ——— ابو الحسن علی بن متویہ واحدی نیشاپوری
۱۲ تفسیر مراغی ——— تالیف ——— احمد مصطفیٰ مراغی

Marfat.com

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک " ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطّوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

باالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر....؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر الله سعیهم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

Marfat.com

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا مَیں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی نو جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی دسویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا مَیں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[1] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی مَیں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

[1] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

Marfat.com

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا ۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکیں ۔

(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کرسکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کردے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگالیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بارالٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کرسکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کرسکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

یکم رجب المرجب ۱۴۰۱ ہجری

Marfat.com

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر
سورہ یوسف	
آیت ۵۴ تا ۵۷	۲۹
یوسفؑ مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے	۳۰
چند اہم نکات	۳۱
۱۔ حضرت یوسفؑ نے طاغوتِ وقت کی دعوت کیونکر قبول کی۔	۳۱
۲۔ اقتصادی مسائل اور انتظامی صلاحیت کی اہمیت۔	۳۳
۳۔ مصارف کی نگرانی۔	۳۴
۴۔ اپنی تعریف یا اپنا تعارف۔	۳۴
۵۔ روحانی اجر بہتر ہے۔	۳۵
۶۔ قیدیوں کے حقوق کی حمایت	۳۵
آیت ۵۸ تا ۶۲	۳۷
یوسفؑ کی بھائیوں کو نئی تجویز	۳۸
چند اہم نکات	۴۰
۱۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے تعارف کیوں نہ کرایا؟	۴۰
۲۔ غلہ کی قیمت کیوں واپس کردی؟	۴۱
۳۔ حضرت یوسفؑ نے بیت المال کا مال کیوں بلامعاوضہ دے دیا؟	۴۱
آیت ۶۳ تا ۶۶	۴۲
آخرکار باپ راضی ہوگئے۔	۴۳
چند اہم نکات	۴۵
۱۔ حضرت یعقوبؑ کیسے راضی ہوگئے؟	۴۵
۲۔ کیا صرف ایک قسم کافی تھی؟	۴۶
آیت ۶۷، ۶۸	۴۷
آیت ۶۹ تا ۷۶	۵۰
بھائی کو روکنے کی کوشش	۵۱
چند اہم نکات	۵۴
۱۔ یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے تعارف کیوں نہ کروایا؟	۵۵
۲۔ بے گناہ پر چوری کا الزام۔	۵۵
۳۔ چوری کی نسبت سب کی طرف کیوں دی گئی؟	۵۵
۴۔ اس زمانے میں چوری کی سزا؟	۵۵
۵۔ "سقایۃ" یا "صواع"	۵۶
آیت ۷۷ تا ۷۹	۵۷
برادرانِ یوسفؑ کی فداکاری کیوں قبول نہ ہوئی؟	۵۷
آیت ۸۰ تا ۸۲	۶۰
بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے۔	۶۱
چند اہم نکات	۶۲
۱۔ سب سے بڑا بھائی کون تھا؟	۶۲
۲۔ موجود قرائن کی بنیاد پر فیصلہ۔	۶۳
۳۔ برادرانِ یوسفؑ میں فرق۔	۶۳
آیت ۸۳ تا ۸۶	۶۴
میں وہ الطافِ الٰہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔	۶۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۸۷ تا ۹۳	۶۷
کوشش کرو اور مایوس نہ ہو۔	۶۸
چند اہم نکات	۷۲
۱۔ یوسفؑ کی قمیض کون لے کر گیا۔	۷۲
۲۔ یوسفؑ کی عظمت۔	۷۳
۳۔ کامیابی کا شکرانہ۔	۷۳
آیت ۹۴ تا ۹۸	۷۵
آخر کار لطفِ الٰہی اپنا کام کرے گا۔	۷۶
چند اہم نکات	۷۸
۱۔ یعقوبؑ نے پیراہن یوسفؑ کی خوشبو کیسے محسوس کی؟	۷۸
۲۔ انبیاء کے حالات میں فرق۔	۷۸
۳۔ بینائی کیسے لوٹ آئی!	۸۰
۴۔ استغفار کا وعدہ۔	۸۰
۵۔ توسل جائز ہے۔	۸۰
۶۔ سیاہ رات چھٹ گئی۔	۸۱
آیت ۹۹ تا ۱۰۱	۸۲
یوسفؑ، یعقوبؑ اور بھائیوں کی سرگزشت کا اختتام	۸۳
چند اہم نکات	۸۵
۱۔ کیا غیر خدا کے لیے سجدہ جائز ہے؟	۸۵
۲۔ شیطانی وسوسے۔	۸۶
۳۔ امن وامان ــ خدا کی عظیم نعمت۔	۸۷
۴۔ مقام علم کی اہمیت	۸۷
۵۔ اختتام خیر۔	۸۷
۶۔ کیا یوسفؑ کی والدہ مصر آئی تھیں؟	۸۸
آیت ۱۰۲ تا ۱۰۷	۸۹

مضمون	صفحہ نمبر
یہ دعویدار عام طور پر مشرک ہیں۔	۹۰
آیت ۱۰۸ تا ۱۱۱	۹۴
عبرت کے زندہ درس۔	۹۵
سورۂ یوسفؑ کا اختتام	۹۹
سورۂ رعد	۱۰۱
سورہ رعد کے مضامین و مشتملات	۱۰۳
آیت ۱ تا ۴	۱۰۵
آسمان وزمین اور سبزہ زار خدا کی نشانیاں ہیں۔	۱۰۶
چند اہم نکات	۱۱۳
۱۔ توحید اور قیامت میں تعلق۔	۱۱۳
۲۔ قرآن کے سائنسی معجزات۔	۱۱۶
۳۔ سورج اور چاند کی تسخیر۔	۱۱۶
آیت ۵، ۶	۱۱۷
قیامت کے بارے میں کافروں کا تعجب۔	۱۱۷
چند اہم نکات	۱۱۹
۱۔ خلقت نو کے بارے میں تعجب کیوں۔	۱۱۹
۲۔ کیا خدا ستمگروں کو بخش دیتا ہے؟	۱۱۹
آیت ۷	۱۲۱
پھر بہانہ سازی	۱۲۱
دو سوال اور ان کا جواب	۱۲۲
۱۔ کافروں کا جواب کیسے ہوا؟	۱۲۲
۲۔ "لکل قوم ھاد" سے کیا مراد ہے؟	۱۲۲
آیت ۸ تا ۱۰	۱۲۵
خدا کا بے پایاں علم	۱۲۵
چند اہم نکات	۱۲۷
۱۔ قرآن اور جنین شناسی۔	۱۲۷

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۲ - ہر چیز کی ایک حد اور مقدار ہے ۔	۱۲۸
۳ - خدا کے لیے غیب اور شہود برابر ہیں ۔	۱۲۹
۴ - علمِ خدا کی طرف توجہ کے تربیتی آثار ۔	۱۲۹
آیت ۱۱	۱۳۰
غیبی محافظ	۱۳۰
چند اہم نکات	۱۳۱
۱ - "معقبات" کیا ہیں ؟	۱۳۱
۲ - تبدیلی ہمیشہ خود ہمارے ہاتھوں سے آتی ہے	۱۳۳
آیت ۱۲ تا ۱۵	۱۳۵
عظمتِ الٰہی کی کچھ اور نشانیاں	۱۳۶
رعد و برق کی برکتیں	۱۳۶
۱ - آبیاری ؛	۱۳۷
۲ - جراثیم پر سمپاشی ؛	۱۳۷
۳ - تغذیہ اور کھاد رسانی ؛	۱۳۷
چند اہم نکات	۱۴۱
۱ - موجودات کے سجدہ کرنے سے کیا مراد ؛	۱۴۱
۲ - "طوعاً" "کرھاً" سے کیا مراد :	۱۴۱
۳ - "ظلال" کا مفہوم ؛	۱۴۱
۴ ("آصال" اور "غدو" کا مطلب)	۱۴۲
آیت ۱۶	۱۴۳
بت پرستی آخر کیوں ؟	۱۴۳
چند اہم نکات	۱۴۴
۱ - خالقیت و ربوبیت معبودیت سے مربوط ہے	۱۴۴
۲ - خود ہی سوال اور خود ہی جواب ؛	۱۴۵
۳ - چشمِ بینا اور روشنی لازم ملزوم ہیں ؛	۱۴۵
۴ - کیا خدا کی خالقیت جبر و اکراہ کی دلیل ہے ؟	۱۴۵
آیت ۱۷	۱۴۷
حق و باطل کی منظر کشی	۱۴۷
چند اہم نکات	۱۴۸
۱ - حق و باطل کی شناخت کے لیے علامتیں ؛	۱۴۹
۲ - "زبد" کیا ہے ؟	۱۴۹
۳ - فائدہ ہمیشہ اہلیت کے اعتبار سے ہوتا ہے ؛	۱۵۰
۴ - باطل سرگرداں ہے ؛	۱۵۰
۵ - باطل صرف ایک لبادے میں نہیں ہوتا	۱۵۰
۶ - ہر موجود کی بقاء اُس کے فائدے سے وابستہ ہے ؛	۱۵۱
۷ - حق باطل کو کس طرح باہر نکال پھینکتا ہے ۔	۱۵۱
۸ - باطل اپنی بقاء میں حق کا مقروض ہے ۔	۱۵۱
۹ - حق اور باطل میں ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے ۔	۱۵۱
۱۰ - زندگی جہاد اور جستجو کے سائے میں ؛	۱۵۲
قرآنی مثالیں	۱۵۲
۱ - مثال مسائل کو حسّی بنا دیتی ہے ؛	۱۵۳
۲ - مثال راستے کو مختصر کر دیتی ہے ۔	۱۵۳
۳ - مثال مسائل کو سب کے لیے یکساں بنا دیتی ہے	۱۵۳
۴ - مثال مسائل کو زیادہ قابلِ اطمینان بنا دیتی ہے	۱۵۳
۵ - مثال ہٹ دھرموں کو خاموش کر دیتی ہے ۔	۱۵۳
آیت ۱۸	۱۵۶
جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا ۔	۱۵۶
ایک نکتہ	۱۵۸
آیت ۱۹ تا ۲۴	۱۶۰
اہلِ شعور کا طرزِ عمل ۔ جنت کے آٹھ دروازے	۱۶۱
چند اہم نکات	۱۶۷
۱ - صرف "صبر" کا ذکر کیوں ہوا ہے ؟	۱۶۷

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۲- جنت کے دروازے:	۱۶۸
۳- اہل جنت سے وابستگی رکھنے والے ان سے ملیں گے۔	۱۶۸
۴- جنات عدن کیا ہے؟	۱۶۸
۵- گناہ کے آثار دھلنا:	۱۶۸
آیت ۲۵، ۲۶	۱۷۱
دنیا پرست تباہ کار	۱۷۱
چند اہم نکات	۱۷۳
۱- "مفسد فی الارض" کون ہے؟	۱۷۳
۲- روزی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن	۱۷۵
آیت ۲۷ تا ۲۹	۱۷۸
یاد الٰہی باعث تسکین دل ہے۔	۱۷۸
چند اہم نکات	۱۸۰
۱- یاد الٰہی سے دل کو کیسے سکون ملتا ہے؟	۱۸۰
پریشانی اور اضطراب کے عوامل۔	
۲- کیا خوف خدا اور اطمینان باہم مطابقت رکھتے ہیں؟	۱۸۳
۳ "ذکر خدا" کیا ہے اور کس طرح ہے؟	۱۸۳
آیت ۳۰ تا ۳۲	۱۸۵
شان نزول	۱۸۶
ہٹ دھرم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔	۱۸۷
چند اہم نکات	۱۸۹
۱- لفظ "رحمٰن" کیوں استعمال کیا گیا ہے؟	۱۸۹
۲- پیغمبر اکرمؐ نے معجزات کا تقاضا کیوں پورا نہ کیا؟	۱۸۹
۳- "قارعۃ" کیا ہے؟	۱۹۰

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۳۳، ۳۴	۱۹۱
کس طرح خدا کو بتوں کا شریک بناتے ہو؟	۱۹۱
آیت ۳۵	۱۹۴
آیت ۳۶	۱۹۶
خدا پرست اور دیگر گروہ	۱۹۶
ایک اہم نکتہ	۱۹۸
ایمان اور جماعتی وابستگیاں،	۱۹۸
آیت ۳۷ تا ۴۰	۱۹۹
قطعی اور قابل تغیر حوادث	۲۰۰
دو اہم نکات	۲۰۳
۱- لوح محو و اثبات اور ام الکتاب:	۲۰۳
۲- بدا کیا ہے؟	۲۰۵
آیت ۴۱ تا ۴۳	۲۰۹
انسان اور معاشرے ختم ہو جاتے ہیں، خدا باقی رہتا ہے۔	۲۰۹
پروردگارا!	۲۱۲
بارالٰہا!	۲۱۲
خداوندا!	۲۱۲
سورہ ابراہیم	۲۱۵
اس سورہ کے مضامین	۲۱۷
اس سورہ کی فضیلت	۲۱۷
آیت ۱ تا ۳	۲۱۹
ظلمتوں سے نور کی طرف	۲۲۰
چند اہم نکات	۲۲۲
۱- ایمان اور راہ خدا کو نور سے تشبیہ دینا:	۲۲۲
۲- "لتخرج" کا مفہوم:	۲۲۳

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۳ ۔ سورۃ کے آغاز اور اختتام پر ایک نظر	۲۲۳
آیت ۵ تا ۷	۲۲۴
زندگی کے حساس دن	۲۲۵
چند اہم نکات	۲۲۹
۱ ۔ ایام اللہ کی یاد آوری؛	۲۲۹
۲ ۔ جابروں کے طور طریقے	۲۳۰
۳ ۔ سب سے بڑی نعمت آزادی ہے؛	۲۳۰
۴ ۔ شکرِ نعمت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ	۲۳۰
پہلا مرحلہ	۲۳۱
دوسرا مرحلہ	۲۳۱
تیسرا مرحلہ	۲۳۱
شکرِ نعمت کے بارے میں چند اہم نکات	۲۳۳
آیت ۸ تا ۱۰	۲۳۵
کیا خدا کے بارے میں شک ہے؟	۲۳۶
آیت ۱۱، ۱۲	۲۴۰
صرف اللہ پر توکل کرو۔	۲۴۰
چند اہم نکات	۲۴۲
۱ ۔ مومنین اور متوکلین	۲۴۲
۲ ۔ انبیاء اور معجزات	۲۴۲
۳ ۔ توکل کی حقیقت اور فلسفہ۔	۲۴۲
توکل کا فلسفہ	۲۴۳
ثانیاً	۲۴۴
آیت ۱۳ تا ۱۷	۲۴۶
منحرف جابروں کا طرزِ عمل اور ان کا انجام	۲۴۷
چند اہم نکات	۲۵۰
۱ ۔ مقام پروردگار سے کیا مراد ہے؟	۲۵۰
۲ ۔ "استفتحوا" کا مفہوم؛	۲۵۱
۳ ۔ ایک جابر حکمران اور قرآن کی آیت۔	۲۵۱
آیت ۱۸	۲۵۲
تیز آندھی اور خاکستر	۲۵۲
چند اہم نکات	۲۵۲
۱ ۔ بکھر جانے والی راکھ	۲۵۲
۲ ۔ کافروں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں	۲۵۳
۳ ۔ ایک طوفانی دن اور آندھی	۲۵۳
۴ ۔ پتوں اور راکھ کے بکھرنے میں فرق ہے۔	۲۵۳
۵ ۔ تیز آندھی کے اثرات	۲۵۳
۶ ۔ ان کے اعمال کیوں کھوکھلے ہیں؟	۲۵۴
۷ ۔ مسئلہ احباط	۲۵۴
۸ ۔ کیا ایجادات اور انکشافات کرنے والوں کے لیے بھی جزا ہے؟	۲۵۵
آیت ۱۹، ۲۰	۲۵۹
خلقت حق کی اساس پر ہے۔	۲۵۹
آیت ۲۱ تا ۲۳	۲۶۱
شیطان اور اس کے پیروکاروں کی صریح گفتگو۔	۲۶۲
چند اہم نکات	۲۶۳
۱ ۔ ایک اشکال کی وضاحت	۲۶۳
۲ ۔ "لو هدانا الله لهدينكم" کا مفہوم؛	۲۶۳
۳ ۔ اندھی تقلید کی مذمت۔	۲۶۴
۴ ۔ "بروز" اور "محیص" کا مفہوم؛	۲۶۴
چند اہم نکات	۲۶۵
۱ ۔ شیطان کا اپنے پیروکاروں کو سخت جواب۔	۲۶۵
۲ ۔ روزِ حشر شیطان کا اپنے پیروکاروں سے رابطہ	۲۶۵

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۳ - گمراہی کے پیشواؤں کا طرز عمل؛	۲۶۶
۴ - "مصرخ" کا مطلب:	۲۶۶
۵ - شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد۔	۲۶۶
۶ - "ان الظٰلمین لھم عذاب الیم" کس کا جملہ ہے؟	۲۶۶
آیت ۲۴ تا ۲۷	۲۶۷
"شجرہ طیبہ" اور "شجرہ خبیثہ"	۲۶۸
چند اہم نکات	۲۷۲
۱ - کیا آخرت سے مراد قبر ہے؟	۲۷۲
۲ - ثبات اور استقامت کا اثر۔	۲۷۳
۳ - روایاتِ اسلامی میں شجرہ طیبہ اور شجرہ خبیثہ:	۲۷۳
آیت ۲۸ تا ۳۰	۲۷۵
کفرانِ نعمت کا انجام	۲۷۵
چند اہم نکات	۲۷۶
۱ - نعمت کو کفر میں بدل دیا:	۲۷۶
۲ - نعمت سے سوئے استفادہ کفران نعمت ہے	۲۷۷
۳ - "انداد" کا مفہوم	۲۷۷
آیت ۳۱ تا ۳۴	۲۷۹
قرآن کی نگاہ میں انسان کی عظمت	۲۸۰
چند اہم نکات	۲۸۱
۱ - خالق اور مخلوق سے رشتہ؛	۲۸۱
۲ - انفاق پنہاں اور آشکار کیوں؟	۲۸۲
۳ - اُس دن "بیع" اور "خلال" نہیں ہے	۲۸۲
۴ - اے انسان! تمام موجودات تیرے فرمان پر سر تسلیم خم ہیں؛	۲۸۳
۵ دائبین	۲۸۴

مضمون	صفحہ نمبر
۶ - جو کچھ ہم خدا سے چاہتے ہیں کیا وہ دیتا ہے؟	۲۸۵
۷ - اس کی نعمتیں کیوں قابل شمار نہیں:	۲۸۵
۸ - افسوس کہ انسان "ظلوم" اور "کفار" ہے:	۲۸۵
آیت ۳۵ تا ۴۱	۲۸۶
ابراہیم بت شکن کی اصلاحی دعائیں	۲۸۸
چند اہم نکات	۲۹۱
۱ - کیا مکہ اس وقت شہر تھا؟	۲۹۱
۲ - مکہ سرزمین امن	۲۹۱
۳ - ابراہیمؑ بت پرستی سے دوری کی دعا کیوں کرتے ہیں؟	۲۹۲
۴ - ابراہیمؑ کے تابع کون ہیں!	۲۹۲
۵ - وادی "غیر ذی زرع" اور خدا کا پُرامن حرم	۲۹۳
۶ - حضرت ابراہیمؑ کی سات دعائیں:	۲۹۴
۷ - کیا ابراہیمؑ اپنے والد کے لیے دعا کر رہے ہیں	۲۹۵
آیت ۴۲ تا ۴۵	۲۹۶
جس روز آنکھیں پتھرا جائیں گی۔	۲۹۷
چند اہم نکات	۲۹۹
۱ - پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کیوں ہے؟	۲۹۹
۲ - "یوم یأتیھم العذاب" سے کون سا دن مراد ہے؟	۲۹۹
۳ - مہلت کا تقاضا کیوں قبول نہیں کیا جاتا؟	۳۰۰
آیت ۴۶ تا ۵۲	۳۰۲
ظالموں کی کمزور سازشیں۔	۳۰۳
چند اہم نکات	۳۰۷
۱ - زمین اور آسمان بدل جائیں گے،	۳۰۷
۲ - سورہ ابراہیم کا آغاز اور اختتام،	۳۰۹

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
۳ ۔ اوّل و آخر ۔ توحید	۳۱۰	آزر سے گفتگو	۳۱۷
سورہ ابراہیم اختتام	۳۱۱	دورِ نبوت	۳۱۷
حضرت ابراہیمؑ	۳۱۵	عملی مقابلے کا آغاز	۳۱۷
زندگی کے تین دور	۳۱۵	سلطان جابر کے سامنے	۳۱۸
بچپن	۳۱۵	ہجرت	۳۱۸
بت پرستوں سے مقابلہ	۳۱۶	رسالت کا آخری مرحلہ	۳۱۹
منطق اور استدلال کے سہارے	۳۱۶	قرآن اور ابراہیمؑ کا مقام بلند	۳۲۰

Marfat.com

تفسیر نمونہ

دسویں جلد

کا آغاز
سورۂ یوسف کی آیت ۵۴ سے ہوتا ہے
اور اختتام
سورۂ ابراہیم کے خاتمے پر ہوتا ہے
اس جلد میں ــــــ

حضرت یوسفؑ کی مصر میں حکمرانی کا دور، بھائیوں کی ان کی خدمت میں آمد، باپ کی خدمت میں آپ کی قمیص کا پہنچنا، بھائیوں اور ماں باپ کا آپ کے حضور سجدہ اور اس دور کے دیگر واقعات کا تذکرہ ہے۔

سورۂ رعد کی تفسیر کے حوالے سے مبداء و معاد کی بحث اور اخلاقی تعلیمات ہیں۔

نیز سورۂ ابراہیم کی تفسیر کے ضمن میں خدا شناسی کی بحثیں ہیں، آخرت کی گفتگو ہے، حضرت ابراہیمؑ کی انسان ساز دعائیں ہیں اور آخر میں حضرت ابراہیمؑ کا ایک سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ تفسیر ــــــ قرآن پاک پر ایک تازہ تحقیق ہے۔ جس میں عصر حاضر کی ضروریات، تقاضوں، سوالات اور مختلف مکاتبِ خیال کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

Marfat.com

۵۴۔ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ○

۵۵۔ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ○

۵۶۔ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ○

۵۷۔ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ○

ترجمہ

۵۴۔ مصر کے بادشاہ نے کہا: اس (یوسف) کو میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اسے اپنے ساتھ مخصوص کرلوں۔ جب (یوسف اُس کے پاس آئے اور) اُس سے گفتگو کی (تو بادشاہ کو ان کی عقل وفہم کا اندازہ ہوا) تو اُس نے کہا: آج تو ہمارے ہاں اعلیٰ قدر ومنزلت رکھتا ہے تو قابلِ اعتماد ہے۔

۵۵۔ (یوسف نے) کہا: مجھے (مصر کی) زمین کے خزانوں کا سرپرست بنادے کیونکہ میں حفاظت کرنے والا اور آگاہ ہوں۔

۵۶۔ اس طرح ہم نے یوسف کو (مصر کی) زمین میں قدرت دی کہ اب جہاں چاہتا اُس میں رہتا (اور اس میں تصرف کرتا)، ہم جسے چاہتے ہیں (اور لائق سمجھتے ہیں) اپنی رحمت سے نوازتے ہیں اور ہم نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

۵۷۔ اور جو ایمان لائے ہیں اور پرہیزگار ہیں آخرت کا اجر ان کے لیے بہتر ہے۔

Marfat.com

تفسیر

یوسفؑ مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے

حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم نبی کی عجیب زندگی کی تفصیل میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ آخر کار ان کی پاکدامنی سب پر ثابت ہو گئی یہاں تک کہ ان کے دشمنوں نے ان کی پاکیزگی کی گواہی دی اور یہ ثابت ہو گیا کہ جس گناہ کی وجہ سے وہ زندان میں ڈالے گئے تھے وہ پاکدامنی، تقویٰ اور پرہیزگاری کے سوا کچھ نہ تھا۔

ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ بے گناہ قیدی علم، آگہی، دانشمندی، انتظامی صلاحیت اور فہم و فراست کی بہت اعلیٰ سطح کا مرکز ہے کیونکہ اس نے "ملک" (بادشاہ مصر) کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے آئندہ کی پیچیدہ اقتصادی مشکلات بیان کرتے ہوئے ساتھ ہی ان سے نجات کے راستے کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے: "بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اسے اپنا مشیر اور نمائندہ خاص بناؤں" اور اپنی مشکلات حل کرنے کے لیے اُس کے علم و دانش اور انتظامی صلاحیت سے مدد لوں (وقال الملك ائتونى به استخلصه لنفسى)۔

بادشاہ کا پُرجوش پیام لے کر اُس کا خاص نمائندہ قید خانے میں یوسفؑ کے پاس پہنچا۔ اس نے بادشاہ کی طرف سے سلام و دعا پہنچایا اور بتایا کہ اُسے آپ سے شدید لگاؤ ہو گیا ہے۔ اس نے مصر کی عورتوں کے بارے میں تحقیق سے متعلق آپ کی درخواست کو عملی جامہ پہنایا ہے اور سب نے کھل کر آپ کی پاکدامنی اور بے گناہی کی گواہی دی ہے۔ لہٰذا اب تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں رہی اُٹھیے تاکہ ہم اُس کے پاس چلیں۔

حضرت یوسفؑ بادشاہ کے پاس تشریف لائے۔ اُن کی آپس میں بات چیت ہوئی۔ بادشاہ نے ان کی گفتگو سنی اور آپ کی پُرمغز اور نہایت اعلیٰ باتیں سُنیں۔ اُس نے دیکھا کہ آپ کی باتیں انتہائی علم و دانش اور دانائی سے معمور ہیں تو پہلے سے بھی زیادہ آپ کا شیفتہ ہو گیا۔ کہنے لگا: آپ آج سے ہمارے ہاں اعلیٰ قدر و منزلت اور وسیع اختیارات کے حامل ہیں اور ہمارے نزدیک قابلِ اعتماد رہیں گے (فلما كلمه قال انك اليوم لدينا مكين امين)۔

آج سے اس ملک کے اہم کام آپ کے سپرد ہیں اور آپ کو امور کی اصلاح کے لیے کمرِ ہمت باندھ لینا چاہیے کیونکہ میرے خواب کی جو تعبیر آپ نے بیان کی ہے اُس کے مطابق اس ملک کو شدید اقتصادی بحران درپیش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بحران پر صرف آپ ہی قابو پا سکتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ نے تجویز پیش کی کہ مجھے اس علاقے کے خزانوں کی ذمہ داری سونپ دی جائے کیونکہ میں اچھا محافظ ہوں اور اس کام کے اسرار سے بھی واقف ہوں (قال اجعلنى على خزائن الارض انى حفيظ عليم)۔

حضرت یوسفؑ اچھی طرح جانتے تھے کہ ظلم سے بھرے اس معاشرے کی پریشانیوں کی ایک اہم بنیاد اس کے اقتصادی مسائل ہیں۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اب جب کہ انہیں مجبوراً آپ کی طرف آنا پڑا ہے تو کیا ہی اچھا ہے کہ مصر کی اقتصادیات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور محروم و مستضعف عوام کی مدد کے لیے آگے بڑھیں اور جتنا ہو سکے طبقاتی تفاوت اور اُونچ نیچ کو کم کریں، مظلوموں کا حق ظالموں سے لیں اور اس وسیع ملک

Marfat.com

کی بدحالی کو دُور کریں۔ آپ کی نظر میں تھا کہ خاص طور پر زرعی مسائل اِس ملک میں زیادہ اہم ہیں اس بات پر بھی توجہ رکھنا ہوگی کہ چند سال فراوانی کے ہوں گے اور پھر خشکی کے سال درپیش ہوں گے لہٰذا لوگوں کو زیادہ سے زیادہ غلے پیدا کرنے اور پھر انہیں احتیاط سے محفوظ رکھنے اور نہایت کم خرچ کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا تاکہ قحط کے سالوں کے لیے غلہ ذخیرہ کیا جاسکے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے آپ کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ آپ مصر کے خزانوں کو اپنی سرپرستی میں لینے کی تجویز پیش کریں۔

بعض نے لکھا ہے کہ اس سال بادشاہ سخت مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور کسی طرح ان سے نجات چاہتا تھا لہٰذا اس نے تمام امور کی باگ ڈور حضرت یوسفؑ کے ہاتھ میں دے دی اور خود کنارہ کشی اختیار کرلی۔

بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ اُس نے عزیزِ مصر کی جگہ حضرت یوسفؑ کو اپنا وزیرِ اعظم بنا لیا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے ظاہری مفہوم کے مطابق وہ صرف مصر کے وزیرِ خزانہ بنے ہوں لیکن اسی سورہ کی آیت ۱۰۰ اور ۱۰۱ کہ جن کی تفسیر انشاء اللہ آئے گی اس امر کی دلیل ہیں کہ آخر کار آپ بادشاہ ہوگئے اور تمام امورِ مملکت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ آگئی۔ اگرچہ آیت ۸۸ میں ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے اُن سے کہا: "یاایھا العزیز"

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ نے عزیزِ مصر کا منصب سنبھالا مگر اس میں کوئی مانع نہیں کہ آپ نے یہ مناصب تدریجاً حاصل کیے ہوں۔ پہلے وزیرِ خزانہ ہوئے ہوں، پھر وزیرِ اعظم اور پھر بادشاہ۔

بہرحال اس مقام پر خدا کہتا ہے، اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو سرزمینِ مصر پر قدرت عطا کی کہ وہ جیسے چاہتا تھا اس میں تصرف کرتا تھا (وکذالک مکنا لیوسف فی الارض یتبوء منھا حیث یشاء)۔

جی ہاں! ہم اپنی رحمت اور مادی و روحانی نعمتیں جسے چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں عطا کرتے ہیں (نصیب برحمتنا من نشاء)۔

"اور ہم نیکوں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کریں گے، اگرچہ اس میں تاخیر ہوجائے تاہم آخر کار جو کچھ ان کے لائق ہوا انہیں دیں گے کیونکہ ہم کسی نیک کام کو فراموش نہیں کرتے (ولا نضیع اجر المحسنین)۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم صرف دنیاوی اجر ہی نہیں دیں گے بلکہ "جو اجر انہیں آخرت میں ملے گا وہ اہلِ ایمان اور صاحبانِ تقویٰ کے لیے زیادہ اچھا ہے" (ولاجر الاٰخرۃ خیر للذین اٰمنوا وکانوا یتقون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **حضرت یوسفؑ نے طاغوتِ وقت کی دعوت کیونکر قبول کی؟** زیرِ بحث آیات کی طرف توجہ ہوتے ہی پہلا سوال جو ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم نبی طاغوت زمانہ سے وزارتِ خزانہ یا وزارتِ عظمٰی کا منصب قبول کرنے اور اس کے ساتھ مل کر کام کرنے پر کیسے تیار ہوگئے؟

اس سوال کا جواب خود مندرجہ بالا آیات ہی میں پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے یہ منصب ایک "حفیظ و علیم" شخصیت کی حیثیت سے قبول کیا تاکہ عوام کے مفاد میں بیت المال کی حفاظت کریں اور اُسے انہی کے مفاد میں خرچ کریں خصوصاً مستضعف اور محروم عوام کے حقوق کہ جو اکثر معاشروں میں پامال ہوتے ہیں اُن تک پہنچائیں۔

Marfat.com

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے وہ علم تعبیر کے ذریعے جانتے تھے کہ مصری قوم کو ایک شدید اقتصادی بحران پیش آنے والا ہے لہٰذا اس کے مقابلے کے لیے دقیق پروگرام اور قریب سے اس کی نگرانی کے بغیر ممکن تھا کہ بہت سے لوگ تباہ و برباد ہو جاتے۔ لہٰذا اس مصیبت سے عوام کی نجات اور بے گناہ انسانوں کی جان کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ حضرت یوسفؑ کو جو موقع مل رہا تھا اس سے فائدہ اٹھاتے اور تمام لوگوں خصوصاً محروم عوام کے لیے اس سے استفادہ کرتے کیونکہ اقتصادی بحران اور قحط سالی میں سب سے زیادہ خطرہ انہی لوگوں کی جان کو تھا اور بحرانوں کی پہلی قربانی یہی لوگ ہوتے ہیں۔

فقہ میں ظالم کی حکومت قبول کرنے کی بحث میں بھی یہ بات تفصیل سے آئی ہے کہ ظالم کی طرف سے کوئی منصب قبول کرنا ہمیشہ حرام نہیں ہوتا بلکہ کبھی مستحب بھی ہوتا ہے، حتیٰ کہ کبھی واجب بھی ہوتا ہے اور ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب اس منصب کو قبول کرنے کے فوائد اور دینی تقاضے اس کی حکومت کو تقویت پہنچنے کے نقصانات سے زیادہ ہوں۔

متعدد روایات میں ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ بھی اپنے قریبی ساتھیوں کو اس قسم کی اجازت دے دیتے تھے مثلاً علی بن یقطین امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے فرعون ہارون الرشید کی وزارت امامؑ کی اجازت سے قبول کی۔

بہرصورت اس قسم کے مناصب قبول کرنے یا رد کرنے کا انحصار "قانونِ اہم و مہم" پر ہے۔ اسکے نفع و نقصان کو دینی اور اجتماعی لحاظ سے پرکھا جانا چاہیے۔ بہت سے مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ایسا عہدہ قبول کرنا ظالم کی معزولی پر منتج ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات کے مطابق حضرت یوسفؑ کے ساتھ بھی یہی اتفاق ہوا اور کبھی ایسا عمل بعدازاں انقلاب و قیام کا سرچشمہ بن جاتا ہے کیونکہ منصب قبول کرنے والا شخص حکومت کے اندر سے انقلاب کی راہ ہموار کرتا ہے۔ شاید مومن آلِ فرعون اسی قسم کی ایک مثال تھے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسے افراد مظلوموں اور محروموں کے لیے پناہ گاہ بن جاتے ہیں اور ان کے لیے حکومتی ظلم میں کمی کا باعث بن جاتے ہیں۔

ان مقاصد میں سے کوئی ایک بھی حاصل ہو رہا ہو تو ایسے عہدے قبول کرنے کا جواز بن جاتا ہے۔

ایک مشہور روایت میں امام صادقؑ ایسے ہی افراد کے بارے میں فرماتے ہیں:

کفارة عمل السلطان قضاء حوائج الاخوان

ظالم حکومت کا ساتھ دینے کا کفارہ یہ ہے کہ بھائیوں کی ضروریات پوری کی جائیں[1]

یہ روایت بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

لیکن یہ مسئلہ ایسے مسائل میں سے ہے کہ جن میں حلال و حرام کی سرحد ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہوتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان تھوڑی سی سہل انگاری کی وجہ سے غلط طور پر ظالم کا ساتھ دینے لگتا ہے اور کسی بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے جب کہ وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں عبادت اور خدمتِ خلق میں مشغول ہوں۔

بعض اوقات سوءِ استفادہ کرنے والے افراد حضرت یوسفؑ یا علی بن یقطین کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں اور اسے بہانے کے

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۲ صـ ۱۳۹ (سفینۃ البحار جلد ۲ صـ ۲۵۲ پر اسی قسم کا مضمون امام کاظمؑ سے علی بن یقطین کے بارے میں منقول ہے)۔

Marfat.com

طور پر استعمال کرتے ہیں حالانکہ ان کے کام کو حضرت یوسفؑ اور علی بن یقطین سے کوئی نسبت نہیں ہوتی[1]

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ مصر کا ظالم بادشاہ اس کے لیے کیسے تیار ہو گیا جب کہ وہ جانتا تھا کہ حضرت یوسف ظلم و ستم استعماری ہتھکنڈوں اور استثمار کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے بلکہ اس کے برعکس اس کے مظالم میں رکاوٹ بنیں گے۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں رہتا۔ وہ یہ کہ بعض اوقات معاشرتی اور اقتصادی بحران اس طرح کے ہوتے ہیں کہ خودسروں کی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں اس طرح سے کہ انہیں اپنی ہر چیز خطرے میں نظر آتی ہے۔ ایسے مواقع پر ہلاکت سے بچنے کے لیے وہ یہاں تک تیار ہو جاتے ہیں کہ ایک عادلانہ عوامی حکومت کو قبول کر لیں تاکہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

۲۔ **اقتصادی مسائل اور انتظامی صلاحیت کی اہمیت :** بعض مکاتب بالکل یک جہتی ہیں اور ہر چیز کو اقتصادی پہلو میں منحصر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے انسان اور اس کے وجود کی مختلف جہات کو نہیں پہچانا۔ ہم اگرچہ ان مکاتب سے اتفاق نہیں کرتے تاہم معاشروں کی زندگی میں خصوصیت سے اقتصادی مسائل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مندرجہ بالا آیات بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کیونکہ تمام مناصب میں سے حضرت یوسفؑ نے وزارتِ خزانہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے ٹھیک کر لیا تو مصر کی زیادہ تر پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور عدالتِ اقتصادی کے ذریعے وہ دوسری مشکلات پر بھی قابو پا سکیں گے۔

اسلامی روایات میں بھی اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک مشہور حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے جس میں لوگوں کی روحانی اور مادی زندگی (قوام الدین و الدنیا) کی حقیقی دو بنیادوں میں سے ایک اقتصادی مسائل بیان کی گئی ہے جب کہ دوسری آگہی اور علم و دانش کو شمار کیا گیا ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے ابھی تک اس اہمیت کی طرف توجہ نہیں کی کہ جو اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اس حصے کو دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان زندگی کے اس حصے میں اپنے دشمنوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور پس ماندہ ہیں۔

لیکن مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں روز بروز بیداری اور آگاہی میں اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں مسلمان اقتصادی میدان میں کاوشوں کو ایک بہت بڑی اسلامی عبادت سمجھتے ہوئے انجام دینے لگیں گے اور اس لحاظ سے اسلام کے بے رحم دشمنوں کی نسبت جو پس ماندگی ہے اُسے دور کریں گے۔

ضمناً حضرت یوسفؑ نے یہ جو کہا ہے کہ "انی حفیظ علیم" — اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے کسی حساس منصب کو قبول کرنے کے لیے صرف امانت داری ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت بھی ضروری ہے اور اس کے علاوہ علم و آگاہی اور مہارت بھی ضروری ہے کیونکہ آپ نے "حفیظ" کے ساتھ ساتھ "علیم" بھی کہا ہے۔

---

[1] کئی ایک روایات جو امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہیں میں ہے کہ کچھ افراد جو اسلامی معیاروں سے ناآشنا تھے بعض اوقات آپؑ پر اعتراض کرتے کہ آپؑ نے اس زہد و تقویٰ اور دنیا سے بے اعتنائی کے باوجود مامون کی ولی عہدی کو قبول کر لیا ہے۔ امامؑ نے جواب میں فرمایا: کیا پیغمبر افضل ہے یا وصی پیغمبر؟ انہوں نے کہا، نہیں پیغمبر ہی افضل ہے۔ فرمایا: کون افضل ہے مسلمان یا مشرک؟ انہوں نے عرض کیا: مسلمان۔ فرمایا: عزیز مصر مشرک تھا اور یوسفؑ پیغمبر تھا اور مامون (ظاہراً) مسلمان ہے اور میں پیغمبر کا وصی ہوں اور یوسفؑ نے عزیز مصر سے چاہا کہ انہیں مصر کے خزانوں پر مامور کریں اور کہا کہ میں حفیظ و علیم ہوں جب کہ میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور تھا۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۴۶)

Marfat.com

ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ بے خبری، عدم مہارت اور انتظامی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے جو خطرات پیدا ہو جاتے ہیں وہ خیانت سے پیدا ہونے والے خطرات سے کم نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات اس سے بدتر اور زیادہ ہوتے ہیں۔

ان واضح اسلامی تعلیمات کے باوجود معلوم نہیں بعض مسلمان انتظامی صلاحیت اور علم و آگہی کے مسئلے کو کوئی اہمیت کیوں نہیں دیتے اور عہدے سپرد کرنے کے لیے وہ صرف امانت و دیانت کو شرائط سمجھتے ہیں حالانکہ پیغمبر اسلامؐ اور حضرت علیؑ کے دورِ حکومت میں ان کی سیرت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بزرگوار آگاہی اور انتظامی صلاحیت کو امانت و دیانت کی طرح اہمیت دیتے تھے۔

۳۔ **مصارف کی نگرانی:** اقتصادی مسائل میں صرف زیادہ سے زیادہ اجناس پیدا کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بعض اوقات مصارف اور مخارج پر کنٹرول کرنا اس سے بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے دورِ حکومت میں فراوانیِ نعمت کے سات سالوں میں مصارف پر سختی سے کنٹرول کیا تاکہ اجناس کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ سختی کے سالوں کے لیے بچا کر رکھ سکیں۔

درحقیقت یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ زیادہ پیداوار اس وقت مفید ہوتی ہے جب اسے زیادہ صحیح طور پر کنٹرول کر کے استعمال کیا جا سکے اور مصارف پر کنٹرول اس وقت زیادہ مفید ہے جب اس کے ساتھ پیداوار بھی زیادہ سے زیادہ ہو۔

مصر میں حضرت یوسفؑ کی اقتصادی سیاست سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ترقی پذیر اقتصادی نظام صرف زمانہ حال پر نظر نہیں رکھتا بلکہ آئندہ پر بھی نظر رکھتا ہے بلکہ آئندہ نسلوں پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے اور یہ انتہائی خودغرضی ہے کہ ہم صرف اپنے آج کے منافع کی فکر میں رہیں مثلاً زمین میں موجود تمام ذخائر کو لوٹ لیں اور آئندہ آنے والوں کی کوئی فکر نہ کریں اور یہ نہ سوچیں کہ وہ کن حالات میں زندگی بسر کریں گے کیا ہمارے بھائی صرف وہی ہیں جو آج ہمارے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور بعد میں آنے والے ہمارے کچھ نہیں لگتے؟

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے مصر کے لوگوں میں طبقاتی تفاوت اور لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کے لیے قحط کے سالوں سے استفادہ کیا۔ آپ نے زیادہ پیداوار کے مرحلے میں لوگوں سے غذائی مواد خرید لیا اور اس کے لیے تیار کیے گئے بڑے بڑے گوداموں میں اسے ذخیرہ کر لیا۔ جب یہ سال گزر گئے اور قحط کے سال شروع ہوئے تو پہلے سال اجناس کو درہم و دینار کے بدلے بیچا۔ اس طرح کرنسی کا ایک بڑا حصہ جمع کر لیا۔ دوسرے سال اسبابِ زینت اور جواہرات کے بدلے اجناس کو بیچا۔ البتہ جن کے پاس یہ چیزیں نہ تھیں انہیں مستثنیٰ رکھا۔ تیسرے برس چوپایوں کے بدلے، چوتھے برس غلاموں اور کنیزوں کے عوض، پانچویں برس عمارات کے بدلے، چھٹے برس زرعی زمینوں اور پانی کے عوض اور ساتویں سال خود مصر کے لوگوں کے بدلے اجناس دیں۔ پھر یہ سب چیزیں انہیں (عادلانہ طور پر) واپس کر دیں اور کہا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ عوام کو بلاؤ مصیبت اور بے سروسامانی سے نجات دلاؤں۔[1]

۴۔ **اپنی تعریف یا اپنا تعارف:** اس میں شک نہیں کہ اپنی تعریف کرنا ایک ناپسندیدہ کام ہے لیکن اس کے باوجود یہ کلی قانون نہیں بعض اوقات حالات کا تقاضا ہوتا ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ انسان معاشرے کو اپنا تعارف کروائے تاکہ لوگ اسے

۱۔ اس حدیث کو اختصار سے ذکر کیا گیا ہے اور صرف مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ یہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے منقول ہے۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۲۴۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

پہچانیں اور اس کی مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور وہ ایک پوشیدہ اور متروک خزانے کی طرح نہ رہ جائے۔

مندرجہ بالا آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے مصر کی وزارتِ خزانہ کے منصب کے لیے آپ کو تجویز کرتے ہوئے "حفیظ علیم" کے الفاظ سے اپنی تعریف کی کیونکہ ضروری تھا کہ بادشاہِ مصر اور دوسرے لوگ جان لیں کہ آپ ایسی صفات کے حامل ہیں جو اس شعبے کی سرپرستی کے لیے بہت ہی ضروری ہیں۔

اسی لیے تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ سے سوال کیا گیا: کیا جائز ہے کہ انسان آپ اپنی تعریف کرے۔

آپؑ نے فرمایا:

نعم، اذا اضطر الیہ اما سمعت قول یوسف اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم وقول العبد الصالح وانا لکم ناصح امین

جی ہاں! جب اس کے سوا چارہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کیا تو نے حضرت یوسف کا قول نہیں سنا۔ انہوں نے فرمایا: مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو کیونکہ میں امین و آگاہ ہوں۔ اسی طرح خدا کے عبدِ صالح (ہودؑ) نے فرمایا: میں تمہارے لیے خیر خواہ اور امین ہوں[1]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خطبہ شقشقیہ اور نہج البلاغہ کے دیگر خطبوں میں حضرت علیؑ نے جو اپنی تعریف کی ہے اور اپنے آپ کو محورِ خلافت کا قطب قرار دیا ہے کہ جس کی اوجِ فکر اور مقام والا تک فکرِ انسانی کا پرندہ پر نہیں مار سکتا اور علوم کے آبشار ان کے کوہسارِ وجود سے گرتے ہیں ـــ اور اسی قسم کی دیگر تعریفیں ـــ سب اس لیے ہیں کہ ناآگاہ اور بے خبر لوگ آپ کے مقام کو سمجھیں اور آپ کے گنجینۂ وجود سے معاشرے کی بہبود کے لیے استفادہ کریں۔

۵۔ **روحانی اجر بہتر ہے:** اگرچہ بہت سے نیک لوگوں کو اس جہان میں مادی اجر مل جاتا ہے جیسا کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی پاکدامنی، صبر، پارسائی اور تقویٰ کا نتیجہ اسی دنیا میں پالیا اور اگر وہ پاکدامن نہ ہوتے تو ہرگز اس مقام تک نہ پہنچتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگوں کو اس قسم کی توقع رکھنا چاہیے اور اگر انہیں مادی اجر نہ ملے تو وہ یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ ان پر ظلم ہوا ہے کیونکہ اصلی اجر تو وہ ہے جو آئندہ زندگی میں انسان کے انتظار میں ہے۔

شاید اسی اشتباہ کو رفع کرنے اور اس توہم کو دور کرنے کے لیے قرآن زیرِ بحث آیات میں حضرت یوسفؑ کے دنیاوی اجر کا ذکر کرنے کے بعد مزید فرماتا ہے:

ولاجر الاٰخرۃ خیر للذین اٰمنوا وکانوا یتقون

اہلِ ایمان اور صاحبانِ تقویٰ کے لیے اجرِ آخرت برتر و بہتر ہے۔

۶۔ **قیدیوں کے حقوق کی حمایت:** قید خانوں میں ہمیشہ نیک لوگ ہی نہیں رہے۔ ان میں کبھی بے گناہ رہے ہیں اور

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۳۳۔

Marfat.com

کبھی مجرم لیکن ہر صورت میں اصولِ انسانی کا تقاضا ہے کہ انسانی حقوق کو ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے آج کی دنیا یہ سمجھے کہ قیدیوں کے حقوق کی آواز اسی دور میں بلند ہوئی ہے لیکن اسلام کی پر افتخار تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنی حکومت کی ابتداء ہی میں قیدیوں کے بارے میں نصیحتیں فرمائیں نیز حضرت علیؑ نے اپنے ظالم قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی کے بارے میں جو وصیت فرمائی وہ تو ہم سب نے سنی ہے کہ آپؑ نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے یہاں تک کہ آپؑ نے اپنے لیے آنے والا دودھ اس کے لیے بھیجا اور اُسے قتل کرنے کے بارے میں فرمایا:

اسے ایک سے زیادہ ضرب نہ لگائی جائے کیونکہ اس نے صرف ایک ضرب لگائی ہے۔

حضرت یوسفؑ بھی جب قید میں تھے تو آپؑ قیدیوں کے لیے مہربان رفیق، دلسوز ساتھی، مخلص دوست اور خیرخواہ مشیر تھے اور جب آپؑ قید خانے سے جانے لگے تو سب سے پہلے آپؑ نے دنیا کی توجہ قیدیوں کی حالت کی طرف مبذول کروائی اور ان کے حقوق کی حمایت کی اور ان سے اظہارِ ہمدردی کیا۔ آپؑ نے حکم دیا کہ قید خانے کے دروازے پر یہ عبارت لکھیں:

هذا قبور الاحياء، وبيت الاحزان، وتجربة الاصدقاء، وشماتة الاعداء

یہ زندوں کا قبرستان ہے غموں کا گھر ہے، دوستوں کی آزمائش گاہ ہے اور دشمنوں کی سرزنش کی جگہ ہے[1]

حضرت یوسفؑ نے یہ دعا کرتے ہوئے قیدیوں سے اپنے لگاؤ کا اظہار کیا:

اللّٰهم اعطف عليهم بقلوب الاخيار، ولا تعم عليهم الاخبار

بارالٰہا! اپنے نیک بندوں کے دل ان کی طرف متوجہ کردے اور ان سے خبروں کو پوشیدہ نہ رکھ[1]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

فلذلك يكون اصحاب السجن اعرف الناس بالاخبار في كل بلدة

یہی وجہ ہے کہ ہر شہر میں قیدی اس شہر کی خبروں کے بارے میں دوسروں سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں۔

اس بات کو خود ہم نے قید کے دوران آزمایا ہے۔ استثنائی مواقع کے علاوہ قیدیوں تک ایسی ایسی خبریں عجیب مخفی طریقوں سے پہنچ جاتی تھیں کہ جن سے خود قید خانے کے مامور آگاہ نہیں ہوتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قید خانے میں آنے والے نئے قیدیوں کو قید خانے میں ایسی خبریں سننے کو ملتیں جن سے وہ باہر آگاہ نہ ہوتے تھے۔

اب اگر ہم اس کی مثالوں میں پڑ گئے تو مقصد سے دُور ہو جائیں گے۔

---

[1] درالثقلین، جلد ۲ صفحہ ۴۳۲۔

Marfat.com

۵۸۔ وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ
مُنْكِرُوْنَ ○
۵۹۔ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ اَلَا
تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ○
۶۰۔ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ○
۶۱۔ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ○
۶۲۔ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ
اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

ترجمہ

۵۸۔ اور یوسف کے بھائی آئے اور اس کے پاس پہنچے۔ اس نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ اسے نہ پہچان پائے۔

۵۹۔ جب (یوسف) ان کے بار تیار کر چکا تو کہا (آئندہ جب آؤ تو) تمہارا جو باپ کی طرف سے بھائی ہے اسے میرے پاس لانا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پیمانے کا حق ادا کرتا ہوں اور میں بہترین میزبان ہوں۔

۶۰۔ اور اگر تم اسے میرے ہاں نہ لائے تو پھر میرے پاس تمہارے لیے نہ کوئی کیل (اور غلے کا پیمانہ) ہوگا اور نہ ہی (تم ہرگز) میرے پاس آنا۔

۶۱۔ انہوں نے کہا ہم اس کے باپ سے بات کریں گے (اور کوشش کریں گے کہ وہ مان جائے) اور ہم یہ کام کریں گے۔

۶۲۔ (پھر) اس نے اپنے کارندوں سے کہا: جو کچھ انہوں نے قیمت کے طور پر دیا ہے وہ ان کے سامان

Marfat.com

میں رکھ دو شاید اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ کر وہ اسے پہچانیں اور شاید پلٹ آئیں۔

تفسیر

یوسفؑ کی بھائیوں کو نئی تجویز

آخر کار جیسا کہ پیش گوئی ہوئی تھی سات سال پے در پے بارش ہونے کے سبب اور دریائے نیل کے پانی میں اضافے کے باعث مصر کی زرعی پیداوار خوب تسلی بخش ہوگئی۔ مصر کا خزانہ اور اقتصادی امور حضرت یوسفؑ کے زیر نظر تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ غذائی اجناس کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے چھوٹے بڑے گودام بنائے جائیں۔ آپ نے عوام کو حکم دیا کہ پیداوار سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ لیں اور باقی حکومت کے پاس بیچ دیں۔ اس طرح گودام غلے سے بھر گئے۔

نعمت و برکت کی فراوانی کے یہ سات سال گزر گئے اور قحط سالی اور خشک سالی کا منحوس دور شروع ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے آسمان زمین کے لیے بخیل ہوگیا ہے۔ کھیتیاں اور نخلستان خشک ہوگئے۔ عوام کو غلے کی کمی کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ جانتے تھے کہ حکومت نے غلے کے ذخائر جمع کر رکھے ہیں لہٰذا وہ اپنی مشکلات حکومت ہی کے ذریعے دور کرتے تھے۔ حضرت یوسف بھی پوری منصوبہ بندی اور پروگرام کے تحت غلہ فروخت کرتے تھے اور عادلانہ طور پر ان کی ضرورت پوری کرتے تھے۔

یہ خشک سالی صرف مصر ہی میں نہ تھی اطراف کے ملکوں کا بھی یہی حال تھا۔ فلسطین اور کنعان مصر کے شمال مشرق میں تھے۔ وہاں کے لوگ بھی انہی مشکلات سے دوچار تھے۔ حضرت یعقوبؑ کا خاندان بھی اسی علاقے میں سکونت پذیر تھا۔ وہ بھی غلے کی کمی سے دوچار ہوگیا۔ حضرت یعقوبؑ نے ان حالات میں مصمم ارادہ کیا کہ بنیامین کے علاوہ باقی بیٹوں کو مصر کی طرف بھیجیں۔ یوسفؑ کی جگہ اب بنیامین ہی اُن کے پاس تھا۔ بہر حال وہ لوگ مصر کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ ہو لیے اور بعض مفسرین کے بقول اٹھارہ دن کی مسافت کے بعد مصر پہنچے۔

جیسا کہ تواریخ میں ہے، ضروری تھا کہ ملک سے باہر سے آنے والے افراد مصر میں داخل ہوتے وقت اپنی شناخت کروائیں تاکہ مامورین حضرت یوسفؑ کو مطلع کریں۔ جب مامورین نے فلسطین کے قافلے کی خبر دی تو حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ غلے کی درخواست کرنے والوں میں ان کے بھائیوں کے نام بھی ہیں۔ آپ انہیں پہچان گئے اور یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ آپ کے بھائی ہیں آپ نے حکم دیا کہ انہیں حاضر کیا جائے اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: یوسفؑ کے بھائی آئے اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں پہچان لیا لیکن انہوں نے اسے نہیں پہچانا (و جاء اخوة یوسف فدخلوا علیه فعرفهم و هم له منکرون)۔

وہ یوسفؑ کو نہ پہچاننے میں حق بجانب تھے کیونکہ ایک طرف تو تیس سے چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا (اس دن سے لے کر جب انہوں نے حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینکا تھا ان کے مصر میں آنے تک) اور دوسری طرف وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کا بھائی عزیز مصر ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اسے اپنے بھائی سے مشابہ بھی پاتے تو اسے ایک اتفاق ہی سمجھتے۔ ان تمام امور سے قطع نظر حضرت یوسفؑ کے لباس کا انداز بھی بالکل بدل چکا تھا۔ انہیں مصریوں کے نئے لباس میں پہچاننا کوئی آسان کام نہ تھا بلکہ یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ ہو گزرا تھا اس کے بعد ان کی زندگی کا احتمال بھی ان کے لیے بہت بعید تھا۔

Marfat.com

بہرحال انہوں نے اپنی ضرورت کا غلہ خریدا اور اس کی قیمت نقدی کی صورت میں اور یا موزے، جوتے یا کچھ اور اجناس کی صورت میں ادا کی کہ جو وہ کنعان سے مصر لائے تھے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے بہت محبت کا برتاؤ کیا اور ان سے بات چیت کرنے لگے۔ بھائیوں نے کہا: ہم دس بھائی ہیں اور حضرت یعقوبؑ کے بیٹے ہیں۔ ہمارے والد خدا کے عظیم پیغمبر ابراہیم خلیل کے پوتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے باپ کو پہچانتے ہوتے تو ہمارا بہت احترام کرتے۔ ہمارا بوڑھا باپ انبیاء الٰہی میں سے ہے لیکن ایک نہایت گہرے غم نے اس کے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے پوچھا:

یہ غم کس بنا پر ہے۔

انہوں نے کہا:

اس کا ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ عمر میں وہ ہم سے بہت چھوٹا تھا۔ ایک دن وہ ہمارے ساتھ شکار اور تفریح کے لیے صحرا میں گیا۔ ہم اس سے غافل ہوگئے تو ایک بھیڑیا اسے چیر پھاڑ گیا۔ اس دن سے لے کر آج تک باپ اس کے لیے گریاں اور غمگین ہے۔

بعض مفسرین نے اس طرح سے نقل کیا ہے:

حضرت یوسفؑ کی عادت تھی کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلہ نہیں بیچتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی چونکہ دس تھے لہٰذا انہیں غلے کے دس بار دیئے گئے۔

انہوں نے کہا: ہمارا بوڑھا باپ ہے اور ایک چھوٹا بھائی ہے جو وطن میں رہ گیا ہے۔ باپ غم و اندوہ کی شدت کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتا اور چھوٹا بھائی خدمت کے لیے اور مانوسیت کی وجہ سے اس کے پاس رہ گیا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا حصہ بھی ہمیں دے دیجئے۔

حضرت یوسفؑ نے حکم دیا کہ دو اونٹوں کے بار کا اضافہ کیا جائے۔ پھر حضرت یوسفؑ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہوشمند اور مؤدب افراد ہو اور یہ جو تم کہتے ہو کہ تمہارے باپ کو تمہارے سب سے چھوٹے بھائی سے لگاؤ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی اور عام بچوں سے ہٹ کر ہے۔ میری خواہش ہے کہ تمہارے آئندہ سفر میں میں اُسے ضرور دیکھوں۔ علاوہ ازیں یہاں کے لوگوں کو تمہارے بارے میں کئی بدگمانیاں ہیں کیونکہ تم ایک دوسرے ملک سے تعلق رکھتے ہو لہٰذا بدظنی کی اس فضا کو دُور کرنے کے لیے آئندہ سفر میں چھوٹے بھائی کو نشانی کے طور پر ساتھ لے آنا۔

یہاں قرآن کہتا ہے: جب یوسفؑ نے ان کے بار تیار کیے تو اُن سے کہا: تمہارا بھائی جو باپ کی طرف سے ہے اسے میرے پاس لے آؤ (ولما جھزھم بجھازھم قال ائتونی باخ لکم من ابیکم)۔

اس کے بعد مزید کہا: کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پیمانہ کا حق ادا کرتا ہوں اور میں بہترین میزبان ہوں (الا ترون انی اوفی الکیل وانا خیر المنزلین)۔

Marfat.com

اس تشویق اور اظہار محبت کے بعد انہیں یوں تہدید بھی کی: اگر اس بھائی کو میرے پاس نہ لائے تو نہ تمہیں میرے پاس سے غلہ ملے گا اور نہ تم خود میرے پاس پھٹکنا (فان لم تأتونی به فلا کیل لکم عندی و لا تقربون)۔

حضرت یوسفؑ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو بنیامین کو اپنے پاس بلائیں۔ اس کے لیے کبھی وہ لطف و محبت کا طریقہ اختیار کرتے اور کبھی تہدید کا۔

ان تعبیرات سے ضمنی طور پر واضح ہوتا ہے کہ مصر میں غلات کی خرید و فروخت تول کر نہیں ہوتی تھی بلکہ پیمانے سے ہوتی تھی۔

نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائیوں اور دوسرے مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے پذیرائی کرتے تھے اور ہر حوالے سے مہمان نواز تھے۔

بھائیوں نے ان کے جواب میں کہا: ہم اُس کے باپ سے بات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ رضامند ہو جائیں اور ہم یہ کام ضرور کریں گے (قالوا سنراود عنه اباه و انا لفعلون)۔

"انا لفاعلون" کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ انہیں یقین تھا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے باپ کو راضی کر لیں گے اور ان کی موافقت حاصل کر لیں گے۔ اسی لیے وہ عزیز مصر سے ایسا پکا وعدہ کر رہے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ جب وہ اپنے اصرار اور آہ و زاری سے یوسفؑ کو اپنے باپ سے لے جا سکتے تھے تو بنیامین کو کیونکر ان سے جدا نہیں کر سکتے تھے۔

اس موقع پر ان کی ہمدردی اور توجہ کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے حضرت یوسفؑ نے "اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کی نظر بچا کر وہ اموال ان کے غلے میں رکھ دیں جو انہوں نے اس کے بدلے میں دیئے تھے تاکہ جب وہ واپس اپنے خاندان میں جا کر اپنا سامان کھولیں تو انہیں پہچان لیں اور دوبارہ مصر کی طرف لوٹ آئیں (وقال لفتیٰنه اجعلوا بضاعتهم فی رحالهم لعلهم یعرفونها اذا انقلبوا الیٰ اهلهم لعلهم یرجعون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا:** مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے جو پہلا سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا کہ وہ جلد از جلد آپ کو پہچان لیتے اور باپ کے پاس واپس جا کر انہیں آپ کی جدائی کے جانکاہ غم سے نکالتے؟

یہ سوال زیادہ وسیع حوالے سے بھی سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ کہ جس وقت حضرت یوسفؑ کے بھائی آپ کے پاس آئے اُس وقت آپ کی زندان سے رہائی کو کوئی آٹھ سال گزر چکے تھے کیونکہ گزشتہ سات سال فراواں نعمتوں پر مشتمل گزر چکے تھے جن کے دوران آپ قحط سالی کے عرصے کے لیے اناج ذخیرہ کرنے میں مشغول رہے۔ آٹھویں سال قحط کا دور شروع ہوا۔ اس سال یا اس کے بعد آپ کے بھائی غلہ لینے کے لیے مصر آئے۔ کیا چاہیے نہ تھا کہ ان آٹھ سالوں میں آپ کوئی قاصد کنعان کی طرف بھیجتے اور اپنے والد کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے اور انہیں شدید غم سے نجات دلاتے؟

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن میں اس سوال

Marfat.com

کا جواب دیا ہے اور اس سلسلے میں کئی جوابات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے زیادہ بہتر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ تھی کیونکہ فراقِ یوسفؑ دیگر پہلوؤں کے علاوہ حضرت یعقوبؑ کے لیے ایک امتحان بھی تھا اور ضروری تھا کہ آزمائش کا یہ دور فرمانِ الٰہی سے ختم ہو اور اس سے پہلے حضرت یوسفؑ خبر دینے کے مجاز نہ تھے۔

علاوہ ازیں اگر حضرت یوسفؑ فوراً ہی اپنے بھائیوں کو اپنا تعارف کروا دیتے تو ممکن تھا کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوتا اور ہو سکتا تھا کہ وہ اس سے ایسے وحشت زدہ ہوتے کہ پھر لوٹ کر آپ کے پاس نہ آتے کیونکہ انہیں یہ خیال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے یوسفؑ ان کے گزشتہ رویے کا انتقام لیں۔

۲۔ **غلہ کی قیمت کیوں واپس کردی؟** حضرت یوسفؑ نے یہ حکم کیوں دیا تھا کہ جو مال ان کے بھائیوں نے غلے کی قیمت کے طور پر دیا ہے وہ ان کے سامان میں رکھ دیا جائے؟

اس سوال کے بھی کئی جوابات دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں دس جوابات ذکر کیے ہیں بعض تو ان میں سے غیر مناسب ہیں البتہ خود مذکورہ آیت نے اس سوال کا جواب دیا ہے "لعلھم یعرفونھا اذا انقلبوا الٰی اھلھم لعلھم یرجعون"۔ یعنی حضرت یوسفؑ کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ وطن واپسی پر اپنا سامان دیکھیں تو انہیں عزیزِ مصر (حضرت یوسفؑ) کی کرم نوازی کا پہلے سے زیادہ احساس ہو اور اسی بنیاد پر وہ دوبارہ آپ کے پاس آجائیں یہاں تک کہ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی پورے اطمینانِ قلب سے اپنے ساتھ لے آئیں اور خود حضرت یعقوبؑ بھی یہ بات دیکھ کر بنیامین کو بڑے اعتماد سے مصر روانہ کر دیں۔

۳۔ **حضرت یوسفؑ نے بیت المال کا مال کیوں بلا معاوضہ دے دیا؟** ایک اور سوال جو یہاں سامنے آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو بیت المال کا کچھ حصہ کیوں بلا معاوضہ دے دیا۔

اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ مصر کے بیت المال میں مستضعفین کا حق تھا (اور ہمیشہ ہوتا ہے) اور مختلف ممالک میں موجود سرحدوں سے یہ حق ختم نہیں ہو جاتا۔ اسی لیے حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے لیے جو اس وقت مستضعف تھے اس حق سے استفادہ کیا جیسا کہ وہ دیگر مستضعفین کے لیے بھی کرتے تھے۔

دوسرا یہ کہ حضرت یوسفؑ اس وقت ایک حساس منصب پر تھے جس کی بناء پر ذاتی طور پر بھی ان کے کچھ حقوق تھے، ان کا کم از کم یہ حق تھا کہ وہ اپنی معاشی ضروریات کا، اپنے ضرورت مند اہل و عیال کا اور اپنے باپ اور بھائیوں جیسے رشتہ داروں کی کم از کم معاشی زندگی کا خیال رکھیں اسی بناء پر آپ نے ان بخشش و عطا میں اپنے اس حق سے استفادہ کیا۔

Marfat.com

۶۳۔ فَلَمَّا رَجَعُوٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ
اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○
۶۴۔ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ
خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○
۶۵۔ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا
يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَ
نَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ○
۶۶۔ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ
اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ
وَكِيْلٌ ○

ترجمہ

۶۳۔ جب وہ اپنے والد کے پاس واپس پہنچے تو انہوں نے کہا: ابا جان! ہم سے (غلے کا) پیمانہ روک دیا گیا ہے لہٰذا ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم (غلے کا) حصہ لے سکیں اور ہم اس کی حفاظت کریں گے۔

۶۴۔ اس نے کہا: کیا میں اس کے بارے میں تم پر بھروسہ کروں جیسا کہ اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں تم پر بھروسہ کیا تھا اور (میں نے دیکھا کہ کیا ہوا اور بہرحال) خدا بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے۔

۶۵۔ اور جس وقت انہوں نے اپنا مال و متاع کھولا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا سرمایہ انہیں واپس کر دیا گیا ہے

Marfat.com

انہوں نے کہا: اباجان ! ہمیں اور کیا چاہیے یہ (دیکھئے) ہمارا سرمایہ جو ہمیں واپس کردیا گیا ہے (لہٰذا کیا ہی اچھا ہے کہ بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے) اور ہم اپنے گھر والوں کے لیے اناج لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور زیادہ بڑا پیمانہ حاصل کریں گے ، یہ تو چھوٹا پیمانہ ہے ۔

۶۶۔ اس نے کہا میں ہرگز اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک کہ مجھ سے پکا خدائی وعدہ نہ کرو کہ اسے حتماً میرے پاس لے آؤ گے مگر یہ کہ (موت یا کسی اور سبب سے) تم سے قدرت سلب ہو جائے اور جس وقت انہوں نے اس سے قابلِ وثوق وعدہ کرلیا تو اس نے کہا : جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں خدا اس پر ناظر و حافظ ہے ۔

تفسیر

آخر کار باپ راضی ہو گئے

حضرت یوسفؑ کے بھائی مالا مال ہو کر خوشی خوشی کنعان واپس آئے لیکن آئندہ کی فکر تھی کہ اگر باپ چھوٹے بھائی (بنیامین) کو بھیجنے پر راضی نہ ہوئے تو عزیزِ مصر ان کی پذیرائی نہیں کرے گا اور انہیں غلے کا حصہ نہیں دے گا ۔

اسی لیے قرآن کہتا ہے : جب وہ باپ کے پاس لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا : اباجان ! حکم دیا گیا ہے کہ آئندہ ہمیں غلے کا حصہ نہ دیا جائے اور پیمانہ ہم سے روک دیا جائے (فلما رجعوا الی ابیھم قالوا یاابانا منع منا الکیل)۔ اب جب یہ صورت درپیش ہے تو ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہم پیمانہ حاصل کرسکیں (فارسل معنا اخانا نکتل [1] اور آپ مطمئن رہیں ہم اس کی حفاظت کریں گے (و انا لہ لحافظون)۔

باپ کہ جسے یوسفؑ ہرگز نہیں بھولتا تھا یہ بات سن کر پریشان ہو گیا ، ان کی طرف رخ کرکے اس نے کہا : کیا میں تم پر اس بھائی کے بارے میں بھروسہ کروں جب کہ اس کے بھائی یوسفؑ کے بارے میں گزشتہ زمانے میں تم پر بھروسہ کیا تھا (قال ھل اٰمنکم علیہ الا کما امنتکم علی اخیہ من قبل)۔

یعنی جب تمہارا ایسا برا ماضی ہے کہ جو بھولنے کے قابل نہیں تو تم کس طرح توقع رکھتے ہو کہ دوبارہ تمہاری فرمائش مان لوں اور اپنے

---

[1] "نکتل" اصل میں "کیل" کے مادہ سے "نکتال" تھا۔ یہ پیمانے سے کوئی چیز حاصل کرنے کے معنی میں ہے لیکن "کال" پیمانے سے کوئی چیز دینے کے معنی میں ہے ۔

Marfat.com

فرزند دلبند کو تمہارے سپرد کردوں اور وہ بھی ایک دور دراز سفر اور پرائے دیس کے لیے۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا: ہر حالت میں خدا بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے۔ (فاللہ خیر حافظا و ھو ارحم الراحمین)۔

ہوسکتا ہے یہ جملہ اس طرف اشارہ ہو کہ تم جیسے بُرے ماضی والے افراد کے ساتھ میرے لیے مشکل ہے کہ بنیامین کو بھیجوں اور بھیجوں گا بھی تو خدا کی حفاظت میں اور اس کے ارحم الراحمین ہونے کے بھروسے پر نہ کہ تمہارے بھروسے پر۔

لہٰذا مندرجہ بالا جملہ اُن کی فرمائش قبول کرنے کی طرف قطعی اشارہ نہیں ہے بلکہ ایک احتمالی بات ہے کیونکہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے ابھی تک ان کی فرمائش قبول نہیں کی تھی اور آپ نے پختہ عہد لینے اور پیش آمدہ دیگر واقعات کے بعد اسے قبول کیا۔

دوسرا یہ کہ ممکن ہے حضرت یوسفؑ کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس موقع پر انہیں یوسفؑ یاد آگئے اور وہ پہلے سے بھی جانتے تھے کہ وہ زندہ ہیں (اور بعد والی آیات میں بھی ہم پڑھیں گے کہ انہیں حضرت یوسفؑ کے زندہ ہونے کا اطمینان تھا) لہٰذا آپ نے اُن کے محفوظ و سلامت رہنے کی دُعا کی کہ خدایا! وہ جہاں کہیں بھی ہیں انہیں سلامت رکھ۔

پھر ان بھائیوں نے جب اپنا سامان کھولا تو انہوں نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ وہ تمام چیزیں جو انہوں نے غلے کی قیمت کے طور پر عزیز مصر کو دی تھیں سب انہیں لوٹا دی گئی ہیں اور وہ ان کے سامان میں موجود ہیں (و لما فتحوا متاعھم وجدوا بضاعتھم ردت الیھم)۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو ان کی گفتگو پر سند قاطع ہے تو باپ کے پاس آئے اور" کہنے لگے: ابا جان! ہمیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے، دیکھیے انہوں نے ہمارا تمام مال و متاع ہمیں واپس کر دیا ہے" (قالوا یا ابانا ما نبغی ھذہ بضاعتنا ردت الینا)[1]

کیا اس سے بڑھ کر کوئی عزت و احترام اور مہربانی ہوسکتی ہے کہ ایک غیر ملک کا سربراہ ایسے قحط اور خشک سالی میں ہمیں اناج بھی دے اور اس کی قیمت بھی واپس کر دے، وہ بھی ایسے کہ ہم سمجھ بھی نہ پائیں اور شرمندہ نہ ہوں؟ اس سے بڑھ کر ہم کیا تصور کر سکتے ہیں؟! ابا جان! اب کسی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ ہمارا بھائی ہمارے ساتھ بھیج دیں "ہم اپنے گھر والوں کے لیے اناج لے آئیں گے" (ونمیر اھلنا)[2] "اور اپنے بھائی کی حفاظت کی کوشش کریں گے" (ونحفظ اخانا) "نیز اس کی وجہ سے ایک اُونٹ کا بار بھی زیادہ لائیں گے" (ونزداد کیل بعیر)۔ اور عزیز مصر جیسے محترم، مہربان اور سخی شخص کے لیے کہ جسے ہم نے دیکھا ہے ایک آسان اور معمولی کام ہے (ذٰلک کیل یسیر)[3]۔

---

[1] ہوسکتا ہے "ما نبغی" استفہامیہ جملہ ہو اور اس کی تقدیر "ما نبغی وراء ذٰلک" (ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے) ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نافیہ ہو اور اس کی تقدیر اس طرح ہو "ما نبغی بذٰلک الکذب" یا "ما نبغی منک دراھم" (ہم جھوٹ نہیں بولنا چاہتے یا یہ کہ ہم اور پیسے آپ سے نہیں چاہتے یہی مال کافی ہے)۔

[2] "نمیر" "میرہ" کے مادہ سے کھانا اور غذائی مواد حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔

[3] "ذٰلک کیل یسیر" میں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہم لے آئے ہیں یہ تو تھوڑا سا پیمانہ ہے اگر ہمارا چھوٹا بھائی ہمارے ساتھ چلے تو ہم زیادہ غلہ حاصل کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

ان تمام امور کے باوجود حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے بنیامین کو ان کے ساتھ بھیجنے کے لیے راضی نہ تھے لیکن دوسری طرف ان کا اصرار تھا جو واضح منطق کی بنیاد پر تھا۔ یہ صورت حال انہیں آمادہ کرتی تھی کہ وہ ان کی تجویز قبول کریں۔ آخرکار انہوں نے دیکھا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں کہ مشروط طور پر بیٹے کو بھیج دیا جائے۔ لہٰذا آپ نے انہیں اس طرح سے کہا: میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا، جب تک کہ تم ایک خدائی پیمان نہ دو اور کوئی ایسا کام نہ کرو کہ جس سے مجھے اعتماد پیدا ہو جائے کہ تم اسے واپس لے کر آؤ گے مگر یہ کہ موت یا اور عوامل کی وجہ سے یہ امر تمہارے بس میں نہ رہے (قال لن ارسله معکم حتّٰی تؤتون موثقًا من الله لتأتنني به الا ان یحاط بکم)۔

"موثقًا من الله" سے مراد وہی قسم ہے جو خدا کے نام کے ساتھ ہے۔

"الا ان یحاط بکم" کا معنی اصل میں یہ ہے:

"مگر یہ کہ حوادث تمہیں گھیر لیں"

یعنی "حوادث سے مغلوب ہو جاؤ"

یہ جملہ ہو سکتا ہے موت یا ایسے دوسرے حوادث کے لیے کنایہ ہو جو انسان کو بے بس کر دیں [1]

یہ استثناء حضرت یعقوبؑ کی عظیم دانائی کی علامت ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنے بیٹے بنیامین سے اس قدر محبت رکھتے تھے انہوں نے اپنے دوسرے بیٹوں کو ایسی مشکل میں نہیں ڈالا جو ان کے بس میں نہ ہو لہٰذا کہا کہ میں تم سے اپنا بیٹا چاہتا ہوں مگر یہ کہ ایسے حوادث پیش آجائیں جو تمہاری قدرت سے ماوراء ہوں، اس صورت میں تمہارا کوئی گناہ نہ ہوگا۔

واضح ہے کہ اگر ان میں سے بعض کسی حادثے میں گرفتار ہو جاتے اور ان سے قدرت چھن جاتی تو باقی رہ جانے والوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ باپ کی امانت اس تک پہنچا دیں، اسی لیے حضرت یعقوبؑ کہتے ہیں: مگر یہ کہ تم سب حوادث سے مغلوب ہو جاؤ۔

بہرحال یوسفؑ کے بھائیوں نے باپ کی شرط قبول کر لی اور جب انہوں نے اپنے والد سے عہد و پیمان باندھا تو یعقوبؑ نے کہا خدا شاہد، ناظر اور محافظ ہے، اس بات پر کہ جو ہم کہتے ہیں (فلما اٰتوہ موثقهم قال الله علٰی ما نقول وکیل)۔

چند اہم نکات

۱۔ **حضرت یعقوبؑ کیسے راضی ہو گئے:** مندرجہ بالا آیات کے سلسلے میں جو پہلا سوال ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ بنیامین کو ان کے سپرد کرنے پر کیسے آمادہ ہو گئے جب کہ ان کے بھائی یوسفؑ کے بارے میں اپنے سلوک کی وجہ سے پہلے برے کردار کے شمار ہوتے تھے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صرف یوسفؑ کے بارے میں اپنے دل میں کینہ و حسد نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ یہی احساسات اگرچہ

---

[1] یہ تعبیر قرآن مجید میں کئی مقامات پر صرف ہلاکت اور نابودی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً:

وظنوا انهم احیط بهم (یونس - ۲۲)

واحیط بثمره (کہف - ۴۲)

لیکن واضح ہے کہ زیر بحث آیات میں مراد بالخصوص ہلاکت نہیں ہے بلکہ ایسا عذر ہے جس کے باعث انسان کا اختیار ختم ہو جائے۔

Marfat.com

نسبتاً خفیف ہی سہی بنیامین کے لیے بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں ہے:

اذ قالوا لیوسف و اخوہ احب الی ابینا منا و نحن عصبۃ

انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہے جب کہ ہم زیادہ طاقتور ہیں۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ والے حادثے کو تیس سے چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا اور حضرت یوسفؑ کے جوان بھائی بڑھاپے کو پہنچ گئے تھے اور فطرتاً ان کا ذہن پہلے زمانے کی نسبت پختہ ہو چکا تھا علاوہ ازیں گھر کے ماحول پر اور اپنے مضطرب وجدان پر اپنے بُرے ارادے کے اثرات وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے اور تجربے نے ان پر ثابت کر دیا کہ یوسفؑ کے فقدان سے نہ صرف یہ کہ ان کے لیے باپ کی محبت میں اضافہ نہ ہوا بلکہ مزید بے مہری اور بے اتفاقی پیدا ہو گئی۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تو ایک زندگی کا مسئلہ ہے۔ قحط سالی میں ایک گھرانے کے لیے اناج مہیا کرنا ایک بہت بڑی چیز تھی اور یہ سیر و تفریح کا معاملہ نہ تھا جیسا کہ انہوں نے ماضی میں حضرت یوسفؑ کے متعلق فرمائش کی تھی۔

ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر حضرت یعقوبؑ نے ان کی بات مان لی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ سے عہد و پیمان باندھیں کہ وہ اپنے بھائی بنیامین کو صحیح و سالم آپ کے پاس واپس لے آئیں گے۔

۲۔ کیا صرف ایک قسم کافی تھی؟ دوسرا سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف قسم کھا لینا اور خدائی پیمان باندھ لینا کافی تھا کہ جس کی بنیاد پر بنیامین کو ان کے سپرد کر دیا جاتا۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم ہے کہ عہد و پیمان اور قسم کھا لینا ہی کافی نہیں تھا لیکن قرائن و شواہد نشاندہی کرتے تھے کہ اس دفعہ ایک حقیقت پیش نظر ہے نہ کہ سازش، مکر و فریب اور جھوٹ۔ اس لیے وعدہ اور قسم زیادہ تاکید کے لیے تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی اشخاص سے مثلاً صدر مملکت اور اسمبلی کے ارکان سے ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے حلفِ وفاداری لیا جاتا ہے جب کہ ان کے انتخاب میں بھی کافی دیکھ بھال سے کام لیا جاتا ہے۔

Marfat.com

۶۷۔ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ
مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا
لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ○
۶۸۔ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ
مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ
لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۶۷۔ (جب وہ جانے لگے تو یعقوبؑ نے) کہا: میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا، بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا اور (میں یہ حکم دے کر) خدا کی طرف سے کسی حتمی حادثے کو نہیں ٹال سکتا۔ حکم اور فرمان صرف خدا کی طرف سے جاری ہوتا ہے۔ اُس پر میں نے توکل کیا ہے اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے۔

۶۸۔ اور جب اسی طریقے سے جیسا کہ انہیں باپ نے حکم دیا تھا وہ داخل ہوئے تو یہ کام ان سے کسی حتمی خدائی حادثے کو دور نہیں کر سکتا تھا سوائے اس حاجت کے جو یعقوبؑ کے دل میں تھی، (جو اس طرح سے) انجام پائی (اور اس کے دل کو تسکین ہوئی) اور وہ اس تعلیم کی برکت سے جو ہم نے اسے دی بہت سا علم رکھتا تھا جبکہ اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر

آخر کار حضرت یوسفؑ کے بھائی باپ کی رضامندی کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کو ہمراہ لے کر دوسری مرتبہ مصر جانے کو تیار ہوئے تو اس موقع پر باپ نے انہیں نصیحت کی۔ اُس نے کہا: میرے بیٹو! تم ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا (وقال یا بنی لا تدخلوا من باب واحد و ادخلوا من ابواب متفرقة)۔

Marfat.com

اور مزید کہا: "یہ حکم دے کر میں خدا کی طرف سے کسی حتمی حادثے کو تم سے برطرف نہیں کرسکتا"۔ (وما اغنی عنکم من اللہ من شیء)۔ لیکن ناگوار حوادث کا ایک سلسلہ ایسا ہے جس سے بچا جاسکتا ہے اور ان کے متعلق خدا کا حتمی حکم صادر نہیں ہوا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ایسے حوادث تم سے دُور رہیں اور ایسا ہونا ممکن ہے۔

آخر میں کہا: "حکم اور فرمان خدا کے ساتھ مخصوص ہے" (ان الحکم الا للہ)۔ "میں نے خدا پر توکل کیا ہے" (علیہ توکلت)۔ "اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے اور اسی سے مدد طلب کرو اور اپنا معاملہ اسی کے سپرد کرو" (وعلیہ فلیتوکل المتوکلون)۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں دوسرے شہروں کی طرح مصر کے پایۂ تخت کے گرداگرد بھی فصیل تھی۔ اس کے بھی بُرج و بار تھے اور اس کے متعدد دروازے تھے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت یعقوبؑ نے کیوں نصیحت کی کہ ان کے بیٹے ایک دروازے سے داخل نہ ہوں بلکہ مختلف حصّوں میں تقسیم ہو کر مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوں، اس کی وجہ مندرجہ بالا آیت میں مذکور نہیں ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی ایک تو بہت حسین وجمیل تھے (اگرچہ وہ یوسف نہ تھے مگر یوسف کے بھائی تو تھے)۔ ان کا قد کاٹھ بہت اچھا تھا۔ لہٰذا اُن کے باپ پریشان تھے کہ گیارہ افراد اکٹھے جن کے چہرے مہرے سے معلوم ہو کہ وہ مصر کے علاوہ کسی اور ملک سے آئے ہیں، لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح انہیں نظرِ بد لگ جائے۔

اس تفسیر کے بعد مفسرین کے درمیان نظرِ بد کی تاثیر کے بارے میں ایک طویل بحث چھڑ گئی ہے۔ انہوں نے اس کے لیے روایاتِ تاریخ میں سے کئی ایک شواہد پیش کیے ہیں جنہیں ہم انشاء اللہ اس آیت کی تفسیر میں ذکر کریں گے:

و ان یکاد الذین کفروا لیزلقونک بابصارھم

(ن والقلم - ۵۱)

اس آیت کے ذیل میں ہم ثابت کریں گے کہ اس سلسلے کی کچھ بحث بجا بھی ہے اور سائنسی لحاظ سے بھی ایک مخصوص سیال مقناطیسی کرہ جو آنکھ سے باہر اُڑتا ہے اس کی توجیہ پیش کی جاسکتی ہے اگرچہ عامۃ الناس نے اس معاملے میں بہت سی خرافات شامل کر دی ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے اس حکم کے بارے میں جو دوسری علت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے جب اونچے لمبے چوڑے چکلے مضبوط جسموں والے اکٹھے چلیں تو حاسدوں کو انہیں دیکھ کر حسد پیدا ہو اور وہ ان کے بارے میں حکومت سے کوئی شکایت کرنے لگیں اور ان کے متعلق یہ بدظنی کریں کہ وہ کسی خرابی اور فتنہ و فساد کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے باپ نے انہیں حکم دیا کہ مختلف دروازوں سے داخل ہوں تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

بعض مفسرین[۱] نے اس کی ایک عرفانی تفسیر بھی کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت یعقوبؑ راہنمائے راہ کے حوالے سے اپنے بیٹوں کو ایک اہم معاشرتی مسئلہ سمجھانا چاہتے تھے اور وہ یہ کہ کھوئی ہوئی چیز کو صرف ایک ہی راستے سے تلاش نہ کریں بلکہ ہر دروازے سے داخل ہو کر اُسے ڈھونڈیں۔

۱۔ عظیم عالم و خطیب مرحوم اشراقی (قدس سرہ)

Marfat.com

کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک مقصد تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی راہ کا انتخاب کرتا ہے اور جب آگے راستہ بند پاتا ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اگر وہ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو کہ گمشدہ افراد اور چیزیں عموماً ایک ہی راستے پر جانے سے نہیں ملتیں بلکہ مختلف راستوں سے ان کی جستجو کرنا چاہیے تو عام طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔

برادرانِ یوسفؑ روانہ ہوئے اور کنعان و مصر کے درمیان طویل مسافت طے کرنے کے بعد سرزمین مصر میں داخل ہوئے اور جب باپ کے دیئے ہوئے حکم کے مطابق مختلف راستوں سے مصر میں داخل ہوئے تو یہ کام انہیں کسی خدائی حادثے سے دور نہیں کر سکتا تھا (ولما دخلوا من حیث امرھم ابوھم ما کان یغنی عنھم من الله من شیء) بلکہ اس کا فائدہ صرف یہ تھا کہ "یعقوب کے دل میں ایک حاجت تھی جو اس طرح سے پوری ہوتی تھی" (الاحاجة فی نفس یعقوب قضاھا)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا اثر صرف باپ کے دل کی تسکین اور آرام تھا کیونکہ وہ اپنے سارے بیٹوں سے دُور تھا اور رات دن ان کی اور یوسفؑ کی فکر میں رہتا تھا اور ان کے بارے میں حوادث کے گزند اور حاسدوں اور بدخواہوں کے بغض و حسد سے ڈرتا تھا اور اسے صرف اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ اس کے احکام کے کاربند رہیں گے۔ اس پر اس کا دل خوش تھا۔

اس کے بعد قرآن حضرت یعقوبؑ کی یوں مدح و ثنا اور تعریف و توصیف کرتا ہے: وہ ہماری دی ہوئی تعلیم کے سبب علم و آگہی رکھتا تھا جب کہ اکثر لوگ نہیں جانتے (وانه لذو علم لما علمناه ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

اس طرف اشارہ ہے کہ اسی طرح بہت سے لوگ عالمِ اسباب میں گم ہو جاتے ہیں، خدا کو بھول جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کی نظرِ بد سے نہیں بچا جا سکتا۔ اسی بناء پر ایسے لوگ خدا اور اس پر توکل کو بھول کر ہر کہ و مہ کے دامن سے جا چمٹتے ہیں لیکن حضرت یعقوبؑ اس طرح کے نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک خدا کسی چیز کو نہ چاہے وہ انجام نہیں پا سکتی لہٰذا پہلے درجے میں ان کا بھروسا اور اعتماد خدا پر تھا۔ اس کے بعد وہ عالمِ اسباب کی طرف جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جانتے تھے کہ ان اسباب کے پیچھے ایک مسبب الاسباب ذات پاک ہے، جیسا کہ قرآن بقرہ ۱۰۲ میں شہر بابل کے جادوگروں کے بارے میں کہتا ہے:

وماھم بضارین به من احد الا باذن الله

وہ جادو سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے مگر یہ کہ خدا چاہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان سب چیزوں سے مافوق خدا کا ارادہ ہے دل اس سے باندھنا چاہیے اور اسی سے مدد لینا چاہیے۔

Marfat.com

٦٩۔ وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْٓ اَنَا اَخُوْكَ
فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

٧٠۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىْ رَحْلِ اَخِيْهِ
ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ○

٧١۔ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ○

٧٢۔ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ
وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ○

٧٣۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِى الْاَرْضِ وَمَا
كُنَّا سٰرِقِيْنَ ○

٧٤۔ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ○

٧٥۔ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِىْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِى
الظّٰلِمِيْنَ ○

٧٦۔ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ
كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ
عِلْمٍ عَلِيْمٌ ○

Marfat.com

ترجمہ

۶۹۔ جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا میں تمہارا بھائی ہوں۔ جو کچھ یہ کرتے ہیں اس سے غمگین اور پریشان نہ ہو۔

۷۰۔ اور جس وقت ان کا سامان باندھا گیا تو ان کے بادشاہ نے پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کے بعد کسی نے آواز بلند کی کہ اے قافلے والو تم چور ہو۔

۷۱۔ انہوں نے اس کی طرف رُخ کر کے کہا تمہاری کیا چیز کھو گئی ہے۔

۷۲۔ انہوں نے کہا: بادشاہ کا پیمانہ، اور جو شخص اسے لے آئے (غلے کا) اونٹ کا ایک بار اسے دیا جائے گا اور میں (اس انعام کا) ضامن ہوں۔

۷۳۔ انہوں نے کہا: قسم بخدا تم جانتے ہو کہ ہم اس علاقے میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم (کبھی بھی) چور نہیں تھے۔

۷۴۔ انہوں نے کہا: اگر تم جھوٹے ہوئے تو تمہاری سزا کیا ہے۔

۷۵۔ انہوں نے کہا: جس کے سامان میں (وہ پیمانہ) مل گیا تو وہ خود اس کی سزا ہو گا (اور اس کام کی بناء پر وہ غلام ہو جائے گا) ہم ظالموں کو اس طرح سے سزا دیتے ہیں۔

۷۶۔ تو اس وقت (یوسف نے) اپنے بھائی کے سامان سے پہلے ان کے سامان کی تلاشی لی اور پھر اپنے بھائی کے سامان سے اُسے برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کو چارہ کار یاد دلایا۔ وہ مصر (کے بادشاہ) کے آئین کے مطابق اپنے بھائی کو ہرگز نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ خدا چاہے۔ ہم جس شخص کے چاہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک عالم ہے۔

تفسیر

بھائی کو روکنے کی کوشش

آخر کار بھائی یوسفؑ کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور باوجود اس کے کہ ہمارے والد پہلے

Marfat.com

چھوٹے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ تھے لیکن ہم نے اصرار کر کے اسے راضی کیا ہے تاکہ آپ جان لیں کہ ہم نے قول وقرار پورا کیا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے بڑی عزت و احترام سے ان کی پذیرائی کی، انہیں مہمان بلایا اور حکم دیا کہ دسترخوان یا طبق کے پاس دو دو افراد آئیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس موقع پر بنیامین جو تنہا رہ گیا تھا رونے لگا اور کہنے لگا کہ اگر میرا بھائی یوسفؑ زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھاتا کیونکہ ہم پدری مادری بھائی تھے۔

پھر حکم دیا کہ دو دو افراد کے لیے ایک ایک کمرہ سونے کے لیے تیار کیا جائے۔ بنیامین پھر اکیلا رہ گیا تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا: اسے میرے پاس بھیج دو۔ اس طرح حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کو اپنے ہاں جگہ دی لیکن دیکھا کہ وہ بہت دکھی اور پریشان ہے اور ہمیشہ اپنے کھوئے ہوئے بھائی یوسفؑ کی یاد میں رہتا ہے۔ ایسے میں یوسفؑ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور آپؑ نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے ہاں جگہ دی اور کہا کہ میں وہی تمہارا بھائی یوسف ہوں، غمگین نہ ہو اور اپنے دل کو دکھی نہ کر اور ان کے کسی کام سے پریشان نہ ہو (ولما دخلوا علی یوسف اوی الیه اخاه قال انی انا اخوك فلا تبتئس بما کانوا یعملون)۔

"لا تبتئس" اصل میں "بؤس" کے مادہ سے ضرر اور شدت کے معنی میں ہے اور اس مقام پر اس کا معنی ہے "غمگین نہ ہو"۔

بھائیوں کے کام کہ جو بنیامین کو دکھی اور پریشان کرتے تھے ان سے مراد ان کی وہ نامہربانیاں اور بے التفاتیاں تھیں جو وہ اس کے اور یوسفؑ کے لیے روا رکھتے تھے اور وہ سازشیں کہ جو اسے گھر والوں سے دور کرنے کے لیے انجام دیتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کی مراد یہ تھی کہ تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی کارستانیوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ میری ترقی اور بلندی کا ذریعہ بن گئیں لہٰذا اب تم بھی اس بارے میں اپنے دل کو دکھی نہ کرو۔

بعض روایات کے مطابق اس موقع پر حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی بنیامین سے کہا کیا تم پسند کرتے ہو کہ میرے پاس رہ جاؤ۔ اس نے کہا: ہاں میں تو راضی ہوں لیکن بھائی ہرگز راضی نہیں ہوں گے کیونکہ انہوں نے باپ سے قول وقرار کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ مجھے ہر قیمت پر اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے۔

حضرت یوسفؑ نے کہا تم فکر نہ کرو میں ایک منصوبہ بناتا ہوں جس سے وہ مجبور ہو جائیں گے کہ تمہیں میرے پاس چھوڑ جائیں۔

غلات کے بار تیار ہو گئے تو حکم دیا کہ مخصوص قیمتی پیمانہ بھائی کے بار میں رکھ دیں (کیونکہ ہر شخص کے لیے غلے کا ایک بار دیا جاتا تھا) (فلما جهزهم بجهازهم جعل السقاية فی رحل اخيه)۔

البتہ یہ کام مخفی طور پر انجام پایا اور شاید اس کا علم مامورین میں سے فقط ایک شخص کو تھا۔

جب اناج کو پیمانے سے دینے والوں نے دیکھا کہ مخصوص قیمتی پیمانے کا کہیں نام و نشان نہیں ہے حالانکہ پہلے وہ ان کے پاس موجود تھا۔ لہٰذا جب قافلہ چلنے لگا تو کسی نے پکار کر کہا، اے قافلے والو! تم چور ہو (ثم اذن مؤذن ایتها العیر انکم لسارقون)۔

یوسفؑ کے بھائیوں نے جب یہ جملہ سنا تو سخت پریشان ہوئے اور وحشت زدہ ہو گئے کیونکہ ان کے ذہن میں تو اس کا خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ اس احترام و اکرام کے بعد ان پر چوری کا الزام لگایا جائے گا لہٰذا انہوں نے ان کی طرف رخ کر کے کہا، تمہاری کونسی چیز

Marfat.com

چوری ہوگئی ہے؟ (قالوا واقبلوا علیهم ماذا تفقدون) ۔

انہوں نے کہا ہم سے بادشاہ کا پیمانہ گم ہوگیا ہے اور ہمیں تمہارے بارے میں بدگمانی ہے (قالوا نفقد صواع الملك) ۔

پیمانہ چونکہ گراں قیمت ہے اور بادشاہ کو پسند ہے لہٰذا " وہ جس شخص کو ملے اور وہ اسے لے آئے تو اسے ایک اونٹ کا بار بطور انعام دیا جائے گا " (ولمن جاء به حمل بعیر) ۔

پھر یہ بات کہنے والے نے مزید تاکید سے کہا: اور میں ذاتی طور پر اس انعام کا ضامن ہوں (وانا به زعیم) ۔

بھائی یہ بات سن کر سخت پریشان ہوئے اور حواس باختہ ہوگئے اور وہ نہیں سمجھتے تھے کہ معاملہ کیا ہوا ، ان کی طرف رُخ کرکے انہوں نے کہا : خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم یہاں اس لیے نہیں آئے کہ فتنہ وفساد کریں اور ہم کبھی بھی چور نہیں تھے " (قالوا تالله لقد علمتم ما جئنا لنفسد فی الارض وما کنا سارقین) ۔

یہ جو انہوں نے کہا کہ تم خود جانتے ہو کہ ہم فسادی اور چور نہیں ہیں ، شاید اس طرف اشارہ ہو کہ تم ہمارا سابقہ کردار اچھی طرح جانتے ہو کہ گزشتہ موقع پر ہماری پیش کردہ قیمت جو تم نے ہمارے غلات میں رکھ دی تھی وہ ہم دوبارہ تمہارے پاس لے آئے اور نہیں بتایا کہ وہ ہم ساری کی ساری تمہیں واپس کرنے کو تیار ہیں لہٰذا وہ افراد جو دور دراز کے ملک سے اپنا قرض ادا کرنے واپس آجاتے ہیں ان سے کیونکر ممکن ہے کہ چوری کے لیے ہاتھ بڑھائیں ۔

اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ مصر میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے اونٹوں کے منہ دہان بندوں سے باندھ دیئے تھے تاکہ وہ کسی کی زراعت اور مال کا نقصان نہ کریں ۔ لہٰذا ان کی مراد یہ تھی کہ ہم جو اس حد تک احتیاط کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے جانور بھی کسی کو ضرر یا نقصان نہ پہنچائیں تو کس طرح ممکن ہے کہ ہم ایسے کام کے مرتکب ہوں ۔

یہ سُن کر مامورین ان کی طرف متوجہ ہوئے اور " کہا : لیکن اگر تم جھوٹے ہوئے تو اس کی سزا کیا ہے ؟ " (قالوا فما جزاؤه ان کنتم کاذبین) ۔

" انہوں نے جواب میں کہا : اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کے بار میں سے بادشاہ کا پیمانہ مل جائے اسے روک لو اور اسے اس کے بدلے میں لے لو " (قالوا جزاؤه من وجد فی رحله فهو جزاؤه) " جی ہاں ! ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں (کذٰلك نجزی الظّٰلمین) ۔

اس موقع پر حضرت یوسفؑ نے حکم دیا کہ ان کے غلات کے بار کھولے جائیں اور ایک ایک کی جانچ پڑتال کی جائے ۔ البتہ اس بناء پر کہ ان کے اصلی منصوبے کا کسی کو پتہ نہ چلے ، اپنے بھائی بنیامین کے بار سے پہلے دوسروں کے سامان کی پڑتال کی اور پھر وہ مخصوص پیمانہ اپنے بھائی کے بار سے برآمد کرلیا (فبدأ باوعیتهم قبل وعاء اخیه ثم استخرجها من وعاء اخیه) ۔

بنیامین کے بار سے پیمانہ برآمد ہوا تو تعجب سے بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے ۔ گویا غم واندوہ کا پہاڑ اُن کے سروں پر آگرا اور انہیں یوں لگا جیسے وہ ایک عجیب مقام پر پھنس گئے ہیں کہ جس کے چاروں طرف کے راستے بند ہوگئے ہیں ۔ ایک طرف ان کا بھائی ظاہراً ایسی چوری کا مرتکب ہوا جس سے ان کے سر ندامت سے جھک گئے اور دوسری طرف ظاہراً عزیز مصر کی نظروں میں ان کی عزت وحیثیت خطرے میں جا پڑی کہ اب آئندہ کے لیے اس کی حمایت حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا اور ان تمام باتوں سے

Marfat.com

قطع نظر انہوں نے سوچا کر باپ کو کیا جواب دیں گے اور وہ کیسے یقین کرے گا کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر بھائیوں نے بنیامین کی طرف رُخ کرکے کہا: اے بے خبر! تو نے ہمیں رسوا کردیا ہے اور ہمارا منہ کالا کردیا ہے۔ تو نے یہ کیسا غلط کام انجام دیا ہے (نہ تو نے اپنے آپ پر رحم کیا، نہ ہم پر اور نہ خاندانِ یعقوب پر کہ جو خاندانِ نبوت ہے) آخر ہمیں بتا تو سہی کہ تو نے کس وقت پیمانہ اٹھایا اور اپنے بار میں رکھ لیا۔

بنیامین نے جو معاملے کی اصل اور قضیے کے باطن کو جانتا تھا ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ یہ کام اسی شخص نے کیا ہے جس نے تمہاری دی ہوئی قیمت تمہارے بار میں رکھ دی تھی لیکن بھائیوں کو اس حادثے نے اس قدر پریشان کر رکھا تھا کہ وہ سمجھ نہ سکے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔[1]

پھر قرآن مزید کہتا ہے: ہم نے اس طرح یوسف کے لیے ایک تدبیر کی (تاکہ وہ اپنے بھائی کو دوسرے بھائیوں کی مخالفت کے بغیر روک سکیں) (کذٰلک کدنا لیوسف)۔

اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر یوسف قوانین مصر کے مطابق سلوک کرتے تو انہیں چاہیے تھا کہ اسے زدوکوب کرتے اور قید خانے میں ڈال دیتے لیکن اس طرح نہ صرف بھائی کو آزار و تکلیف پہنچتی بلکہ خود ان کا مقصد کہ بھائی کو اپنے پاس رکھیں، پورا نہ ہوتا۔ اسی لیے انہوں نے پہلے بھائیوں سے اعتراف لیا کہ اگر تم نے چوری کی ہو تو تمہارے نزدیک اس کی کیا سزا ہے تو انہوں نے اپنے ہاں رائج طریقے کے مطابق جواب دیا کہ ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ چور کو اس کی چوری کے بدلے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں اور اس سے کام لیتے ہیں اور حضرت یوسفؑ نے بھی اسی طریقے کے مطابق ان سے سلوک کیا کیونکہ مجرم کو سزا دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے اس کے اپنے قانون کے مطابق سزا دی جائے۔

اسی بناء پر قرآن کہتا ہے: یوسفؑ ملکِ مصر کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے اور اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے (ما کان لیأخذ اخاہ فی دین الملک)۔

اس کے بعد استثناء کے طور پر فرماتا ہے: مگر یہ کہ خدا چاہے (الا ان یشاء اللّٰہ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کام جو یوسفؑ نے انجام دیا اور بھائیوں کے ساتھ ان کے طریقے کے مطابق سلوک کیا فرمانِ الٰہی کے مطابق تھا اور یہ بھائی کی حفاظت اور ان کے باپ کی اور دوسرے بھائیوں کی آزمائش کی تکمیل کے لیے ایک منصوبہ تھا۔

آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں (نرفع درجات من نشاء)۔ اُن افراد کے درجات — جو اہل ہوں اور یوسف کی طرح امتحانات کی کٹھالی سے صحیح سالم نکل آئیں۔

بہرحال ہر عالم سے برتر ایک اور عالم و دانا ہے (یعنی خدا) (و فوق کل ذی علم علیم) اور وہی ہے کہ جس نے اس منصوبے کا یوسف کو الہام کیا تھا۔

چند اہم نکات

مندرجہ بالا آیات سے بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا ایک ایک کرکے جواب دیا جائے گا:

---

[1] مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۲۵۳، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

۱۔ یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا؟ یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہیں کروایا تاکہ ان کے باپ کو جانکاہ غمِ فراق سے جلدی نجات ملتی؟۔

اس سوال کا جواب جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے یہ ہے کہ یہ باپ اور بھائیوں کے امتحان کے پروگرام کی تکمیل کے لیے تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کام خود غرضی کی بناء پر نہ تھا بلکہ ایک فرمانِ الٰہی کے ماتحت تھا۔ خدا چاہتا تھا کہ دوسرے بیٹے کے کھونے پر بھی یعقوبؑ کے عزم اور حوصلے کا امتحان لے اور یوں ان کے تکامل اور ترقی کا آخری زینہ بھی طے ہو جائے اور بھائی بھی آزمائے جائیں کہ ایسے موقع پر جب کہ ان کا بھائی اس طرح کے معاملے میں گرفتار ہوا ہے تو وہ باپ سے باندھے گئے پیمان کی کس طرح سے حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ بے گناہ پر چوری کا الزام؟: کیا جائز تھا کہ ایک بے گناہ شخص پر چوری کا اتہام لگایا جاتا، ایسا اتہام کہ جس کے بُرے آثار نے باقی بھائیوں کو بھی کسی حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا؟

اس سوال کا جواب بھی خود واقعے میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ معاملہ خود بنیامین کی رضامندی سے انجام پایا تھا۔ کیونکہ حضرت یوسفؑ نے پہلے اپنے آپ کو اس سے متعارف کروایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ یہ منصوبہ خود اس کی حفاظت کے لیے بنایا گیا ہے۔ نیز اس سے بھائیوں پر بھی کوئی تہمت نہیں لگی البتہ انہیں اضطراب اور پریشانی ضرور ہوئی جس میں کہ ایک اہم امتحان کی وجہ سے کوئی ہرج نہ تھا۔

۳۔ چوری کی نسبت سب کی طرف کیوں دی گئی؟: کیا "انکم لسارقون" یعنی تم چور ہو" کہہ کر سب کی طرف چوری کی نسبت دینا جھوٹ نہ تھا اور اس جھوٹ اور تہمت کا کیا جواز تھا؟

ذیل کے تجزیے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا:

اولاً یہ معلوم نہیں کہ یہ بات کہنے والے کون لوگ تھے۔ قرآن میں صرف اس قدر ہے: "قالوا" یعنی انہوں نے کہا، ہو سکتا ہے یہ بات کہنے والے حضرت یوسفؑ کے کچھ کارندے ہوں کہ جب انہوں نے دیکھا کہ مخصوص پیمانہ نہیں ہے تو یقین کر لیا کہ کنعان کے قافلے میں سے کسی شخص نے اسے چرایا ہے اور یہ معمول ہے کہ اگر کوئی چیز ایسے افراد میں چوری ہو جائے کہ جو ایک ہی گروہ کی صورت میں تشکل ہو اور اصل چور پہچانا نہ جائے تو سب کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیا ہے یعنی تم میں سے ایک نے یا تم میں سے بعض نے ایسا کیا ہے۔

ثانیاً۔ اس بات کا اصلی نشانہ بنیامین تھا جو کہ اس نسبت پر راضی تھا کیونکہ اس منصوبے میں ظاہراً تو اس پر چوری کی تہمت لگی تھی لیکن درحقیقت وہ اس کے اپنے بھائی یوسفؑ کے پاس رہنے کے لیے مقدمہ تھی اور یہ جو سب پر الزام آیا یہ ایک بالکل عارضی سی بات تھی جو صرف برادرانِ یوسفؑ کے سامان کی تلاشی پر ختم ہوگیا اور جو درحقیقت مراد تھا یعنی "بنیامین" وہ پہچان لیا گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں جس چوری کی ان کی طرف نسبت دی گئی ہے وہ گزشتہ زمانے سے مربوط تھی اور وہ تھی بھائیوں کا یوسفؑ کے باپ یعقوبؑ سے یوسفؑ کو چرانا ___ لیکن یہ خیال اس صورت میں درست ہو سکتا ہے جب یہ نسبت حضرت یوسفؑ کی طرف سے انہیں دی جاتی کیونکہ وہی گزشتہ معاملے سے آگاہ تھے اور شاید بعد والے جملے میں اسی کی طرف اشارہ ہو کیونکہ حضرت یوسفؑ کے مامورین نے یہ نہیں کہا کہ تم نے بادشاہ کا پیمانہ چوری کیا ہے بلکہ کہا: "نفقد صواع الملك" یعنی "ہم بادشاہ کا پیمانہ مفقود پاتے ہیں"۔ (لیکن پہلا جواب زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے)۔

۴۔ اس زمانے میں چوری کی سزا؟ اس زمانے میں چوری کی سزا کیا تھی اس سلسلے میں زیرِ بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں

Marfat.com

اور کنعان کے باشندوں میں چوری کی سزا مختلف تھی۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں اور احتمالاً اہلِ کنعان میں اس عمل کی سزا یہ تھی کہ چور کو اس چوری کے بدلے میں (ہمیشہ کے لیے یا وقتی طور پر) غلام بنا لیا جاتا[1] لیکن مصریوں میں یہ سزا رائج نہ تھی بلکہ چوروں کو دوسرے ذرائع سے مثلاً مار پیٹ سے اور قید و بند وغیرہ سے سزا دیتے تھے۔

بہرحال یہ جملہ اس امر کی دلیل نہیں بنتا کہ آسمانی ادیان میں سے کسی میں غلام بنا لینا چور کی سزا تھی کیونکہ بسا اوقات کسی گروہ میں رائج کوئی طریقہ اس زمانے کے لوگوں کی طرف سے شمار ہوتا ہے۔ غلامی کی تاریخ میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ بے ہودہ اقوام میں یہ طریقہ رہا ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز ہو جاتا تو اسے غلام بنا لیا جاتا۔

۵۔ سقایہ "یا" صواع " : زیرِ نظر آیات میں کبھی لفظ "صواع" (پیمانہ) استعمال ہوا ہے اور کبھی "سقایۃ" (پانی پینے کا برتن)۔ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ پیمانہ ابتداء میں بادشاہ کے پینے کا برتن تھا لیکن جس وقت اناج سرزمین مصر میں گراں اور کم یاب ہو گیا اور اس کی راشن بندی ہو گئی تو اس امر کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اور اس لیے کہ لوگ نہایت احتیاط سے اور کم خرچ کریں بادشاہ کے پانی پینے کے لیے استعمال ہونے والا مخصوص برتن اس کے لیے پیمانہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔

اس برتن کی خصوصیات کے ضمن میں مفسرین نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ چاندی کا تھا اور بعض کے بقول وہ سونے کا تھا بعض نے اضافہ کیا ہے کہ اس میں جواہرات بھی جڑے ہوئے تھے۔ کچھ غیر معتبر روایات میں بھی ایسے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔

جو کچھ مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے کسی زمانے میں بادشاہِ مصر پانی پیتا تھا بعد میں وہ پیمانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ بھی واضح ہے کہ ایک ملک کی تمام ترضروریات کو اس قسم کے پیمانے سے ناپ کر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ شاید ایسا رمزاً کیا گیا ہو اور ان سالوں میں غلے کی کم یابی اور اہمیت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر اسے استعمال کیا گیا ہو تاکہ لوگ اسے صرف کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیں۔ ضمناً اس بناء پر کہ وہ پیمانہ اس وقت حضرت یوسفؑ کے قبضے میں تھا لہٰذا وہ اس بات کا سبب بنتا کہ اگر چور کو غلام بنایا جاتا تو وہ صاحبِ پیمانہ یعنی خود حضرت یوسفؑ کا غلام بنتا اور انہی کے پاس رہتا اور بالکل اسی مقصد کے لیے حضرت یوسفؑ نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اس زمانے میں ایک گروہ میں یہ طریقہ رائج تھا کہ وہ چور کو ایک سال کے لیے غلام بنا لیتے تھے۔ نیز یہ بھی نقل کیا ہے کہ خاندانِ یعقوبؑ میں چوری کی مقدار کے برابر غلامی کی مدت معین کی جاتی تھی (تاکہ وہ اسی کے مطابق کام کرے)۔

Marfat.com

۷۷۔ قَالُوٓا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ ۚ فَاَسَرَّہَا یُوۡسُفُ
فِیۡ نَفۡسِہٖ وَ لَمۡ یُبۡدِہَا لَہُمۡ ۚ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّکَانًا ۚ وَ اللّٰہُ
اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ ○
۷۸۔ قَالُوۡا یٰۤاَیُّہَا الۡعَزِیۡزُ اِنَّ لَہٗۤ اَبًا شَیۡخًا کَبِیۡرًا فَخُذۡ اَحَدَنَا
مَکَانَہٗ ۚ اِنَّا نَرٰىکَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○
۷۹۔ قَالَ مَعَاذَ اللّٰہِ اَنۡ نَّاۡخُذَ اِلَّا مَنۡ وَّجَدۡنَا مَتَاعَنَا عِنۡدَہٗۤ ۙ اِنَّاۤ
اِذًا لَّظٰلِمُوۡنَ ○ ع

ترجمہ

۷۷۔ (بھائیوں نے) کہا: اگر اس (بنیامین) نے چوری کی ہے تو (تعجب کی بات نہیں) اس کے بھائی (یوسف) نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی یوسف (کو بہت دکھ ہوا اور اس) نے اس (دکھ) کو اپنے اندر چھپائے رکھا اور ان پر ظاہر نہیں کیا۔ (بس اتنا) کہا: تم بدتر ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو خدا اس سے زیادہ آگاہ ہے۔

۷۸۔ انہوں نے کہا: اے عزیز! اس کا ایک بوڑھا باپ ہے (اور وہ بہت پریشان ہوگا) لہٰذا ہم میں سے کسی ایک کو لے لے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تو نیکوکاروں میں سے ہے۔

۷۹۔ اس نے کہا: اس سے خدا کی پناہ کہ جس شخص کے پاس سے ہمارا مال و متاع ملا ہم سوائے اُس کے کسی اور کو لیں کیونکہ اس صورت میں ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

تفسیر

برادرانِ یوسفؑ کی فداکاری کیوں قبول نہ ہوئی؟

آخرکار بھائیوں نے یقین کرلیا کہ ان کے بھائی بنیامین نے ایسی قبیح اور منحوس چوری کی ہے اور اس طرح اس نے عزیز مصر کی نظروں

Marfat.com

میں ان کا سابقہ ریکارڈ سارا خراب کر دیا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لیے انہوں نے کہا: "اگر اس لڑکے نے چوری کی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس کا بھائی یوسف بھی پہلے ایسے کام کا مرتکب ہو چکا ہے" اور یہ دونوں ایک ہی ماں اور باپ سے ہیں اور ہم کہ جو دوسری ماں سے ہیں ہمارا حساب کتاب ان سے الگ ہے (قالوا ان یسرق فقد سرق اخ له من قبل)۔ اس طرح انہوں نے اپنے اور بنیامین کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرنا چاہی اور اس کا تعلق یوسفؑ سے جوڑ دیا۔

یہ بات سن کر یوسفؑ بہت دکھی اور پریشان ہوئے اور "اسے دل میں چھپائے رکھا اور ان کے سامنے اظہار نہ کیا" (فاسرها یوسف فی نفسه ولم یبدها لهم)۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بات کہہ کر انہوں نے ایک بہت بڑا بہتان باندھا ہے لیکن انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس اجمالی طور پر ان سے اتنا "کہا: جس کی طرف تم یہ نسبت دیتے ہو تم اس سے بدتر ہو" یا "میرے نزدیک مقام و منزلت کے لحاظ سے تم بدترین لوگ ہو" (قال انتم شر مکانا)۔

اس کے بعد مزید کہا: جو کچھ تم کہتے ہو خدا اس کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے (والله اعلم بما تصفون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے ان بحرانی لمحوں میں اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے اپنے بھائی یوسفؑ پر ایک ناروا تہمت باندھی تھی لیکن پھر بھی اس کام کے لیے کوئی بہانہ اور سند ہونا چاہیے جس کی بنا پر وہ یوسفؑ کی طرف ایسی نسبت دیں۔ اس سلسلے میں مفسرین کاوش و زحمت میں پڑے ہیں اور گزشتہ لوگوں کی تواریخ سے انہوں نے تین روایات نقل کی ہیں۔

پہلی یہ کہ یوسفؑ اپنی ماں کی وفات کے بعد اپنی پھوپھی کے پاس رہا کرتے تھے اور انہیں یوسفؑ سے بہت زیادہ پیار تھا۔ جب آپ بڑے ہو گئے اور حضرت یعقوبؑ نے انہیں ان کی پھوپھی سے واپس لینا چاہا تو ان کی پھوپھی نے ایک منصوبہ بنایا اور وہ یہ کہ کمربند یا ایک خاص شال جو حضرت اسحاقؑ کی جانب سے ان کے خاندان میں بطور یادگار چلی آ رہی تھی یوسفؑ کی کمر سے باندھ دی اور دعویٰ کیا کہ یوسفؑ اسے چھپا لے جانا چاہتا تھا۔ ایسا انہوں نے اس لیے کیا تاکہ اس خاص کمربند یا شال کے بدلے یوسفؑ کو اپنے پاس رکھ لیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے مادری رشتے داروں میں سے ایک کے پاس ایک بت تھا جسے یوسفؑ نے اٹھا کر توڑ دیا اور راستے پر لا پھینکا لہٰذا انہوں نے حضرت یوسفؑ پر چوری کا الزام لگا دیا حالانکہ اس میں تو کوئی گناہ نہیں تھا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ کبھی کبھار وہ دسترخوان سے کچھ کھانا لے کر مسکینوں اور حاجت مندوں کو دے دیتے لہٰذا بہانہ تراش بھائیوں نے اسے بھی چوری کا الزام دینے کے لیے سند بنا لیا حالانکہ ان میں سے کوئی چیز گناہ کے زمرے میں نہیں آتی۔

اگر ایک شخص کسی کو کوئی لباس پہنا دے اور پہننے والا نہ جانتا ہو کہ یہ کسی دوسرے کا مال ہے تو کیا اسے چوری کا الزام دینا صحیح ہے۔

اسی طرح کیا کسی بت کو اٹھا کر پٹخ دینا گناہ ہے۔

نیز انسان کوئی چیز اپنے باپ کے دسترخوان سے اٹھا کر مسکینوں کو دے دے جب کہ اسے یقین ہو کہ اس کا باپ اس پر راضی ہے تو کیا اسے گناہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

بھائیوں نے دیکھا کہ ان کے چھوٹے بھائی بنیامین کو اس قانون کے مطابق عزیز مصر کے پاس رہنا پڑے گا جسے وہ خود قبول کر چکے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے باپ سے پیمان باندھا تھا کہ بنیامین کی حفاظت اور اسے واپس لانے کے لیے اپنی پوری کوشش کریں گے۔ ایسے میں انہوں نے یوسفؑ کی طرف رخ کیا جسے ابھی تک انہوں نے پہچانا نہیں تھا اور "کہا: اے عزیز مصر: اے بزرگوار صاحب

Marfat.com

اقتدار! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے اور وہ اس کی جدائی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہم نے آپ کے اصرار پر اسے باپ سے جُدا کیا اور باپ نے ہم سے تاکیدی وعدہ لیا کہ ہم ہر قیمت پر اسے واپس لائیں گے۔ اب ہم پر احسان کیجیے اور اس کے بدلے میں ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیجیے" (قالوا یا ایها العزیز ان له ابًا شیخًا کبیرًا فخذ احدنا مکانه) "کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نیکوکاروں میں سے ہیں" اور یہ پہلا موقع نہیں کہ آپ نے ہم پر لطف و کرم اور مہر و محبت کی ہے، یہ مہربانی کر کے اپنے کرم نوازیوں کی تکمیل کیجیے (انا نرٰك من المحسنین)۔

حضرت یوسفؑ نے اس تجویز کی شدت سے نفی کی اور "کہا: پناہ بخدا! کیسے ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس سے ہمارا مال و متاع برآمد ہوا ہے ہم اُس کے علاوہ کسی شخص کو رکھ لیں" کبھی تم نے سنا ہے کہ ایک منصف مزاج شخص نے کسی بے گناہ کو دوسرے کے جُرم میں سزا دی ہو؟ (قال معاذ الله ان نأخذ الا من وجدنا متاعنا عنده) اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے (انّآ اذًا لظالمون)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی اس گفتگو میں بھائی کی طرف چوری کی کوئی نسبت نہیں دی بلکہ کہتے ہیں کہ "جس شخص کے پاس سے ہمیں ہمارا مال و متاع ملا ہے"، اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس امر کی طرف سنجیدگی سے متوجہ تھے کہ اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی غلط بات نہ کریں۔

Marfat.com

۸۰۔ فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيرُهُمْ اَلَمْ
تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ
مَا فَرَّطْتُّمْ فِي يُوسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ
اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ○
۸۱۔ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ
اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ○
۸۲۔ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَاِنَّا
لَصٰدِقُوْنَ ○

ترجمہ

۸۰۔ جب (بھائی) اس سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف گئے اور آپس میں سرگوشی کی۔ ان میں سب سے بڑے نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے تم سے الٰہی پیمان لیا تھا اور اس سے پہلے تم نے یوسفؑ کے بارے میں کوتاہی کی تھی لہٰذا میں اس سرزمین سے نہیں جاؤں گا جب تک مجھے میرا باپ اجازت نہ دے یا خدا اپنا حکم میرے بارے میں صادر فرمائے اور وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔

۸۱۔ تم اپنے باپ کی طرف پلٹ جاؤ اور اس سے کہو ابا (جان) ! تمہارے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کے سوا ہم نے گواہی نہیں دی اور نہ ہی ہم غیب سے آگاہ تھے۔

۸۲۔ (مزید اطمینان کے لیے) اس شہر سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے نیز اس قافلے سے پوچھ لیں جس کے ساتھ ہم آئے ہیں اور ہم (اپنی بات میں) سچے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے

بھائیوں نے بنیامین کی رہائی کے لیے اپنی آخری کوشش کر دیکھی لیکن انہوں نے اپنے سامنے تمام راستے بند پائے۔ ایک طرف تو اس کام کو کچھ اس طرح سے انجام دیا گیا تھا کہ ظاہراً بھائی کی برأت ممکن نہ تھی اور دوسری طرف عزیزِ مصر نے اس کی جگہ کسی اور فرد کو رکھنے کی تجویز قبول نہ کی لہٰذا وہ مایوس ہو گئے۔ یوں انہوں نے کنعان کی طرف لوٹ جانے اور باپ سے سارا ماجرا بیان کرنے کا ارادہ کر لیا۔ قرآن کہتا ہے: جس وقت وہ عزیزِ مصر سے یا بھائی کی نجات سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف کو آئے دوسروں سے الگ ہو گئے اور سرگوشی کرنے لگے (فلما استیئسوا منه خلصوا نجیًا)۔

"خلصوا" یعنی "خالص ہو گئے" یہ دوسروں سے الگ ہونے اور خصوصی میٹنگ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور "نجی" "مناجات" کے مادہ سے دراصل "نجوہ" سے مرتفع زمین کے معنی میں لیا گیا ہے چونکہ اونچی اور مرتفع زمینیں اپنے اطراف سے جدا اور الگ ہوتی ہیں اور مخفی میٹنگیں اور سرگوشیاں اردگرد والوں سے ہٹ کر ہوتی ہیں اس لیے انہیں "نجوی" کہتے ہیں (اس بناء پر "نجوی" ہر قسم کی محرمانہ بات کو کہا جاتا ہے چاہے وہ کان میں کہی جائے یا کسی خفیہ میٹنگ میں)۔

جملہ "خلصوا نجیا"، جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے فصیح ترین اور خوبصورت ترین قرآنی تعبیر ہے جس میں دو لفظوں کے ذریعے بہت سے مطالب بیان کر دیئے گئے ہیں جب کہ یہ مطالب بیان کرنے کے لیے بہت سے جملے درکار تھے۔

بہر حال سب سے بڑے بھائی نے اس خصوصی میٹنگ میں ان سے کہا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے الٰہی پیمان لیا ہے کہ بنیامین کو ہر ممکنہ صورت میں ہم واپس لائیں گے (قال کبیرهم الم تعلموا ان اباکم قد اخذ علیکم موثقًا من الله) اور تم ہی نے اس سے پہلے بھی یوسف کے بارے میں کوتاہی کی"، اور باپ کے نزدیک تمہارا گزشتہ کردار بُرا ہے (ومن قبل ما فرطتم فی یوسف)[1] "اب جب کہ معاملہ یوں ہے تو میں اپنی جگہ سے (یا سرزمینِ مصر سے) نہیں جاؤں گا اور یہیں پڑاؤ ڈالوں گا، مگر یہ کہ میرا باپ مجھے اجازت دے دے یا خدا میرے متعلق کوئی فرمان صادر کرے جو کہ بہترین حاکم و فرماں روا ہے (فلن ابرح الارض حتی یاذن لی ابی او یحکم الله لی وهو خیر الحاکمین)۔

اس حکم سے یا تو موت کا حکم مراد ہے یعنی مرتے دم تک یہاں سے نہیں جاؤں گا یا خدا کی طرف پیدا ہونے والا کوئی چارہ کار مراد ہے یا پھر کوئی قابلِ قبول اور قابلِ توجیہ عذر مراد ہے جو کہ باپ کے نزدیک قطعی طور پر قابلِ قبول ہو۔

پھر بڑے بھائی نے دوسرے بھائیوں کو حکم دیا کہ "تم باپ کے پاس لوٹ جاؤ اور کہو: ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے

---

[1] "فرطتم"، "تفریط" کے مادہ سے دراصل "فرط" (بروزنِ "شرط") مقدم ہونے کے معنی میں ہے اور جب یہ باب تفعیل میں آجائے تو آگے بڑھنے میں کوتاہی کرنے کے معنی میں ہے اور جب باب افعال سے "افراط" ہو تو تقدم اور آگے بڑھنے میں تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

(ارجعوا الی ابیکم فقولوا یا ابانا ان ابنک سرق)۔" اور یہ جو ہم گواہی دے رہے ہیں اتنی ہی ہے جتنا ہمیں علم ہوا ہے" بس ہم نے اتنا دیکھا کہ بادشاہ کا پیمانہ ہمارے بھائی کے بارے برآمد ہوا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے چوری کی ہے، باقی رہا امرِ باطن تو وہ خدا جانتا ہے (وما شہدنا الا بما علمنا)۔" اور ہمیں غیب کی خبر نہیں" (وما کنا للغیب حافظین)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ بھائیوں کا مقصد یہ ہو کہ وہ باپ سے کہیں کہ اگر ہم نے تیرے پاس گواہی دی اور عہد کیا کہ ہم بھائی کو لے جائیں گے اور واپس لے آئیں گے تو یہ اس بناء پر تھا کہ ہم اس کے باطن سے باخبر نہ تھے اور ہم غیب سے آگاہ نہ تھے کہ اس کا انجام یہ ہوگا۔

پھر اس بناء پر کہ باپ سے ہر طرح کی بدگمانی دُور کریں اور اسے مطمئن کریں کہ ماجرا اسی طرح ہے نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ، انہوں نے کہا، مزید تحقیق کے لیے اس شہر سے سوال کرلیں جس میں ہم تھے (وسئل القریۃ التی کنا فیہا)[1] اسی طرح اس قافلے سے پوچھ لیں جس کے ساتھ ہم آپ کے پاس آئے ہیں اور فطری طور پر آپ اہلِ کنعان کو جانتے ہیں جو کہ اس قافلے میں موجود ہیں، ان سے حقیقتِ حال پوچھ لیں (والعیر التی اقبلنا فیہا)۔[2]

بہر حال مطمئن رہیں کہ ہم اپنی بات میں سچے ہیں اور حقیقت کے سوا کچھ نہیں کہتے (وانا لصادقون)۔

اس ساری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیامین کی چوری کا واقعہ مصر میں مشہور ہو چکا تھا۔ یہ بات شہرت پا چکی تھی کہ کنعان سے ایک قافلہ یہاں آیا ہے۔ اس میں سے ایک شخص بادشاہ کا پیمانہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ بادشاہ کے مامورین بروقت پہنچ گئے اور انہوں نے اس شخص کو روک لیا۔

شاید بھائیوں نے جو یہ کہا کہ مصر کے علاقے سے پوچھ لیں یہ اس طرف کنایہ ہو کہ یہ واقعہ اس قدر مشہور ہو چکا ہے کہ در و دیوار کو اس کا علم ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ سب سے بڑا بھائی کون تھا؟ بعض نے سب سے بڑے بھائی کا نام "روبین" (روبیل) لکھا ہے۔ بعض نے "شمعون" کو سب سے بڑا بھائی سمجھا ہے۔ بعض نے اس کا نام "یہودا" بیان کیا ہے۔

---

[1] "قریۃ" عربی زبان میں گاؤں اور بستی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق کلی طور پر آبادیوں اور شہروں پر ہوتا ہے اور یہاں مراد اس سے مصر کا علاقہ ہے۔

[2] "عیر" ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اونٹوں اور چوپایوں کو اناج لانے اور لے جانے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ یعنی انہیں مجموعی طور پر "عیر" کہتے ہیں لہٰذا ان سے سوال کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ لفظ انسانوں کا مفہوم بھی لیے ہوئے ہے اور مقدر و محذوف سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ "عیر" میں صرف چوپایوں کا مفہوم شامل ہے۔ اس صورت میں آیت تقدیر کی محتاج ہے جیسا کہ "قریہ" میں بھی ہے۔

Marfat.com

نیز اس لحاظ سے بھی مفسّرین میں اختلاف ہے کہ یہاں بڑا ہونے سے مراد عمر میں بڑا ہے یا عقل و فہم کے لحاظ سے بڑا ہے۔ البتہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ یہاں سن و سال میں بڑا ہونا مراد ہے۔

۲۔ **موجود قرائن کی بنیاد پر فیصلہ:** اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اقرار اور گواہ نہ بھی ہوں تو قاضی قطعی قرائن پر عمل کر سکتا ہے کیونکہ برادرانِ یوسفؑ کے اس واقعے میں نہ گواہ تھے اور نہ اقرار۔ صرف بنیامین کے بارے میں سے بادشاہ کے پیمانے کا مل جانا اس کے مجرم ہونے کی دلیل شمار کیا گیا۔

نیز ان میں سے ہر ایک ذاتی طور پر اپنے بار کو پُر کرتا تھا یا کم از کم پُر کرتے وقت وہاں حاضر ہوتا تھا اور اگر تالا لگانا ہوتا یا بند کرنا ہوتا تو چابی وغیرہ بھی خود اسی کے قبضے میں ہوتی۔ دوسری طرف کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ کار فرما ہے۔ مزید یہ کہ کنعان کے مسافروں (برادرانِ یوسفؑ) کا اس شہر میں کوئی دشمن بھی نہ تھا کہ جو ان کے خلاف کوئی سازش کرتا۔

ان تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ بنیامین کے بارمیں سے جو بادشاہ کا پیمانہ برآمد ہوا ہے یہ خود اسی کا ذاتی کام ہے۔

دورِ حاضر میں ایسی ہی بنیادوں پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں فقہِ اسلامی میں مزید جستجو اور تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ یہ امر موجودہ زمانے میں عدالتی بحثوں میں بہت مؤثر ہے۔ کتاب القضاء میں اس سلسلے میں بحث کی جانا چاہیے۔

۳۔ **برادرانِ یوسفؑ میں فرق:** مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ برادرانِ یوسفؑ میں عزم و ہمت کے لحاظ سے بہت فرق تھا۔ سب سے بڑا بھائی اپنے وعدے کا بہت سختی سے پابند تھا جب کہ دوسرے بھائیوں نے جب دیکھا کہ عزیزِ مصر سے ان کی گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تو انہوں نے بس اسی پر اپنے آپ کو معذور سمجھا اور مزید کوشش نہ کی۔ البتہ حق بڑے بھائی کے ساتھ تھا کیونکہ وہ مصر ہی میں ٹھہر گیا خصوصاً عزیزِ مصر کے دربار کے نزدیک اس نے پڑاؤ ڈال لیا۔ اس سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ لطف و مہربانی کرے اور ایک پیمانے کی وجہ سے جو آخر کار مل گیا تھا اور ایک مسافر اس سے داغدار بھی ہو گیا تھا، اب اس کے بدلے بھائیوں اور اس کے بوڑھے باپ کو سزا نہ دے۔ اسی احتمال کی بناء پر وہ مصر میں ٹھہر گیا اور بھائیوں کو باپ کا حکم معلوم کرنے کے لیے باپ کی خدمت میں روانہ کر دیا تاکہ وہ جا کر سارا واقعہ باپ سے بیان کریں۔

Marfat.com

۸۳۔ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ
يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○
۸۴۔ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ
الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ○
۸۵۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ
مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ○
۸۶۔ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۸۳۔ (یعقوبؑ نے) کہا: نفس (اور ہوا و ہوس) نے معاملہ تمہاری نگاہ میں اس طرح سے مزین کر دیا ہے۔ میں صبر کروں گا، صبر جمیل (کہ جس میں کفران نہ ہو)، مجھے اُمید ہے کہ خدا ان سب کو میری طرف پلٹا دے گا کیونکہ وہ علیم و حکیم ہے۔

۸۴۔ اور ان سے منہ پھیر لیا اور کہا: ہائے یوسفؑ، اور اس کی آنکھیں غم و اندوہ سے سفید ہو گئیں لیکن وہ اپنا غصہ پی جاتا (اور ہرگز ناشکری نہ کرتا)۔

۸۵۔ انہوں نے کہا: بخدا! تو یوسفؑ کو اس قدر یاد کرتا ہے کہ تو موت کے قریب جا پہنچے گا یا ہلاک ہو جائے گا۔

۸۶۔ اس نے کہا: میں اپنا درد و غم صرف خدا سے کہتا ہوں (اور اس کے ہاں شکایت کرتا ہوں) اور میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔

Marfat.com

تفسیر

میں وہ الطافِ الٰہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

بھائی مصر سے چل پڑے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بھائی کو وہاں چھوڑ آئے اور پریشان وغم زدہ کنعان پہنچے۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس سفر سے واپسی پر باپ نے جب گزشتہ سفر کے برعکس غم واندوہ کے آثار اُن کے چہروں پر دیکھے تو سمجھ گئے کہ کوئی ناگوار خبر لائے ہیں خصوصاً جب کہ بنیامین اور سب سے بڑا بھائی اُن کے ہمراہ نہ تھا۔ جب بھائیوں نے بغیر کسی کمی بیشی کے ساری آپ بیتی کہہ دی تو یعقوبؑ بہت حیران ہوئے اور ان کی طرف رُخ کرکے "کہنے لگے: تمہاری نفسانی خواہشات نے یہ معاملہ تمہارے سامنے اس طرح سے پیش کیا ہے اور اسے اس طرح سے مزین کیا ہے" (قال بل سولت لکم انفسکم امرًا)۔

یعنی بالکل وہی جملہ کہا جو انہوں نے حادثۂ یوسفؑ کے بعد کہا تھا جب کہ انہوں نے وہ جھوٹا واقعہ بیان کیا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت یعقوبؑ نے ان کے سابقہ کردار ہی کے باعث ان کے بارے میں سوءِ ظن کیا اور یقین کرلیا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اس میں کوئی سازش ہے حالانکہ ایسا کرنا نہ صرف یعقوبؑ جیسے پیغمبر سے بعید معلوم ہوتا ہے بلکہ عام لوگوں سے بھی بعید ہے کہ کسی کو صرف اس کے کسی سابقہ بُرے کردار کی وجہ سے یقینی طور پر متہم کریں جب کہ دوسری طرف گواہ بھی ہوں اور تحقیق کا راستہ بھی بند نہ ہو۔

یا پھر— کیا اس جملے کا مقصد ایک اور نکتہ بیان کرنا ہے جس کے یہ پہلو ہیں:

۱۔ تم فقط بادشاہ کا پیمانہ بھائی کے بار میں دیکھ کر کیوں مان گئے کہ اس نے چوری کی ہے جب کہ تنہا یہ بات منطقی دلیل نہیں بن سکتی۔

۲۔ تم نے عزیزِ مصر سے کیوں کہا کہ چور کی یہ سزا ہے کہ اسے غلام بنالو حالانکہ یہ کوئی خدائی قانون نہیں ہے بلکہ کنعان کے لوگوں کی ایک غلط رسم ہے (یہ بات اس صورت میں درست ہے جب بعض مفسرین کے قول کے خلاف اس قانون کو شریعتِ یعقوبؑ کا حصہ نہ سمجھا جائے)۔

۳۔ اس واقعے کے بعد تم فوراً کیوں چل پڑے اور بڑے بھائی کی طرح قیام کیوں نہیں کیا جب کہ تم میرے ساتھ پکا خدائی وعدہ کرچکے تھے[1]

اس کے بعد یعقوبؑ اپنی جانب متوجہ ہوئے اور "کہنے لگے کہ میں صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا اور میں اچھا صبر کروں گا کہ جو کفران سے خالی ہو (فصبر جمیل)۔

مجھے اُمید ہے کہ خدا ان سب کو (یوسف، بنیامین اور میرے بڑے بیٹے کو) میری طرف پلٹا دے گا (عسی اللہ ان یأتینی بھم

---

[1] یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ واقعۂ یوسف کی طرف اشارہ ہے، بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ یوسف کو ماں باپ سے جدا کرنے کا معاملہ مندرجہ بالا آیات میں بالکل نہیں آیا۔

Marfat.com

جمیعًا) کیونکہ میں جانتا ہوں کہ" وہ ان سب کے دل کی داخلی کیفیات سے باخبر ہے، علاوہ ازیں وہ حکیم بھی ہے اور وہ کوئی کام بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں کرتا" (انہ ھو العلیم الحکیم)۔

اس وقت یعقوبؑ رنج و غم میں ڈوب گئے۔ بنیامین کہ جو ان کے دل کی ڈھارس تھا واپس نہ آیا تو انہیں اپنے پیارے یوسفؑ کی یاد آگئی۔ انہیں خیال آیا کہ اے کاش آج وہ آبرومند، باایمان، باہوش اور حسین و جمیل بیٹا ان کی آغوش میں ہوتا اور اس کی پیاری خوشبو ہر لحہ باپ کو ایک حیاتِ نو بخشتی لیکن آج نہ صرف یہ کہ اس کا نام و نشان نہیں بلکہ اس کا جانشین بنیامین بھی اس کی طرح ایک دردناک معاملے میں گرفتار ہوگیا ہے" اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے رخ پھیر لیا اور کہا: ہائے یوسفؑ" (و تولی عنھم و قال یا اسفا علی یوسف)۔

بھائی کہ جو پہلے ہی بنیامین کے ماجرے پر باپ کے سامنے شرمندہ تھے یوسفؑ کا نام سن کر فکر میں ڈوب گئے۔ ان کے ماتھے پر عرقِ ندامت کے قطرے چمکنے لگے۔

حزن و ملال اتنا بڑھا کہ یعقوبؑ کی آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا یہاں تک کہ" اس کی آنکھیں درد و غم سے سفید اور نابینا ہوگئیں (وا بیضت عیناہ من الحزن)۔

لیکن اس کے باوجود وہ کوشش کرتے تھے کہ ضبط کریں اور اپنا غم و غصہ پی جائیں اور رضائے حق کے خلاف کوئی بات نہ کہیں" وہ باحوصلہ اور جواں مرد تھے اور انہیں اپنے غصے پر پورا کنٹرول تھا" (فھو کظیم)۔

ظاہر آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ اس وقت تک نابینا نہیں ہوئے تھے لیکن اب جب کہ رنج و غم کئی گنا بڑھ گیا اور آپ مسلسل گریہ وزاری کرتے رہے اور آپ کے آنسو تھمنے نہ پاتے تھے تو آپ کی بینائی ختم ہوگئی اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کوئی اختیاری چیز نہ تھی کہ جو صبر جمیل کے منافی ہو۔[1]

بھائی کہ جو ان تمام واقعات سے بہت پریشان تھے، ایک طرف تو ان کا ضمیر حضرت یوسفؑ کے واقعے کی بناء پر انہیں عذاب دیتا اور دوسری طرف وہ بنیامین کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک نئے امتحان کی چوکھٹ پر پاتے اور تیسری طرف باپ کا اتنا غم اور دکھ ان پر بہت گراں تھا لہٰذا انہوں نے پریشانی اور بے حوصلگی کے ساتھ باپ سے" کہا: بخدا تو اتنا یوسف یوسف کرتا ہے کہ بیمار ہو جائے گا اور موت کے کنارے پہنچ جائے گا یا ہلاک ہو جائے گا" (قالوا تاللہ تفتؤا تذکر یوسف حتی تکون حرضًا او تکون من الھالکین)۔[2]

لیکن کنعان کے اس مرد بزرگ اور روشن ضمیر پیغمبر نے ان کے جواب میں" کہا:

میں نے تمہارے سامنے اپنی شکایت پیش نہیں کی جو اس طرح کی باتیں کرتے ہو، میں اپنا درد و غم بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتا ہوں اور اس کے ہاں اپنی شکایت پیش کرتا ہوں" (قال انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ)۔[3]

اور اپنے خدا کی طرف سے مجھے ایسے الطاف و عنایات حاصل ہیں اور ایسی چیزیں مجھے معلوم ہیں کہ جن سے تم بے خبر ہو" (و اعلم من اللہ ما لا تعلمون)۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے اسی سورہ کی آیہ ۱۸ کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

[2] "حرض" (بروزن "مرض") فاسد اور پریشان کرنے والی چیز کے معنی میں ہے۔ یہاں اس کا معنی ہے بیمار، نحیف، لاغر اور قریب المرگ۔

[3] "بث" کا معنی ہے پراگندگی اور ایسی چیز جسے چھپایا نہ جا سکے اور یہاں واضح غم و اندوہ اور دل کی نمایاں پراگندگی کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

۸۷۔ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ
رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ○

۸۸۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَ
جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ○

۸۹۔ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ○

۹۰۔ قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِيْ ؗ قَدْ
مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ
الْمُحْسِنِيْنَ ○

۹۱۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ○

۹۲۔ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَهُوَ اَرْحَمُ
الرّٰحِمِيْنَ ○

۹۳۔ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ
وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ ع

ترجمہ

۸۷۔ اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسفؑ اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ خدا
کی رحمت سے کافر قوم کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

۸۸۔ جب وہ اُس (یوسفؑ) کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: اے عزیز! ہم اور ہمارا خاندان پریشانی میں گھر گیا

Marfat.com

ہے اور ہم اناج خریدنے کے لیے) تھوڑی سی پونجی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ہمارا پیمانہ پوری طرح بھر دے اور ہم پر صدقہ کر دے کیونکہ خدا صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔

۸۹۔ اُس نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسفؑ اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جب کہ تم جاہل تھے۔

۹۰۔ انہوں نے کہا: کیا تو ہی یوسفؑ ہے۔ اس نے کہا: (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے خدا نے ہم پر احسان کیا ہے۔ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر و استقامت دکھائے (آخر کار وہ کامیاب ہوتا ہے) کیونکہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

۹۱۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! خدا نے تجھے ہم پر مقدم رکھا اور ہم خطا کار تھے۔

۹۲۔ اُس نے کہا: آج تم پر کوئی ملامت و سرزنش نہیں ہے، خدا تمہیں بخشے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔

۹۳۔ یہ میری قمیض لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جائے گا اور تمام گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ۔

تفسیر

کوشش کرو اور مایوس نہ ہو

مصر اور اطراف مصر جس میں کنعان بھی شامل تھا میں قحط ظلم ڈھا رہا تھا۔ اناج بالکل ختم ہو گیا تو حضرت یعقوبؑ نے دوبارہ اپنے بیٹوں کو مصر کی طرف جانے اور غلہ حاصل کرنے کا حکم دیا لیکن اس مرتبہ اپنی آرزوؤں کی بنیاد یوسفؑ اور ان کے بھائی بنیامین کی تلاش کو قرار دیا اور کہا: "میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو" (یا بنی اذھبوا فتحسسوا من یوسف و اخیہ)۔

حضرت یعقوبؑ کے بیٹے چونکہ اس بارے میں تقریباً مطمئن تھے کہ یوسفؑ موجود ہی نہیں اس لیے وہ باپ کی اس نصیحت اور تاکید پر تعجب کرتے تھے۔

یعقوبؑ ان کے گوش گزار کر رہے تھے: "رحمتِ الٰہی سے کبھی مایوس نہ ہونا" کیونکہ اس کی قدرت تمام مشکلوں اور سختیوں سے مافوق ہے (ولا تایئسوا من روح اللہ) کیونکہ صرف بے ایمان کافر کہ جو قدرتِ خدا سے بے خبر ہیں اس کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں (انہ لا یایئس من روح اللہ الا القوم الکافرون)۔

"تحسس" مادہ "حس" سے ہے اور یہ قوت حس کے ذریعے کسی چیز کی جستجو اور تلاش کے معنی میں ہے۔ اور یہ کہ "تجسس" میں اور اس میں

Marfat.com

کیا فرق ہے، اس سلسلے میں مفسرین اور اربابِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔

ابنِ عباس سے منقول ہے کہ "تحسس" امورِ خیر میں ہے اور "تجسس" امورِ شر میں۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ "تحسس" افراد اور اقوام کی سرگزشت جاننے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور "تجسس" عیوب و نقائص کی جستجو کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض دیگر احباب نے دونوں سے ایک ہی معنی مراد لیا ہے۔

لیکن اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس میں فرمایا گیا ہے:

لا تجسسوا ولا تحسسوا

—— واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ نیز ان دونوں کے درمیان فرق کے بارے میں، زیرِ بحث آیت کے معنی میں، ابنِ عباس کا نظریہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث میں دونوں سے منع کیا گیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہو کہ لوگوں کے کاموں اور معاملات کی ٹوہ میں نہ رہو نہ ان کے اچھے کاموں کی ٹوہ میں اور نہ ہی بُرے کاموں کی ٹوہ میں۔

"روح" رحمت، راحت، سہولت اور کشائشِ کار کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب کہتا ہے کہ "روح" (بروزنِ "لوح") اور "روح" (بروزنِ "نوح") دونوں کا اصل میں ایک ہی معنی ہے اور یہ "جان" اور "تنفس" کے معنی میں ہیں۔ بعد ازاں "روح" (بروزن "لوح") رحمت اور کشائش کے معنی میں استعمال ہونے لگا (اس بناء پر کہ ہمیشہ مشکلات ٹل جانے پر انسان نئی روح اور جان پاتا ہے اور آزادی کا سانس لیتا ہے)۔

بہرحال فرزندانِ یعقوبؑ نے اپنا مال و اسباب باندھا اور مصر کی طرف چل پڑے اور اب کے وہ تیسری مرتبہ داستانوں سے معمور اس سرزمین پر پہنچے۔ گزشتہ سفروں کے برخلاف اس سفر میں ان کی روح کو ایک احساسِ ندامت کچوکے لگا رہا تھا کیونکہ مصر میں اور عزیزِ مصر کے نزدیک ان کا سابقہ کردار بہت بُرا تھا اور وہ بدنام ہو چکے تھے اور اندیشہ تھا کہ شاید بعض لوگ انہیں "کنعان کے چور" کے عنوان سے پہچانیں۔ دوسری طرف ان کے پاس گندم اور دوسرے اناج کی قیمت دینے کے لیے درکار مال و متاع موجود نہیں تھا اور ساتھ ہی بھائی بنیامین کے کھو جانے اور باپ کی انتہائی پریشانی نے ان کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ گویا تلوار ان کے حلقوم تک پہنچ گئی تھی۔ بہت ساری مشکلات اور روح فرسا پریشانیوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ ایسے میں جو چیز ان کے تسکینِ قلب کا باعث تھی وہ صرف باپ کا آخری جملہ تھا کہ جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کیونکہ اُس کے لیے ہر مشکل آساں ہے۔ اس عالم میں "وہ یوسفؑ کے پاس پہنچے اور اس وقت انتہائی پریشانی کے عالم میں انہوں نے اس کی طرف رُخ کیا اور کہا: اے عزیز! ہمیں اور ہمارے خاندان کو قحط، پریشانی اور مصیبت نے گھیر لیا ہے" (فلما دخلوا علیه قالوا یا ایها العزیز مسنا و اهلنا الضر)۔ "اور ہمارے پاس صرف تھوڑی سی کم قیمت پونجی ہے" (وجئنا ببضاعة مزجاة)[1] "لیکن پھر بھی ہمیں تیرے کرم اور شفقت پر بھروسہ ہے" "اور ہمیں توقع ہے کہ تو ہمارا پیمانہ بالکل پورا کرے گا" (فاوف لنا الکیل)۔ "اور اس معاملے میں ہم پر احسان کرتے ہوئے صدقہ کر" (وتصدق علینا)۔

---

[1] بضاعت۔ بضع کے مادہ سے ہے بروزن جزء ....

Marfat.com

اور اپنا اجر و ثواب ہم سے نہ لے بلکہ اپنے خدا سے لے کیونکہ خدا کریموں اور صدقہ کرنے والوں کو اجر خیر دیتا ہے (ان اللہ یجزی المتصدقین)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ برادرانِ یوسفؑ کو باپ نے تاکید کی تھی کہ پہلے یوسفؑ اور اُس کے بھائی کے لیے جستجو کریں اور بعد میں اناج حاصل کریں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس بات کی طرف چنداں توجہ نہیں کی اور سب سے پہلے انہوں نے عزیزِ مصر سے اناج کا تقاضہ کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں یوسفؑ کے ملنے کی چنداں اُمید نہ تھی یا ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ بہتر ہے کہ اپنے آپ کو اناج کے خریداروں کے طور پر پیش کریں جو کہ زیادہ طبیعی اور فطری ہے اور بھائی کی آزادی کا تقاضا ضمناً رہنے دیں تاکہ یہ چیز عزیزِ مصر پر زیادہ اثر انداز ہو۔

بعض نے کہا کہ "تصدق علینا" سے مراد وہی بھائی کی آزادی ہے ورنہ وہ اناج بغیر معاوضے کے حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اسے "تصدق" قرار دیا جاتا۔

روایات میں بھی ہے کہ بھائی باپ کی طرف سے عزیزِ مصر کے نام ایک خط لے کر آئے تھے اس خط میں حضرت یعقوبؑ نے عزیزِ مصر کے عدل و انصاف کا تذکرہ کیا۔ اپنے خاندان سے اس کی محبتوں اور شفقتوں کی تعریف کی۔ پھر اپنا اور اپنے خاندانِ نبوت کا تعارف کروایا۔ اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس کے ضمن میں اپنے بیٹے یوسفؑ اور دوسرے بیٹے بنیامین کے کھو جانے اور خشک سالی سے پیدا ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کیا۔ خط کے آخر میں اس سے خواہش کی گئی تھی کہ بنیامین کو آزاد کر دے اور تاکید کی تھی کہ ہمارے خاندان میں چوری وغیرہ ہرگز نہ تھی اور نہ ہو گی۔

جب بھائیوں نے باپ کا خط عزیزِ مصر کو دیا تو انہوں نے اسے لے کر چوما اور اپنی آنکھوں پر رکھا اور رونے لگے۔ گریہ کا یہ عالم تھا کہ قطراتِ اشک ان کے پیراہن پر گرنے لگے[1] (یہ دیکھ کر بھائی حیرت و فکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ عزیزِ مصر کو ان کے باپ سے کیا لگاؤ ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کے باپ کے خط نے اس میں ہیجان و اضطراب کیوں پیدا کر دیا ہے اور شاید اسی موقع پر ان کے دل میں یہ خیال بجلی کی طرح اترا ہو کہ ہو نہ ہو یہی خود یوسفؑ ہو اور شاید باپ کے اسی خط کی وجہ سے یوسفؑ اس قدر بے قرار ہو گئے کہ اب مزید اپنے آپ کو عزیزِ مصر کے نقاب میں نہ چھپا سکے اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بہت جلد بھائیوں سے بھائی کی حیثیت سے اپنا تعارف کروا دیا)۔

اس موقع پر جب کہ دورِ آزمائش ختم ہو رہا تھا اور یوسفؑ بھی بہت بے تاب اور سخت پریشان نظر آ رہے تھے تعارف کے لیے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بھائیوں کی طرف رُخ کر کے آپ نے کہا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم جاہل و نادان تھے تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا (قال هل علمتم ما فعلتم بيوسف واخيه اذ انتم جاهلون).

حضرت یوسفؑ کی عظمت اور شفقت ملاحظہ کیجیے کہ اولاً تو ان کا گناہ مجمل طور پر بیان کیا اور کہا: "ما فعلتم" (جو کچھ تم نے انجام دیا) اور ثانیاً انہیں عذر خواہی کا راستہ دکھایا کہ تمہارے یہ اعمال و افعال جہالت کی وجہ سے تھے اور اب جہالت کا زمانہ گزر گیا ہے اور اب تم عاقل اور سمجھدار ہو۔

ضمناً اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں انہوں نے صرف یوسفؑ پر ظلم نہیں ڈھایا تھا بلکہ بنیامین بھی اس دور میں ان کے شر سے محفوظ نہیں تھے اور انہوں نے اس کے لیے بھی اس زمانے میں مشکلات پیدا کی تھیں۔ جب بنیامین مصر میں یوسفؑ کے پاس تھے

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

شاید ان دنوں میں انہوں نے ان کی کچھ بے انصافیاں اپنے بھائی کو بتائی ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں اور یہ خیال نہ کریں کہ عزیز مصر ہم سے انتقام لینے والا ہے یوسفؑ نے اپنی گفتگو کو ایک تبسم کے ساتھ ختم کیا۔ اس تبسم کی وجہ سے بھائیوں کو حضرت یوسفؑ کے خوبصورت دانت پوری طرح نظر آگئے۔ جب انہوں نے خوب غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ دانت ان کے بھائی یوسفؑ سے عجیب مشابہت رکھتے ہیں۔[1]

اس طرح بہت سے پہلو جمع ہو گئے۔ ایک طرف تو انہوں نے دیکھا کہ عزیز مصر یوسفؑ کے بارے میں اور اس پر بھائیوں کی طرف سے کیے گئے مظالم کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جنہیں سوائے ان کے اور یوسفؑ کے کوئی نہیں جانتا تھا۔

دوسری طرف انہوں نے دیکھا کہ یعقوبؑ کے خط نے اسے اس قدر مضطرب کر دیا ہے جیسے اس کا یعقوبؑ سے کوئی بہت ہی قریبی تعلق ہو۔

تیسری طرف وہ اس کے چہرے مہرے پر جتنا غور کرتے انہیں اپنے بھائی یوسفؑ سے بہت زیادہ مشابہت دکھائی دیتی۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یوسفؑ عزیز مصر کی مسند پر پہنچ گیا ہو۔ وہ سوچتے کہ یوسفؑ کہاں اور یہ مقام کہاں؟

لہٰذا انہوں نے شک و تردد کے لہجے میں کہا: کیا تم خود یوسفؑ تو نہیں (قالوا أ انک لانت یوسف)۔

یہ موقع بھائیوں پر بہت زیادہ حساس لمحات گزرا — کیونکہ صحیح طور پر معلوم بھی نہ تھا کہ عزیز مصر ان کے سوال کے جواب میں کیا کہے گا۔ کیا سچ مچ وہ پردہ ہٹا دے گا اور اپنا تعارف کروائے گا یا انہیں دیوانہ اور بے وقوف سمجھ کر خطاب کرے گا کہ انہوں نے ایک مضحکہ خیز بات کی ہے۔

گھڑیاں بہت تیزی سے گزر رہی تھیں۔ انتظار کے روح فرسا لمحے ان کے دل کو بوجھل کر رہے تھے لیکن حضرت یوسفؑ نے نہ چاہا کہ یہ زمانہ طویل ہو جائے۔ اچانک انہوں نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا اور کہا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے" (قال انا یوسف و ھذا اخی) لیکن اس بناء پر کہ وہ خدا کی نعمت کا شکر ادا کریں کہ جس نے یہ سب نعمات عطا فرمائی تھیں اور ساتھ ہی بھائیوں کو بھی ایک عظیم درس دیں انہوں نے مزید کہا: خدا نے ہم پر احسان کیا ہے جو شخص بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرے گا خدا اسے اس کا اجر و ثواب دے گا کیونکہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا" (قد من اللہ علینا انہ من یتق ویصبر فان اللہ لایضیع اجر المحسنین)۔

کسی کو معلوم نہیں کہ ان حساس لمحات میں کیا گزری اور جب دسیوں سال بعد بھائیوں نے ایک دوسرے کو پہچانا تو کیسا شور و غوغا بپا کیا، وہ کس طرح آپس میں بغل گیر ہوئے اور کس طرح سے ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امڈ پڑے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود بھائی اپنے آپ میں شرمندہ تھے۔ وہ یوسفؑ کے چہرے کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں ان کا عظیم گناہ بخشش و عفو کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا انہوں نے بھائی کی طرف رخ کیا اور کہا: خدا کی قسم: اللہ نے تجھے ہم پر مقدم کیا ہے اور تجھے ترجیح دی ہے اور علم و حلم اور عقل و حکومت کے لحاظ سے تجھے فضیلت بخشی ہے (قالوا

---

[1] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

تاللہ لقد اٰثرک اللہ علینا)[1] یقیناً ہم خطاکار اور گناہ گار تھے (وان کنا لخٰطئین)[2]۔

لیکن یوسفؑ نہیں چاہتے تھے کہ بھائی اس طرح شرمسار رہیں خصوصاً جب کہ یہ ان کی اپنی کامیابی و کامرانی کا موقع تھا یا یہ کہ احتمالاً بھائیوں کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ یوسفؑ اس موقع پر انتقام لے گا لہٰذا فوراً یہ کہہ کر انہیں مطمئن اور پرسکون کر دیا کہ "آج تمہیں کوئی سرزنش اور توبیخ نہیں ہوگی" (قال لا تثریب علیکم الیوم)[3] یعنی تمہاری فکر آسودہ رہے اور وجدان کو راحت رہے اور گذشتہ گناہوں پر غم نہ کرو۔

اس بناء پر کہ انہیں بتایا جائے کہ انہیں نہ صرف یوسفؑ کا حق بخش دیا گیا ہے بلکہ ان کی ندامت و پشیمانی کی وجہ سے اس سلسلے میں خدائی حق بھی قابلِ بخشش ہے، مزید کہا: اللہ بھی تمہیں بخش دے گا کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے (یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین)۔

یہ حضرت یوسفؑ کی انتہائی عظمت کی دلیل ہے کہ نہ صرف اپنا حق معاف کر دیا بلکہ اس بات پر بھی تیار نہ ہوئے کہ انہیں تھوڑی سی بھی سرزنش کی جائے چہ جائیکہ بھائیوں کو کوئی سزا دیتے بلکہ حقِ الٰہی کے لحاظ سے بھی انہیں اطمینان دلایا کہ خدا غفور اور بخشنے والا ہے بلکہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے یہ استدلال پیش کیا کہ وہ ارحم الراحمین ہے۔

اس موقع پر بھائیوں کو ایک اور غم بھی ستا رہا تھا اور وہ یہ کہ باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں نابینا ہو چکا ہے اور اس کا اس طرح رہنا پورے خاندان کے لیے ایک جانکاہ رنج ہے علاوہ ازیں اُن کے جرم پر ایک مسلسل دلیل ہے۔ لہٰذا یوسفؑ نے اس عظیم مشکل کے حل کے لیے بھی فرمایا: "میرا یہ پیراہن لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تاکہ وہ بینا ہو جائے" (اذھبوا بقمیصی ھٰذا فالقوہ علی وجہ ابی یأت بصیرًا)۔ "اس کے بعد سارے خاندان کے ہمراہ میرے پاس آ جاؤ" (وأتونی باھلکم اجمعین)۔

چند اہم نکات

۱۔ یوسفؑ کی قمیض کون لے کر گیا؟ چند ایک روایات میں آیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے کہا:
میرا شفا بخش کرتہ باپ کے پاس وہی لے کر جائے جو خون آلودہ کرتہ لے کر گیا تھا تاکہ جیسے اس نے باپ کو تکلیف پہنچائی اور پریشان کیا تھا اب کے اسے خوش و خرم کرے۔
لہٰذا یہ کام "یہودا" کے سپرد ہوا کیونکہ اُس نے بتایا تھا کہ وہ میں ہوں جو خون آلود کُرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ آپ کے بیٹے کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔

---

[1] "اٰثرک" ایثار کے مادہ سے ہے.....

[2] فخر رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ "خاطی" اور "مخطی" کے درمیان یہ فرق ہے کہ "خاطی" اس شخص کو کہتے ہیں جو جان بوجھ کر بُرے کام کرے اور "مخطی" اُسے کہتے ہیں جو غلطی سے غلط کام کر بیٹھے۔

[3] "تثریب" اصل میں "ثرب" (بروزن سرد) کے مادہ سے ہے۔ "ثرب" دراصل چربی کی اس نازک اور پتلی جھلی کو کہتے ہیں جس نے معدے اور آنتوں کو چھپا رکھا ہوتا ہے اور "تثریب" اسے الگ کر دینے کے معنی میں ہے۔ بعدازاں یہ سرزنش اور ملامت کے معنی میں استعمال ہونے لگا گویا اس کام سے گناہ کا پردہ دوسرے کے چہرے سے دُور کر دیا جاتا ہے۔ (قاموس، مفردات راغب، تفسیر فخر رازی اور روح المعانی کی طرف رجوع فرمائیں)۔

Marfat.com

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت یوسفؑ اس قدر مشکلات اور مصائب میں گرفتار رہے لیکن اخلاقی مسائل کی باریکیوں سے غافل نہیں رہتے تھے۔[1]

۲۔ یوسفؑ کی عظمت: بعض دیگر روایات میں آیا ہے کہ اس ماجرے کے بعد حضرت یوسفؑ کے بھائی ہمیشہ شرمسار رہتے تھے انہوں نے کسی کو یوسفؑ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ آپ ہر صبح و شام ہمیں اپنے دستر خوان پر بٹھاتے ہیں اور آپ کا چہرہ دیکھ کر ہمیں شرم و خجالت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ہم نے آپ کے ساتھ اس قدر جسارتیں کی ہیں۔

اس بناء پر کہ انہیں نہ صرف ذرہ بھر احساس شرمندگی نہ ہو بلکہ یوسفؑ کے دستر خوان پر اپنی موجودگی کو یوسفؑ کی ایک خدمت محسوس کریں، حضرت یوسفؑ نے انہیں بہت ہی عمدہ جواب دیا۔ آپ نے کہا:

مصر کے لوگ اب تک مجھے ایک زر خرید غلام کی نظر سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے:

سبحان من بلغ عبدًا بیع بعشرین درھمًا ما بلغ

پاک ہے وہ ذات جس نے اس غلام کو کہ جو بیس درہم میں بیچا گیا اس مقام تک پہنچایا۔

لیکن اب جب کہ تم لوگ آگئے ہو اور میری زندگی کی کتاب اُن کے سامنے کھل گئی ہے تو وہ سمجھنے لگے کہ میں غلام نہیں تھا بلکہ میں خاندانِ نبوت سے تعلق رکھتا ہوں اور ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد میں سے ہوں اور یہ میرے لیے باعث افتخار ہے۔[2]

۳۔ کامیابی کا شکرانہ: مندرجہ بالا آیات میں یہ اہم اخلاقی درس اور واضح ترین اسلامی حکم موجود ہے کہ دشمن پر کامیابی کے وقت انتقام جو اور کینہ پرور نہ ہو۔

یوسفؑ کے بھائیوں نے انہیں نہایت سخت صدمے پہنچائے تھے اور انہیں موت کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا۔ اگر لطفِ الٰہی شامل حال نہ ہوتا تو بچ جانا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ صرف یہی نہیں کہ انہوں نے یوسفؑ کو تکلیف پہنچائی تھی بلکہ ان کے والد کو بھی سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اب جب کہ وہ سب کے سب زار و نزار یوسفؑ کے سامنے تھے اور یوسفؑ کے پاس پوری قدرت و طاقت بھی تھی مگر حضرت یوسفؑ کی گفتگو سے اور ان کے کلمات کے اندر جھانکنے سے اچھی طرح محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں نہ صرف یہ کہ کوئی کینہ موجود نہیں تھا بلکہ انہیں اس بات سے تکلیف ہوتی تھی کہ ان کے بھائی گزشتہ واقعے کو یاد کریں اور پریشان و غمزدہ ہوں اور شرمندگی محسوس کریں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہ احساس ان کی رُوح سے نکال دیں۔ یہاں تک کہ اس سے بھی بڑھ کر وہ چاہتے ہیں کہ انہیں یقین دلائیں کہ ان کا مصر میں آنا اس لحاظ سے باعث افتخار ہے کہ خود حضرت یوسفؑ کے بارے میں مزید آگاہی کا سبب بنا ہے اور لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ وہ خاندانِ رسالت میں سے ہیں نہ کہ ایک کنعانی غلام ہیں کہ جسے چند درہموں میں بیچا گیا ہے۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۱۸ ص ۲۰۶۔

Marfat.com

وہ چاہتے ہیں کہ بھائی اس طرح محسوس کریں کہ نہ صرف یہ کہ میں ان پر احسان نہیں کر رہا بلکہ وہ مجھ پر احسان کر رہے ہیں۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ کو ایسے ہی حالات پیش آئے اور فتح مکہ کے موقع پر آپ کو خونخوار دشمنوں یعنی شرک و بت پرستی کے سرغنوں پر کامیابی حاصل ہوئی تو ابن عباس کے بقول آپ خانہ کعبہ کے پاس تشریف لائے۔ اس وقت مخالفین کعبہ میں پناہ لے چکے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ پیغمبر اسلامؐ ان کے بارے میں کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔ ایسے میں آپؐ نے کعبہ کے کنڈے کو پکڑ کر فرمایا:

الحمد لله الذی صدق وعده ونصر عبده و هزم الاحزاب وحده

شکر ہے اس خدا کا کہ جس کا وعدہ پورا ہوا اور اس نے اپنے بندے کو کامیاب کیا اور دشمنوں کے گروہوں کو شکست دی۔

اس کے بعد آپؐ نے لوگوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا:

ماذا تظنون معشر قریش

اے قریش والو! تمہارا کیا گمان ہے کہ میں تمہارے بارے میں کیا حکم دوں گا۔

قالوا خیراً اخ کریم وابن اخ کریم و قد قدرت

انہوں نے جواب دیا: ہم تجھ سے خیر اور نیکی کے علاوہ کوئی توقع نہیں رکھتے آپ کریم و شریف بھائی ہیں اور کریم و بزرگوار بھائی کے بیٹے ہیں اور اس وقت قدرت و طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

قال وانا اقول کما قال اخی یوسف : لا تثریب علیکم الیوم

اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میں تمہارے بارے میں وہی کچھ کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کامیابی کے وقت کہا تھا — لا تثریب علیکم الیوم — یعنی — آج تمہارے لیے روز ملامت و سرزنش نہیں ہے۔

عمر کہتے ہیں:

اس موقع پر میرے چہرے پر شرم و حیا سے پسینہ آگیا کیونکہ میں نے مکہ میں داخل ہوتے وقت ان سے کہا تھا آج کے دن میں تم سے انتقام لوں گا۔ جب پیغمبرؐ نے وہ جملہ فرمایا تو مجھے اپنی گفتگو پر شرم آئی[1]

روایات اسلامی میں بھی بارہا یہ آیا ہے کہ:

کامیابی کی زکوٰۃ عفو و بخشش ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

اذا قدرت علی عدوك فاجعل العفو عنه شکراً للقدرة علیه

جس وقت تو اپنے دشمن پر کامیاب ہو جائے تو عفو و بخشش کو اپنی کامیابی کا شکرانہ قرار دے[2]

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۵ ص ۳۴۸۷

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار۔ جملہ ۱۱۔

Marfat.com

۹۴۔ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ
اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ○
۹۵۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ○
۹۶۔ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ
اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○
۹۷۔ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ○
۹۸۔ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○

ترجمہ

۹۴۔ جس وقت قافلہ (سرزمینِ مصر سے) جدا ہوا تو ان کے باپ (یعقوب) نے کہا: اگر مجھے نادانی اور کم عقلی کی نسبت نہ دو تو مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

۹۵۔ انہوں نے کہا: بخدا تو اسی گزشتہ گمراہی میں ہے۔

۹۶۔ لیکن جب بشارت دینے والا آگیا (اور اُس نے) وہ (کرتہ) اُس کے چہرے پر ڈالا تو اچانک وہ بینا ہو گیا تو اُس نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے۔

۹۷۔ انہوں نے کہا: ابا (جان)! خدا سے ہمارے گناہوں کی بخشش کی خواہش کریں، بے شک ہم خطا کار تھے۔

۹۸۔ اُس نے کہا عنقریب میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے طلبِ بخشش کروں گا۔ بے شک وہ غفور و رحیم ہے۔

Marfat.com

تفسیر

آخر کار لطفِ الٰہی اپنا کام کرے گا

فرزندانِ یعقوبؑ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ خوشی خوشی یوسفؑ کا پیراہن اپنے ساتھ لے کر قافلے کے ساتھ مصر سے چل پڑے ادھر ان بھائیوں کے لیے زندگی کے شیریں ترین لمحات تھے اُدھر شام کے علاقے کنعان میں بوڑھے باپ یعقوبؑ کا گھر غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارا گھرانہ افسردہ اور غم زدہ تھا۔

لیکن ـــ ادھر یہ قافلہ مصر سے چلا اور اُدھر اچانک یعقوبؑ کے گھر میں ایک واقعہ رونما ہوا جس نے سب کو تعجب میں ڈال دیا۔ یعقوبؑ کا جسم کانپ رہا تھا۔ انہوں نے بڑے اطمینان اور اعتماد سے پکار کر کہا: اگر تم بدگوئی نہ کرو اور میری طرف نادانی اور جھوٹ کی نسبت نہ دو تو میں تم سے کہتا ہوں کہ مجھے اپنے پیارے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ رنج وغم اور زحمت ومشکل کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں اور وصال وکامیابی کا زمانہ آنے کو ہے، خاندانِ یعقوبؑ اب لباسِ ماتم اتار دے گا اور لباسِ مسرت زیبِ تن کرے گا لیکن میرا یہ خیال نہیں کہ تم ان باتوں پر یقین کرو گے (ولما فصلت العیر قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف لولان تفندون)۔[1]

" فصلت " سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ میں یہ احساس اُسی وقت پیدا ہوا جب قافلہ مصر سے چلنے لگا۔ قاعدتاً حضرت یعقوبؑ کے پاس اُس وقت ان کے پوتے پوتیاں اور بہوئیں وغیرہ تھیں۔ انہوں نے بڑے تعجب اور گستاخی سے اور پورے یقین سے یعقوبؑ سے کہا، بخدا آپ اسی پرانی گمراہی میں ہیں (قالوا تاللہ انک لفی ضلالک القدیم) یعنی اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہوگی کہ یوسفؑ کی موت کو سالہا سال گزر گئے ہیں اور اب بھی آپ کا خیال ہے کہ وہ زندہ ہے اور اب آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مصر کی طرف سے مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے، مصر کہاں اور شام وکنعان کہاں، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ ہمیشہ خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنے خیالات وتصورات کو حقیقت سمجھتے ہیں، آپ یہ کیسی عجیب وغریب بات کہہ رہے ہیں، بہرحال آپ تو پہلے بھی اپنے بیٹوں سے کہہ چکے ہیں کہ مصر کی طرف جاؤ اور میرے یوسفؑ کو تلاش کرو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ضلالت وگمراہی سے مراد عقیدے اور نظریے کی گمراہی نہیں ہے بلکہ یوسفؑ سے متعلق مسائل کے سمجھنے میں گمراہی مراد ہے۔

بہرکیف ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس عظیم کہنہ سال اور روشن ضمیر پیغمبر سے کیسا شدید اور جسارت آمیز سلوک کرتے تھے۔

ایک جگہ انہوں نے کہا، ہمارا باپ " ضلال مبین " (کھلی گمراہی) میں ہے اور یہاں انہوں نے کہا: تم اپنی اسی دیرینہ

---

[1] "تفندون" " فند " (بروزن "نمد") کے مادہ سے فکر کی کمزوری اور حماقت کے معنی میں ہے۔ بعض اسے "جھوٹ" کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ دوام یہ فساد اور خرابی کے معنی میں ہے۔ لہٰذا "لولان تفندون" کا معنی ہے، اگر تم مجھے بے وقوف اور فاسد العقل نہ کہو۔

Marfat.com

گمراہی میں ہو۔

وہ پیرِ کنعان کے دل کی پاکیزگی اور روشنی سے بے خبر تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس کا دل بھی انہی کے دل کی طرح تاریک ہے۔انہیں یہ خیال نہ تھا کہ آئندہ کے واقعات اور دور و نزدیک کے مقامات اس کے آئینۂ دل میں منعکس ہوتے ہیں۔

کئی رات دن بیت گئے۔یعقوبؑ اسی طرح انتظار میں تھے ایسا پُر سوز انتظار کہ جس کی گہرائی میں مسرت و شادمانی اور سکون و اطمینان موجزن تھا حالانکہ ان کے پاس رہنے والوں کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یوسفؑ کا معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔

معلوم نہیں یعقوبؑ پر یہ چند دن اور راتیں کس طرح گزریں۔آخر ایک دن آیا جب آواز آئی وہ دیکھو مصر سے کنعان کا قافلہ آیا ہے۔

گزشتہ سفروں کے برخلاف فرزندانِ یعقوبؑ شاداں و فرحاں شہر میں داخل ہوئے اور بڑی تیزی سے باپ کے گھر پہنچ گئے۔سب سے پہلے "بشیر" بوڑھے یعقوبؑ کے پاس آیا (وہی "بشیر" جو وصال کی بشارت لایا تھا اور جس کے پاس یوسفؑ کا پیراہن تھا)۔اُس نے آتے ہی پیراہن یعقوبؑ کے چہرے پر ڈال دیا۔

یعقوبؑ کی آنکھیں تو بے نور تھیں۔وہ پیراہن کو دیکھ نہ سکتے تھے۔انہوں نے محسوس کیا کہ ایک آشنا خوشبو ان کی مشامِ جان میں اُتر گئی ہے۔یہ ایک پر کیف زریں لمحہ تھا۔گویا ان کے وجود کا ہر ذرہ روشن ہو گیا ہو۔آسمان و زمین مسکرا اُٹھے ہوں۔ہر طرف قہقہے بکھر گئے ہوں، نسیم رحمت چل اٹھی ہو اور غم و اندوہ کا گرد و غبار بیٹھ کرلے جا رہی ہو۔در و دیوار سے خوشی کے نعرے سنائی دے رہے تھے اور یعقوبؑ اس ساری فضا کے ساتھ تبسم کناں تھے۔ایک عجیب ہیجانی کیفیت تھی جو اس بوڑھے انسان پر طاری تھی۔اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں روشن ہو گئی ہیں اور وہ ہر جگہ دیکھ رہے ہیں۔دنیا اپنی تمام تر زیبائیوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ان کی آنکھوں کے سامنے تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جب بشارت دینے والا آیا تو اُس نے وہ (پیراہن) ان کے چہرے پر ڈال دیا تو اچانک وہ بینا ہو گئے (فلما ان جاء البشیر القاہ علیٰ وجھہ فارتد بصیرًا)۔

بھائیوں اور گرد و پیش والوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امنڈ آئے اور یعقوبؑ نے پورے اعتماد سے کہا: میں نہ کہتا تھا کہ میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے (قال الم اقل لکم انی اعلم من اللہ ما لا تعلمون)۔

اس حیران کن معجزے پر بھائی گہری فکر میں ڈوب گئے۔ایک لمحے کے لیے اپنا تاریک ماضی اُن کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، خطا، گناہ، اشتباہ اور تنگ نظری سے پُر ماضی۔

لیکن —— کتنی اچھی بات ہے کہ جب انسان اپنی غلطی کو سمجھ لے تو فوراً اس کی اصلاح اور تلافی کی فکر کرے۔فرزندانِ یعقوبؑ بھی اسی فکر میں گم ہو گئے۔انہوں نے باپ کا دامن پکڑ لیا اور کہا: بابا جان! خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے گناہوں اور خطاؤں کو بخش دے" (قالوا یا ابانا استغفر لنا ذنوبنا)۔"کیونکہ ہم گنہگار اور خطا کار تھے" (انا کنا خاطئین)۔

بزرگوار اور باعظمت بوڑھا جس کا ظرف سمندر کی طرح وسیع تھا اس نے کوئی ملامت و سرزنش کیے بغیر اُن سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد تمہارے لیے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا (قال سوف استغفر لکم ربی)۔اور مجھے اُمید ہے کہ وہ تمہاری توبہ قبول کرے گا اور تمہارے گناہوں سے صرف نظر کرے گا کیونکہ "وہ غفور و رحیم ہے" (انہ ھو الغفور الرحیم)۔

❁

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ یعقوبؑ نے پیراہن یوسفؑ کی خوشبو کیسے محسوس کی؟ یہ سوال بہت سے مفسرین نے اٹھایا ہے اور اس پر بحث کی ہے عام طور پر مفسرین نے اسے یعقوبؑ یا یوسفؑ کا معجزہ قرار دیا ہے لیکن چونکہ قرآن نے اسے اعجاز یا غیر اعجاز ہونے کے لحاظ سے پیش نہیں کیا اور اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے، اس کی سائنسی توجیہ معلوم کی جا سکتی ہے۔

موجودہ زمانے میں "ٹیلی پیتھی" ایک مسلم علمی مسئلہ ہے (اس میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے دُور رہنے والے افراد کے درمیان فکری ارتباط اور روحانی رابطہ ہو سکتا ہے۔ اسے "انتقالِ فکر" کہتے ہیں) ایسے افراد جو ایک دوسرے سے نزدیکی تعلق رکھتے ہیں یا جو بہت زیادہ روحانی طاقت رکھتے ہیں یہ تعلق ان کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ شاید ہم میں سے بہت سے افراد نے اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کا سامنا کیا ہو کہ بعض اوقات کسی کی والدہ یا بھائی اپنے اندر بلا سبب بہت زیادہ اضطراب اور پریشانی محسوس کرتے ہیں اور زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ خبر پہنچتی ہے کہ اس کے بیٹے یا بھائی کو فلاں دُور دراز علاقے میں ایک ناگوار حادثہ پیش آیا ہے۔

ماہرین اس قسم کے احساس کو ٹیلی پیتھی اور دور دراز کے علاقوں سے انتقالِ فکر کا عمل قرار دیتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے واقعے میں بھی ممکن ہے کہ آپ کی یوسفؑ سے شدید محبت اور آپ کی روحانی عظمت کے سبب آپ میں وہی احساس پیدا ہو گیا ہو جو یوسفؑ کا کرتہ اٹھاتے وقت بھائیوں میں پیدا ہوا تھا۔

البتہ یہ بات بھی ہر طرح ممکن ہے کہ اس واقعے کا تعلق انبیاء کے دائرہ علم کی وسعت سے ہو۔

بعض روایات میں بھی انتقالِ فکر کے مسئلے کی طرف جاذبِ نظر اور عمدہ اشارہ کیا گیا ہے مثلاً:

کسی نے امام باقرؑ سے عرض کیا: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں بغیر کسی مصیبت یا ناگوار حادثے کے غمگین ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ میرے گھر والے اور میرے دوست بھی اس کے اثرات میرے چہرے پر دیکھ لیتے ہیں۔

امامؑ نے فرمایا: ہاں، خدا نے مومنین کو ایک ہی بہشتی طینت سے پیدا کیا ہے اور اس کی روح ان میں پھونکی ہے لہٰذا مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں جس وقت کسی ایک شہر میں ان میں سے کسی ایک بھائی کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو باقیوں پر اس کا اثر ہوتا ہے۔[۱]

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرتہ کوئی عام کرتہ نہ تھا بلکہ ایک جنتی پیراہن تھا جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے خاندانِ یعقوبؑ میں یادگار کے طور پر چلا آ رہا تھا اور جو شخص حضرت یعقوبؑ کی طرح بہشتی قوت شامہ رکھتا تھا وہ اس کی خوشبو دُور سے محسوس کر لیتا تھا۔[۲]

۲۔ انبیاء کے حالات میں فرق: یہاں پر ایک اور مشہور اعتراض سامنے آتا ہے۔ فارسی زبان کے اشعار میں بھی یہ اعتراض بیان کیا گیا

---

[۱] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۱۶۶۔

[۲] ان روایات کے بارے میں مزید آگاہی کے لیے نور الثقلین کی دوسری جلد صفحہ ۴۶۶ کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

ہے۔ کسی نے یعقوبؑ سے کہا :

زمصرش بوی پیراہن شنیدی
چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

یعنی — آپ نے مصر سے پیراہن کی خوشبو سونگھ لی لیکن آپ کو کنعان کے کنویں میں یوسفؑ کیوں دکھائی نہ دیا ؟

کیسے ہوسکتا ہے کہ اس عظیم پیغمبر نے اتنے دُور دراز کے علاقے سے یوسفؑ کی قمیص کی خوشبو سونگھ لی جب کہ بعض نے یہ فاصلہ اسی فرسخ لکھا ہے اور بعض نے دس دن کی مسافت بیان کی ہے لیکن اپنے ہی علاقے کنعان کے اندر جب کہ یوسفؑ کو اس کے بھائی کنویں میں پھینک رہے تھے اور ان پر وہ واقعات گزر رہے تھے اس سے یعقوبؑ آگاہ نہ ہوئے ؟

قبل ازیں انبیاء اور آئمہ کے علم غیب کی حدود کے بارے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب ہرگز مشکل نہیں رہتا ۔ امورِ غیب کے متعلق ان کا علم پروردگار کے ارادے اور عطا کیے ہوئے علم پر منحصر ہے ۔ جہاں خدا چاہتا ہے وہ جانتے ہیں چاہے واقعے کا تعلق کسی بہت دُور دراز علاقے سے ہو اور جہاں وہ نہ چاہے نہیں جانتے چاہے معاملہ کسی نزدیک ترین علاقے سے مربوط ہو ۔ جیسے کسی تاریک رات میں ایک قافلہ کسی بیابان سے گزر رہا ہو ۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہو ۔ ایک لمحے کے لیے آسمان پر بجلی چمک اُٹھے اور بیابان کی تمام گیرائیاں اور گہرائیاں روشن ہو جائیں اور تمام مسافر ہر طرف سب کچھ دیکھ لیں لیکن دوسرے لمحے وہ بجلی خاموش ہو جائے اور پھر تاریکی ہر طرف چھا جائے اس طرح سے کہ کوئی چیز نظر نہ آئے ۔

شاید امام جعفر صادق علیہ السلام سے علم امام کے بارے میں مروی یہ حدیث اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے ، آپؑ فرماتے ہیں :

جعل اللہ بینہ وبین الامام عموداً من نور ینظر اللہ بہ الی الامام وینظر الامام بہ الیہ فاذا اراد علم شئ نظر فی ذٰلک النور فعرفہ

خدا نے اپنے اور امام و پیشوائے خلق کے درمیان نور کا ایک ستون بنایا ہے ۔ اسی سے خدا امام کی طرف دیکھتا ہے اور امام بھی اسی طریق سے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتا ہے اور جب امام کوئی چیز جاننا چاہتا ہے تو نور کے اس ستون میں دیکھتا ہے اور اس سے آگاہ ہو جاتا ہے [1]

ایک شعر جو پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد سعدی کے مشہور اشعار میں ایسی ہی روایات کے پیش نظر کہا گیا ہے :

بگفت احوال ما برق جہان است
گہی پیدا و دیگر دم نہان است
گہی بر طارم اعلا نشینیم
گہی تا پشت پای خود نبینیم

یعنی — اس نے کہا ہمارے حالات چمکنے والی بجلی کی طرح ہیں جو کبھی دکھائی دیتی ہے اور کبھی چھپ جاتی ہے ۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ از خوئی جلد ۵ صفحہ ۲۰۰ ۔

Marfat.com

کبھی ہم آسمان کی بلندیوں پر بیٹھتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کے پیچھے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

"جہان" یہاں "جہندہ" یعنی "چمکنے والی" کے معنی میں ہے اور "برق جہان" کا معنی ہے چمکنے والی آسمانی بجلی۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے تعجب کا مقام نہیں کہ ایک دن مشیت الٰہی کی بناء پر یعقوبؑ کی آزمائش کے لیے وہ اپنے قریب رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ نہ ہوں اور کسی دوسرے دن جب کہ دور آزمائش ختم ہو چکا تھا اور مشکلات کے دن بیت چکے تھے انہوں نے مصر سے قمیص یوسفؑ کی مہک سونگھ لی ہو۔

۳۔ بینائی کیسے لوٹ آئی؟ بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کا نور بالکل ضائع نہیں ہو گیا تھا بلکہ ان کی آنکھیں کمزور ہو گئی تھیں اور بیٹے کی ملاقات کے امکانات پیدا ہوئے تو ان میں ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ وہ پہلی حالت پر واپس آگئیں لیکن آیات کا ظہور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بالکل نابینا ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں سفید ہو چکی تھیں لہٰذا ان کی بینائی معجزانہ طور پر واپس آئی۔ قرآن کہتا ہے:

فارتد بصیرا

بینائی کی طرف لوٹ آیا۔

۴۔ استغفار کا وعدہ: مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ بھائیوں کے اظہار ندامت پر حضرت یوسفؑ نے کہا:

یغفر اللہ لکم

خدا تمہیں بخش دے گا۔

لیکن جب انہوں نے حضرت یعقوبؑ کے سامنے اعتراف گناہ اور اظہار ندامت کیا اور استغفار کا تقاضا کیا تو انہوں نے کہا:

میں بعد میں تمہارے لیے استغفار کروں گا۔

جیسا کہ روایات میں آیا ہے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس تقاضا پر شب جمعہ وقت سحر عمل کریں جو کہ اجابت دعا اور توبہ کی قبولیت کے لیے مناسب وقت ہے[1]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یوسفؑ نے انہیں کس طرح قطعی جواب دے دیا جب کہ ان کے باپ نے آئندہ پر چھوڑ دیا؟ ہو سکتا ہے یہ فرق اس بناء پر ہو کہ حضرت یوسفؑ بخشش کے امکان کے بارے میں بات کر رہے ہوں یعنی یہ گناہ قابل بخشش ہے لیکن حضرت یعقوبؑ اس کی فعلیت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں یعنی کیا کیا جائے کہ جس سے بخشش ہو جائے (غور کیجئے گا)۔

۵۔ توسل جائز ہے: مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے استغفار کا تقاضا کرنا نہ صرف یہ کہ عقیدۂ توحید کے منافی نہیں ہے بلکہ لطف الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے ورنہ کیسے ممکن تھا کہ یعقوبؑ کہ جو نبی تھے بیٹوں کا یہ تقاضا قبول کرتے کہ ان کے لیے استغفار کی جائے اور کیسے ممکن تھا کہ ان کے توسل کا مثبت جواب دیتے۔

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ اولیاء اللہ سے توسل اجمالاً ایک جائز امر ہے اور جو اسے ممنوع اور اصل توحید کے خلاف سمجھتے ہیں وہ

---

[1] تفسیر قرطبی میں ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ شب جمعہ کہ جو روز عاشورہ کے برابر تھی ان کے لیے استغفار کریں (تفسیر قرطبی۔ جلد ۶ ص ۳۴۹)

Marfat.com

متونِ قرآن سے آگاہی نہیں رکھتے یا پھر غلط تعصبات نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

۶۔ **سیاہ رات چھٹ گئی:** مندرجہ بالا آیات ہمیں یہ عظیم درس دیتی ہیں کہ مشکلات و حوادث جتنے بھی سخت اور دردناک ہوں اور ظاہری اسباب و علل جتنے بھی محدود اور نارسا ہوں اور کامیابی و کشائش میں کتنی ہی تاخیر ہو جائے ان میں سے کوئی چیز بھی لطفِ پروردگار پر اُمید رکھنے سے مانع نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ وہی خدا ہے جو نابینا آنکھ کو پیراہن کے ذریعے روشن کر دیتا ہے اور پیراہن کی خوشبو دور کے فاصلے سے دیگر علاقوں کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور گمشدہ عزیز اور محبوب کو سالہا سال بعد لوٹا دیتا ہے اور جدائی سے مجروح دلوں پر مرہم رکھتا ہے اور جانکاہ تکالیف کو شفا بخشتا ہے۔

جی ہاں اس سرگزشت میں توحید اور خداشناسی کا یہ عظیم درس پوشیدہ ہے کہ کوئی چیز بھی خدا کے ارادے کے سامنے پیچیدہ نہیں ہے۔

Marfat.com

۹۹۔ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا
مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۝

۱۰۰۔ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا
تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ
بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ
اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝

۱۰۱۔ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ
فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ
تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ

۹۹۔ جس وقت یوسف کے پاس پہنچے تو وہ اپنے ماں باپ سے بغل گیر ہوئے اور کہا: سب کے سب مصر میں داخل ہو جاؤ، انشاء اللہ امن و امان میں رہو گے۔

۱۰۰۔ اور ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب کے سب اُس کے لیے سجدے میں گر گئے اور اُس نے کہا: ابا جان: یہ اس خواب کی تعبیر ہے کہ جو پہلے میں نے دیکھا تھا، خدا نے اسے حقیقت میں بدل دیا اور اس نے مجھ سے نیکی کی جب کہ مجھے زندان سے نکالا اور آپ کو اُس بیابان سے (یہاں) لے آیا اور جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان خرابی پیدا کر چکا تھا، اور میرا پروردگار جسے چاہتا ہے اور مناسب دیکھتا ہے) اس کے لیے صاحب لطف ہے کیونکہ وہ دانا اور حکیم ہے۔

۱۰۱۔ پروردگارا! تو نے مجھے حکومت کا (عظیم) حصہ بخشا ہے اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دیا ہے تو آسمانوں اور

Marfat.com

زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور تو دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے، مجھے مسلمان مارنا اور صالحین کے ساتھ ملحق فرمانا۔

تفسیر

یوسفؑ، یعقوبؑ اور بھائیوں کی سرگزشت کا اختتام

عظیم ترین بشارت لیے ہوئے مصر سے قافلہ کنعان پہنچا۔ بوڑھے یعقوبؑ بینا ہو گئے۔ عجیب جوش و خروش تھا۔ سالہا سال سے جو گھرانا غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا وہ خوشی اور سرور میں ڈوب گیا۔ ان سب نعمات الٰہی پر وہ پھولے نہیں سماتے تھے۔ یوسفؑ کی فرمائش کے مطابق اس خاندان کو اب مصر کی طرف روانہ ہونا تھا۔ سفر کی تیاری ہر لحاظ سے مکمل ہو گئی۔ یعقوبؑ ایک مرکب پر سوار ہوئے جب کہ ان کے مبارک لبوں پر ذکر و شکرِ خدا جاری تھا اور عشقِ وصال نے انہیں اس طرح سے قوت و توانائی بخشی تھی کہ گویا وہ نئے سرے سے جوان ہو گئے تھے۔

بھائیوں کے گزشتہ سفر تو خوف و پریشانی سے گزرے لیکن ان کے برخلاف یہ سفر ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے خالی تھا۔ یہاں تک کہ اگر سفر کی کوئی تکلیف تھی بھی تو اس انتظار میں پنہاں مقصد کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

وصال کعبہ چناں می دواندم بشتاب
کہ خار ہای مغیلاں حریر می آید

کعبۂ مقصود کے وصال نے مجھے اتنا تیز دوڑایا کہ خار مغیلاں ریشم معلوم ہوتے تھے۔

رات اور دن گویا بڑی آہستگی سے گزر رہے تھے کیونکہ اشتیاقِ وصال میں ہر گھڑی ایک دن بلکہ ایک سال معلوم ہو رہی تھی مگر جو کچھ بھی تھا آخر گزر گیا۔ مصر کی آبادیاں دور سے نمایاں ہوئیں۔ مصر کے سرسبز کھیت، آسمان سے باتیں کرنے والے درخت اور خوبصورت عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔

لیکن —— قرآن اپنی دائمی سیرت کے مطابق ان سب مقدمات کو کہ جو تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتے ہیں حذف کرتے ہوئے کہتا ہے، جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف اپنے ماں باپ سے بغل گیر ہوئے (فلما دخلوا علی یوسف أویٰ الیہ ابویہ)

"أوی" جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے اصل میں کسی چیز کو دوسری چیز سے منضم کرنے کے معنی میں ہے اور یوسفؑ کا اپنے تئیں اپنے ماں باپ سے منضم کرنا، ان سے بغل گیر ہونے کے لیے کنایہ ہے۔

آخر کار یعقوبؑ کی زندگی کا شیریں ترین لمحہ آ گیا۔ دیدار و وصال کا یہ لمحہ فراق کے کئی سالوں بعد آیا تھا۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وصال کے یہ لمحات یعقوبؑ اور یوسفؑ پر کیسے گزرے، ان شیریں لمحات میں ان دونوں کے احساسات و جذبات کیا تھے، عالمِ شوق میں انہوں نے کتنے آنسو بہائے اور عالمِ عشق میں کیا نالہ و فریاد ہوا۔

Marfat.com

پھر یوسفؑ نے سب سے کہا: سرزمینِ مصر میں قدم رکھیں کہ انشاء اللہ یہاں آپ بالکل امن و امان میں ہوں گے" کیونکہ مصر یوسفؑ کی حکومت میں امن و امان کا گہوارہ بن چکا تھا (وقال ادخلوا مصر ان شاء اللہ اٰمنین)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسفؑ اپنے ماں باپ کے استقبال کے لیے شہر کے دروازے کے باہر تک آئے تھے اور شاید جملہ "دخلوا علی یوسف" کہ جو دروازے سے باہر سے مربوط ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ یوسفؑ نے حکم دیا تھا کہ وہاں خیمے نصب کیے جائیں اور ماں باپ اور بھائیوں کی پہلے پہل وہاں پذیرائی کی جائے۔

جب وہ بارگاہِ یوسفؑ میں پہنچے "تو اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا" (ورفع ابویه علی العرش)۔

نعمتِ الٰہی کی اس عظمت اور پروردگار کے لطف کی اس گہرائی اور وسعت نے بھائیوں اور ماں باپ کو اتنا متاثر کیا کہ "وہ سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر گئے" (وخروا له سجدًا)۔

اس موقع پر یوسفؑ نے باپ کی طرف رُخ کیا "اور عرض کیا: ابا جان! یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا" (وقال یا ابت هذا تأویل رءیای من قبل) "کیا ایسا ہی نہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ سورج، چاند اور گیارہ ستارے میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ دیکھئے! جیسا کہ آپ نے پیش گوئی کی تھی "خدا نے اس خواب کو واقعیت میں بدل دیا ہے" (قد جعلها ربی حقًّا) "اور پروردگار نے مجھ پر لطف و احسان کیا ہے کہ اس نے مجھے زندان سے نکالا ہے" (وقد احسن بی اذ اخرجنی من السجن)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی زندگی کی مشکلات میں صرف زندانِ مصر کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن بھائیوں کی وجہ سے کنعان کے کنوئیں کی بات نہیں کی۔

اس کے بعد مزید کہا: خدا نے مجھ پر کس قدر لطف کیا کہ آپ کو کنعان کے اُس بیابان سے یہاں لے آیا جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد انگیزی کر چکا تھا (وجاء بکم من البدو من بعد ان نزغ الشیطان بینی وبین اخوتی)۔

یہاں یوسفؑ ایک مرتبہ پھر اپنی وسعتِ قلبی اور عظمت کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ کوتاہی کس شخص نے کی ہے، سربستہ اور اجمالی طور پر کہتے ہیں کہ شیطان نے اس کام میں دخل اندازی کی اور وہ فساد کا باعث بنا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بھائیوں کی گزشتہ خطاؤں کا گلہ کریں۔

سرزمینِ کنعان کو "بدو" یعنی "بیابان" کہنا بھی جاذبِ نظر ہے۔ اس طرح سے مصر اور کنعان کا تمدنی فرق واضح کیا گیا ہے۔

آخر میں یوسفؑ کہتے ہیں: یہ سب نعمات و عنایات خدا کی طرف سے ہیں کیونکہ میرا پروردگار مرکزِ لطف و کرم ہے اور جس امر میں چاہتا ہے لطف کرتا ہے، وہ بندوں کے کاموں کی تدبیر کرتا ہے اور اُن کی مشکلات کو آسان کرتا ہے (ان ربی لطیف لما یشاء)۔

وہ جانتا ہے کہ کون حاجت مند ہیں اور کون اہل ہیں کیونکہ "وہ علیم و حکیم ہے" (انه هو العلیم الحکیم)۔

اس کے بعد یوسفؑ حقیقی مالک الملک اور دائمی ولیٔ نعمت کی طرف رُخ کرتے ہیں اور شکر اور تقاضے کے طور پر کہتے ہیں: "پروردگارا! تو نے ایک وسیع حکومت کا ایک حصہ مجھے مرحمت فرمایا ہے" (رب قد اٰتیتنی من الملک) "اور تو نے مجھے تعبیرِ خواب کے علم کی تعلیم دی ہے" (وعلمتنی من تأویل الاحادیث) "اور اسی علم نے جو ظاہراً سادہ اور عام ہے میری زندگی

Marfat.com

اور تیرے بندوں کی ایک بڑی جماعت کی زندگی میں کس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا ہے اور یہ علم کس قدر پُر برکت ہے۔
"تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ایجاد کیا ہے" (فاطر السموات والارض)۔ اور اسی بناء پر تمام چیزیں تیری قدرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں "پروردگارا! دنیا و آخرت میں تو میرا ولی، ناصر، مدبر اور محافظ ہے" (انت ولی فی الدنیا و الاٰخرۃ)۔ "مجھے اس جہان سے مسلمان اور اپنے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے لے جا" (توفنی مسلماً) "اور مجھے صالحین سے ملحق کر دے" (والحقنی بالصالحین)۔
یعنی — میں تجھ سے ملک کے دوام اور اپنی مادی حکومت اور زندگی کی بقاء کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ یہ تو سب فانی ہیں اور صرف دیکھنے میں دل انگیز ہیں بلکہ میں تجھ سے یہ چاہتا ہوں کہ میری عاقبت اور انجام کار بخیر ہو اور میں تیری راہ میں ایمان و تسلیم کے ساتھ رہوں اور تیرے لیے جان دوں اور صالحین اور تیرے باخلوص دوستوں کی صف میں قرار پاؤں، میرے لیے یہ چیزیں اہم ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا غیر خدا کے لیے سجدہ جائز ہے؟ جیسا کہ ہم پہلی جلد[۱] میں فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرنے کی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ پرستش و عبادت کے معنی میں سجدہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی مذہب میں کسی شخص کے لیے پرستش جائز نہیں ہے اور توحید عبادت جو مسئلہ توحید کا اہم حصہ ہے اور جس کی تمام پیغمبروں نے دعوت دی ہے، کا یہی مفہوم ہے۔
لہٰذا یوسفؑ جو کہ خدا کے پیغمبر تھے نہ وہ اس کی اجازت دے سکتے تھے کہ انہیں سجدہ کیا جائے اور ان کی عبادت کی جائے اور نہ ہی یعقوبؑ جیسے عظیم پیغمبر ایسا کام کر سکتے تھے اور نہ ہی قرآن اسے ایک اچھے یا کم از کم جائز و مباح کام کے طور پر یاد کر سکتا تھا۔
اس بناء پر مذکورہ سجدہ یا خدا کے لیے "سجدۂ شکر" کے طور پر تھا — اسی خدا کے لیے سجدۂ شکر جس نے یہ تمام عنایات و نعمات اور مقامِ عظیم یوسفؑ کو دیا تھا اور جس نے خاندانِ یعقوبؑ کی مشکلوں اور مصیبتوں کو دُور کیا تھا۔ اس صورت میں اگرچہ یہ سجدہ خدا کے لیے تھا لیکن چونکہ یوسفؑ کو عطا کی گئی نعمت کی عظمت کے لیے تھا خود یوسفؑ کا احترام بھی اس سے ظاہر ہوتا تھا اور اس لحاظ سے "لَہٗ" کی ضمیر جو مسلماً یوسفؑ کی طرف لوٹتی ہے اس معنی کے ساتھ پوری طرح مناسب ہو گی۔
یا یہ کہ یہاں "سجدہ" کا وسیع مفہوم مراد ہے یعنی خضوع اور انکساری کیونکہ سجدہ ہمیشہ اپنے مشہور معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ہر قسم کی انکساری اور تواضع کے معنی میں بھی کبھی کبھی استعمال ہو جاتا ہے لہٰذا بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس زمانے میں خم ہو کر انکساری اور تواضع کا اظہار کرتے تھے اور تعظیم و احترام بجا لانے کا یہ طریقہ رائج تھا۔ ان مفسرین کے نزدیک مندرجہ بالا آیت میں "سجداً" سے یہی مراد ہے۔
لیکن "خروا" کا مفہوم ہے "زمین پر گرنا"۔ اس لفظ کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سجدہ خم ہونے اور سر نیچا کرنے کے معنی میں نہیں تھا۔
بعض دیگر عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یعقوبؑ، بھائیوں اور ان کی والدہ کا سجدہ خدا کے لیے تھا لیکن یوسفؑ خانۂ کعبہ

۱۔ جلد اول ص۱۶۱ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

کی طرح ان کے قبلہ تھے۔ اسی لیے عربوں کی تعبیرات میں بعض اوقات کہا جاتا ہے:

فلان صلی للقبلۃ

یعنی — فلاں شخص نے قبلہ کی طرف نماز پڑھی [1]

البتہ پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے بالخصوص جب کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس سلسلے میں متعدد روایات بھی موجود ہیں۔ فرمایا:

کان سجودھم للّٰہ

یعنی — ان کا سجدہ خدا کے لیے تھا۔

یہ بھی الفاظ ہیں:

کان سجودھم عبادۃ للّٰہ

ان کا سجدہ اللہ کی عبادت کے طور پر تھا [2]

نیز کچھ اور احادیث میں ہے:

کان طاعۃ للّٰہ و تحیۃ لیوسف

یہ سجدہ اللہ کی اطاعت کے عنوان سے اور یوسف کے احترام کے لیے تھا [3]

جیسا کہ حضرت آدم کے واقعہ میں بھی سجدہ اس خدائے بزرگ و برتر کے لیے تھا کہ جس نے ایسی بدیع اور عجیب و غریب مخلوق پیدا کی تھی۔ وہ سجدہ عبادتِ خدا کے ساتھ ساتھ حضرت آدمؑ کے احترام اور عظمتِ مقام کی دلیل بھی تھا۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ ایک شخص کوئی بہت ہی اچھا اور اہم کام انجام دیتا ہے اور ہم اس کام کی بناء پر خدا کے لیے سجدہ کریں کہ جس نے ایسا بندہ پیدا کیا ہے تو یہ سجدہ خدا کے لیے بھی ہے اور اس شخص کے احترام کے لیے بھی۔

۲۔ شیطانی وسوسے: جملہ "نزغ الشیطٰن بینی و بین اخوتی" میں لفظ "نزغ" کسی کام میں فساد و افساد کے ارادہ سے داخل ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایسے معاملات میں شیطانی وسوسے ہمیشہ بہت اثر رکھتے ہیں۔ لیکن ہم اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں صرف اس قسم کے وسوسوں سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اٹل فیصلہ اور آخری مصمم ارادہ خود انسان کو کرنا ہوتا ہے بلکہ وہی اپنے دل کا دریچہ شیطان کے لیے کھولتا ہے اور اسے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت سے اختیار و ارادہ کی آزادی کے برخلاف کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔

البتہ حضرت یوسفؑ اپنی عظمت و بزرگواری، وسعتِ ظرف اور کشادہ دلی کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ بھائیوں کو اس معاملے

---

[1] تفسیر المیزان و تفسیر فخر رازی — زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۶۷۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۶۸۔

Marfat.com

میں زیادہ شرمندہ کریں کہ جو خود ہی بہت شرمندہ تھے۔ اس لیے آخری ارادہ کرنے والے کی طرف اشارہ نہیں کیا اور صرف شیطانی وسوسوں کا ذکر کیا ہے جو کہ دوسرے درجے کے عامل ہیں۔

۳۔ امن و امان ـــ خدا کی عظیم نعمت: حضرت یوسفؑ نے مصر کی تمام تر نعمات میں سے صرف امن و امان کا ذکر کیا ہے اور ماں باپ اور بھائیوں سے کہا کہ مصر میں داخل ہو جاؤ انشاء اللہ امن و امان میں رہو گے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ امن و امان کی نعمت تمام نعمتوں کی جڑ ہے اور حقیقت میں ایسا ہی ہے کیونکہ جب امن و امان ختم ہو جائے تو تمام رفاہی امور اور مادی و روحانی نعمتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ بے امنی کے ماحول میں نہ اطاعتِ خدا مقدور رہتی ہے اور نہ زندگی میں سربلندی اور آسودگیٔ فکر باقی رہتی ہے اور نہ ہی سعی و کوشش اور اجتماعی مقاصد کی پیش رفت کے لیے جہاد ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے یہ جملہ ضمناً اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ یوسفؑ چاہتے ہیں کہ یہ بتائیں کہ مصر میری حکومت و سلطنت میں کل کے فراعنہ کی سی سرزمین نہیں ہے۔ وہ خود غرضیاں، خود پرستیاں، مظالم، لوٹ مار، گھٹن اور شکنجے سب کے سب ختم ہو گئے ہیں۔ ایک مکمل امن و امان کا ماحول ہے۔

۴۔ مقامِ علم کی اہمیت: حضرت یوسفؑ آخر میں ایک مرتبہ پھر علم تعبیر خواب کا ذکر کرتے ہیں اور اس عظیم اور بغیر نزاع کے حکومت کی بنیاد اس ظاہراً آسان اور سادہ علم کو قرار دیتے ہیں۔ یہ امر دراصل علم و دانش کی اہمیت و تاثیر پر زیادہ سے زیادہ تاکید کرنے کے لیے ہے۔ چاہے وہ علم سادہ اور عام قسم کا ہی کیوں نہ ہو ـــ لہٰذا کہتے ہیں:

رب قد اٰتیتنی من الملک و علمتنی من تأویل الاحادیث

۵۔ اختتام خیر: ہو سکتا ہے انسان کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن مسلم ہے کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات اس کی ساری زندگی اور سرنوشت سے زیادہ اصلاحی اور تعمیری ہیں کیونکہ عمر کا دفتر ان کے ساتھ بند ہو جاتا ہے اور آخری فیصلہ زندگی کے انہی آخری صفحات سے وابستہ ہے۔ اسی لیے صاحبِ ایمان اور سمجھدار لوگ ہمیشہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی عمر کے یہ لحظے نورانی اور درخشاں ہوں۔ یوسفؑ بھی اس مقام پر خدا سے یہی چاہتے ہیں اور کہتے ہیں:

توفنی مسلمًا و الحقنی بالصالحین

مجھے دنیا سے ایمان کے ساتھ لے جا اور میرا شمار صالحین کے زمرے میں کر۔

یہ گفتگو خدا سے موت کا تقاضا کرنے کے لیے نہیں جیسا کہ ابن عباس نے گمان کیا ہے اور کہا ہے:

یوسفؑ کے سوا کسی پیغمبر نے خدا سے موت کا تقاضا نہیں کیا۔ ان کے پاس اپنی حکومت کے تمام اسباب و وسائل موجود تھے لیکن ان کی روح میں عشقِ الٰہی کا شعلہ بھڑک اٹھا اور انہوں نے لقائے الٰہی کی آرزو کی۔

لیکن ـــ یوسفؑ کا تقاضا شرط اور حالت کا تقاضا تھا یعنی انہوں نے یہ تقاضا کیا تھا کہ موت کے وقت وہ ایمان و اسلام کے حامل ہوں جیسا کہ ابراہیمؑ اور یعقوبؑ نے بھی اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی۔

فلا تموتن الا و انتم مسلمون

میرے بچو! کوشش کرو کہ دنیا سے جاتے وقت باایمان اور فرمانِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہو (بقرہ - ۱۳۲)۔

Marfat.com

بہت سے مفسرین نے بھی یہی معنی انتخاب کیا ہے۔

۶۔ کیا یوسفؑ کی والدہ مصر آئی تھیں؟ مندرجہ بالا آیات کے ظاہری معنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی والدہ اس وقت زندہ وسلامت تھیں اور وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کے ساتھ مصر آئی تھیں اور اس نعمت کے شکرانے کے طور پر انہوں نے بھی سجدہ کیا تھا لیکن بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ ان کی والدہ "راحیل" فوت ہو چکی تھیں اور یہ حضرت یوسفؑ کی خالہ تھیں جو مصر آئی تھیں اور وہ ماں کی جگہ شمار ہوتی تھیں

موجودہ تورات کے سفر تکوین کی فصل ۳۵ اور جملہ ۱۸ میں ہے:

بنیامین کے پیدا ہونے کے بعد راحیل فوت ہوگئیں۔

بعض روایات جو وہب بن منبہ اور کعب الاحبار سے نقل ہوئی ہیں ان میں بھی یہی بات مذکور ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے انہوں نے یہ بات تورات سے لی ہے۔

بہرحال ہم قرآن کے ظاہری مفہوم سے بغیر کسی یقینی مدرک کے آنکھیں بند کرکے اس کی توجیہ و تاویل نہیں کر سکتے اور ظاہر قرآن یہی ہے کہ اس وقت یوسفؑ کی ماں زندہ تھیں۔

۷۔ باپ کو سرگزشت نہ سنانا: امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

جس وقت یعقوبؑ یوسفؑ سے ملاقات کے لیے پہنچے تو ان سے کہا: میرے بیٹے میرا دل چاہتا ہے کہ میں پوری تفصیل جانوں کہ بھائیوں نے تم سے کیا سلوک کیا۔

حضرت یوسفؑ نے باپ سے تقاضا کیا کہ وہ اس معاملے کو جانے دیں لیکن یعقوبؑ نے انہیں قسم دے کر کہا کہ بیان کریں۔ یوسفؑ نے واقعات کا کچھ حصہ بیان کیا، یہاں تک کہ بتایا: بھائیوں نے مجھے پکڑ لیا اور کنویں میں بٹھایا۔ مجھے حکم دیا کہ کرتا اُتاروں تو میں نے ان سے کہا: میں تمہیں اپنے باپ یعقوبؑ کے احترام کی قسم دیتا ہوں کہ میرے بدن سے کرتا نہ اُتارو اور مجھے برہنہ نہ کرو۔ ان میں سے ایک کے پاس چھری تھی اس نے وہ چھری نکالی اور چلا کر کہا: کرتا اتارو۔

یہ جملہ سنتے ہی یعقوبؑ کی طاقت جواب دے گئی، انہوں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو بیٹے سے چاہا کہ اپنی بات جاری رکھے لیکن یوسفؑ نے کہا: آپ کو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا کی قسم مجھے اس کام سے معاف رکھیں۔

جب یعقوبؑ نے یہ جملہ سُنا تو اس معاملے سے صرفِ نظر کر لیا[1]

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یوسفؑ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ماضی کے تلخ واقعات اپنے دل میں لائیں یا باپ کے سامنے انہیں دھرائیں اگرچہ حضرت یعقوبؑ کی جستجو کی حس انہیں مجبور کرتی تھی۔

❖

---

[1] مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۲۶۵۔

Marfat.com

۱۰۲۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ○

۱۰۳۔ وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ○

۱۰۴۔ وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ ع

۱۰۵۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○

۱۰۶۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ○

۱۰۷۔ اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۲۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے کہ جس کی ہم تجھے وحی کرتے ہیں تو (ہرگز) ان کے پاس نہیں تھا جب انہوں نے مصمم ارادہ کیا اور جب وہ منصوبہ بنا رہے تھے۔

۱۰۳۔ اور اگرچہ تو اصرار کرے زیادہ تر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

۱۰۴۔ اور تو اس پر (ہرگز) ان سے اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا، یہ نہیں ہے مگر یہ کہ عالمین کے لیے یاد دھانی۔

۱۰۵۔ اور (خدا کی) بہت سی نشانیاں آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں کہ وہ جن کے پاس سے گزرتے ہیں اور ان سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

۱۰۶۔ اور ان میں کہ جو خدا پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اکثر مشرک ہیں۔

۱۰۷۔ کیا وہ اس سے مامون ہیں کہ خدا کی طرف سے گھیرنے والا عذاب ان پر آجائے یا قیامت کی گھڑی اچانک

Marfat.com

ان پر آجائے جب کہ وہ متوجہ نہ ہوں۔

تفسیر

یہ دعویدار عام طور پر مشرک ہیں

حضرت یوسفؑ کا واقعہ تمام ہوا۔ اس میں عبرت اور اصلاح کے بہت سے درس موجود ہیں۔ اس میں گرانبہا قیمتی اور ثمر بخش نکات موجود ہیں اور یہ تاریخی واقعہ ہر قسم کی فضولیات اور خرافات سے پاک کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ اب قرآن روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں (ذلك من انباء الغيب نوحيه اليك) تو ہرگز ان کے پاس نہیں تھا جب کہ وہ مصمم ارادہ کر رہے تھے اور منصوبہ بنا رہے تھے (وما كنت لديهم اذ اجمعوا امرهم وهم يمكرون) ان باریکیوں اور تفصیلات کو صرف خدا جانتا ہے یا وہ شخص جو اس موقع پر موجود تھا اور چونکہ تو وہاں موجود نہیں تھا لہٰذا صرف وحی الٰہی ہے جو ایسی خبریں تجھ تک پہنچاتی ہے۔

یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا واقعہ اگرچہ تورات میں آیا ہے اور قاعدتاً حجاز والے اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتے تھے پھر بھی پوری تفصیلات کے ساتھ تمام واقعہ حتیٰ کہ جو کچھ خصوصی مجالس میں ہوا تھا لوگوں کو اس طرح سے معلوم نہیں تھا کہ جس میں کوئی اضافہ نہ کیا گیا ہو اور خرافات شامل نہ کی گئی ہوں۔

ان حالات میں لوگوں کو چاہیے کہ ان سب نشانیوں کو دیکھنے کے بعد اور ان خدائی نصیحتوں کو سننے کے بعد ایمان لے آئیں اور غلط راستے سے پلٹ آئیں مگر اے پیغمبر! اگرچہ تو اس پر اصرار کرے کہ یہ ایمان لے آئیں ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے (وما اكثر الناس ولو حرصت بمؤمنين)۔

لفظ "حرص" لوگوں کے ایمان لانے کے لیے پیغمبرؐ کے شدید لگاؤ اور شوق کی دلیل ہے لیکن صرف آپؐ کا شوق اور حرص کافی نہ تھا۔ زمینوں اور ظرفوں کی قابلیت بھی شرط تھی۔

یعقوبؑ کے بیٹے کہ جو وحی و نبوت کے ماحول میں پلے بڑھے تھے جب وہ ہوا و ہوس میں گرفتار ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اپنے بھائی کو نابود کرنے پر تُل سکتے ہیں تو پھر دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ہوا و ہوس کے دیو اور شہوت کے بھوت پر غالب آجائیں اور سب کے سب ایک ہی دفعہ پوری طرح خدا کی طرف رُخ کریں۔

یہ جملہ ضمنی طور پر پیغمبرؐ کی ایک طرح سے تسلی اور دلجوئی کے لیے ہے کہ وہ لوگوں کے کفر و گناہ پر اصرار سے ہرگز مایوس نہ ہو جائیں اور اس راہ میں ہم سفروں کی کمی سے ملولِ خاطر نہ ہوں، جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات میں بھی ہے مثلاً:

فلعلك باخع نفسك على آثارهم ان لم يؤمنوا بهذا الحديث اسفا

اے پیغمبر! گویا تو چاہتا ہے کہ قرآن پر ان کے ایمان نہ لانے پر شدت تاسف سے اپنی جان گنوا بیٹھے (کہف - ۶)

Marfat.com

قرآن مزید کہتا ہے کہ دراصل تیری دعوت کو قبول نہ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی عذر و بہانہ نہیں ہے کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس میں حق کی نشانیاں واضح ہیں "تو نے اس کے بدلے ان سے ہرگز کوئی اجر اور مزدوری نہیں چاہی" کہ جسے وہ مخالفت کا بہانہ بنا سکیں (وما تسئلھم علیہ من اجر) ۔

"یہ ایک عمومی دعوت ہے اور سب جہانوں کے لیے اور عالمین کے لیے ایک یاددھانی ہے" اور یہ عام و خاص تمام انسانوں کے لیے بچھایا گیا ایک دسترخوان ہے (ان ھو الا ذکر للعالمین) ۔

وہ دراصل اس لیے گمراہ ہوئے کہ ان کے پاس کھلی اور بینا آنکھ اور سننے والے کان نہیں ہیں لہٰذا "آسمان و زمین میں بہت سی خدائی آیات ہیں کہ وہ جن کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور ان سے منہ پھیر لیتے ہیں"۱ و کاین من اٰیۃ فی السمٰوٰت والارض یمرون علیھا وھم عنھا معرضون) ۔

یہی حوادث کہ جنہیں ہر روز وہ اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں ۔ صبح کے وقت آفتاب افقِ مشرق سے سر نکالتا ہے ۔ اس کی سنہری کرنیں پہاڑوں، دروں، صحراؤں اور دریاؤں پر پڑتی ہیں اور شام کے وقت افقِ مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور رات کی گہری سیاہ چادر ہر جگہ کو ڈھانپ دیتی ہے ۔

عجیب و غریب نظام کے یہ اسرار، یہ طلوع و غروب، سبزوں، پرندوں، حشرات اور انسانوں میں زندگی کا یہ شور و غوغا، پرندوں کا زمزمہ، نسیم سحری کا یہ ہمہمہ اور یہ سب عجیب و دلنشین نقش کہ جو وجود کے در و دیوار پر ہیں ـــ اس قدر آشکار ہیں کہ جو کوئی ان میں اور ان کے خالق میں غور و فکر نہ کرے وہ ایسے ہی ہے جیسے دیوار پر کوئی نشان تھا ۔

بہت سے چھوٹے چھوٹے امور ہیں جو ظاہراً کوئی اہمیت نہیں رکھتے، جن کے قریب سے ہم بے اعتنائی سے گزر جاتے ہیں لیکن اچانک گہرائی تک پہنچنے والا ماہر پیدا ہوتا ہے جو کئی ماہ اور سالوں کے مطالعہ کے بعد عجیب و غریب اسرار معلوم کرتا ہے کہ جن سے دنیا کے منہ مارے تعجب کے کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں ۔

اصولی طور پر اہم بات یہ ہے کہ ہم جانیں کہ اس عالم میں کوئی چیز معمولی اور بے اہمیت نہیں ہے کیونکہ ہر چیز خدا کی مصنوع و مخلوق ہے ـــ وہ خدا کہ جس کا علم لامتناہی اور جس کی حکمت بے پایاں ہے ۔ بے وقعت وہ لوگ ہیں جو اس عالم کو بے اہمیت اور سرسری سی چیز سمجھتے ہیں ۔ لہٰذا اگر وہ ان آیاتِ قرآن پر کہ جو تجھ پر نازل ہوتی ہیں ایمان نہیں لاتے تو اس پر تعجب نہ کر کیونکہ وہ آیاتِ خلقت پر بھی ایمان نہیں لائے کہ جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں ۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : وہ جو ایمان لے آتے ہیں ان میں سے بھی اکثر کا ایمان خالص نہیں ہے بلکہ اس میں شرک کی آمیزش ہے (وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون) ۔ ہو سکتا ہے وہ خود سمجھتے ہوں کہ وہ خالص مومن ہیں لیکن شرک کی رگیں عموماً ان کے افکار، گفتار اور کردار میں موجود ہوتی ہیں ۔

ایمان صرف یہ نہیں ہے کہ انسان وجودِ خدا کا اعتقاد رکھتا ہو بلکہ ایک خالص موحد وہ ہے جس کے قلب و جان میں خدا کے علاوہ کسی شکل میں کوئی معبود نہ ہو ۔ اس کی گفتار خدا کے لیے اس کے اعمال خدا کے لیے اور اس کا ہر کام اسی کے لیے انجام پائے ۔ خدا کے قانون کے علاوہ وہ کسی قانون کو قبول نہ کرے اور اس کے غیر کی بندگی کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالے اور خدائی فرامین کو دل و

Marfat.com

جان سے قبول کرے چاہے وہ اس کے میلان کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ خدا اور ہوائے نفس کے انتخاب کے دوراہے پر ہمیشہ خدا کو مقدم شمار کرے یہ ہے ہر قسم کے شرک سے پاک ایمان۔ عقیدے کا شرک۔ گفتار کا شرک اور عمل کا شرک۔ اگر ہم واقعاً ہر پہلو کے بارے میں باریک بینی سے کام لیں تو دیکھیں گے کہ سچے، خالص اور حقیقی موحد بہت کم ہیں۔

اسی بناء پر اسلامی روایات میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

الشرك اخفی من دبیب النمل

انسانی اعمال میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے[1]

یہ بھی روایت ہے:

ان اخوف ما اخاف علیکم الشرك الاصغر قالوا وما الشرك الاصغر یارسول الله؟ قال الریا، یقول الله تعالی یوم القیامة اذا جاء الناس باعمالهم اذهبوا الی الذین کنتم تراءون فی الدنیا، فانظروا هل تجدون عندهم من جزاء؟!

رسول اللہؐ نے فرمایا:

خطرناک ترین چیز کہ جس کا مجھے تم سے خوف ہے شرکِ اصغر ہے۔

اصحاب نے پوچھا:

یارسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟

فرمایا:

ریاکاری، قیامت کے دن جب لوگ اپنے اعمال کے ساتھ بارگاہ خدا میں حاضر ہوں گے تو پروردگار انہیں کہ جو دنیا میں ریا کرتے تھے، فرمائے گا: ان کے پاس جاؤ کہ جن کے لیے تم ریا کرتے تھے اور دیکھو کہ ان کے ہاں سے تمہیں کوئی اجر ملتا ہے؟[2]

امام محمد باقر علیہ السلام سے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

شرك طاعة ولیس شرك عبادة والمعاصی التی ترتکبون وهی شرك طاعة اطاعوا فیها الشیطان فاشرکوا بالله فی الطاعة لغیره

اس آیت سے مراد اطاعت میں شرک کرنا ہے نہ کہ عبادت میں شرک کرنا اور جن گناہوں کے لوگ مرتکب ہوتے ہیں وہ شرک اطاعت ہے کیونکہ اس میں وہ شیطان کی اطاعت کرتے ہیں اور اس عمل کی بناء پر خدا کے لیے اطاعت میں شریک کے قائل ہوتے ہیں[3]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۱۶۹۷

[2] تفسیر فی ظلال جلد ۵ صفحہ ۵۳

[3] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۷۵ و اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۲۹۲

Marfat.com

بعض دوسری روایات میں ہے کہ مراد "شرک نعمت" ہے۔ اس معنی میں کہ کوئی نعمت خدا کی طرف سے انسان کو پہنچے اور وہ کہے کہ یہ نعمت فلاں شخص کی طرف سے مجھے پہنچی ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو میں مرجاتا یا میری زندگی تباہ ہو جاتی اور میں بے چارہ رہ جاتا۔[1]

یہاں غیر خدا کو روزی اور نعمات بخشنے میں خدا کا شریک شمار کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا آیت میں شرک سے مراد کفر، انکار خدا اور ظاہری طور پر بت پرستی کرنا نہیں ہے۔ جیسا کہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

شرك لايبلغ به الكفر

ایسا شرک جو کفر کے درجے تک نہ پہنچے۔

البتہ وسیع مفہوم کے لحاظ سے شرک میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

زیر بحث آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ایمان نہیں لائے، جو خدا کی واضح آیات کے قریب سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور جو اپنے اعمال میں مشرک ہیں خدا تعالیٰ انہیں خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا یہ لوگ اپنے آپ کو اس امر سے مامون سمجھتے ہیں کہ اچانک اور بغیر کسی تمہید کے انہیں عذاب الٰہی آگھیرے، احاطہ کرنے والا ایسا عذاب کہ جو ان سب کو آگھیرے (أفأمنوا ان تأتيهم غاشية من عذاب الله)۔ اور یا یہ کہ ناگہاں قیامت آپہنچے اور عظیم خدائی عدالت لگ جائے اور ان کا حساب کتاب شروع ہو جائے جب کہ وہ بے خبر اور غافل ہوں (او تأتيهم الساعة بغتة وهم لا يشعرون)۔

"غاشیہ" ڈھانپنے والی چیز اور ڈھکنے کے معنی میں ہے۔ دیگر چیزوں کے علاوہ گھوڑے کی زین پر ڈالے جانے والے بڑے کپڑے کو بھی غاشیۃ کہتے ہیں جو اسے ڈھانپ دیتا ہے یہاں پر اس سے مراد وہ سزا ہے جو تمام بدکاروں کو گھیرے گی۔[2]

"ساعۃ" سے مراد قیامت ہے جیسا کہ بہت سی دوسری قرآنی آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ "ساعۃ" ہولناک حوادث کے لیے کنایہ ہو کیونکہ قرآنی آیات بار بار کہتی ہیں کہ قیامت کے دن کا آغاز بہت زیادہ ہولناک حوادث کے ایک سلسلے سے ہوگا۔ مثلاً زلزلے، طوفان اور بجلیاں یا موت کی گھڑی کی طرف اشارہ ہے۔

پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ ص۴۷۶۔

[2] "غاشیۃ" یہاں اس لیے مؤنث ہے کہ یہ لفظ "عقوبۃ" کی صفت ہے کہ جو مقدر ہے۔

Marfat.com

۱۰۸۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ
وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
۱۰۹۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ
الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝
۱۱۰۔ حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ
نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ
الْمُجْرِمِيْنَ ۝
۱۱۱۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا
يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ
وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ع

ترجمہ

۱۰۸۔ کہہ دو: یہ میرا راستہ ہے کہ میں اور میرے پیروکار پوری بصیرت سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں۔
خدا منزہ ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

۱۰۹۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجا مگر شہر والوں میں سے ان مردوں کو کہ جن کی طرف ہم نے وحی کی ہے۔
کیا (تیری دعوت کے مخالفین نے) زمین میں سیر نہیں کی کہ وہ دیکھیں کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیا انجام
ہوا اور آخرت کا گھر پرہیز گاروں کے لیے بہتر ہے کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

Marfat.com

۱۱۰۔ (انبیاء نے اپنی دعوت اور دشمنوں نے اپنی مخالفت اسی طرح جاری رکھی) یہاں تک کہ پیغمبر مایوس ہو گئے اور انہوں نے گمان کیا کہ (حتیٰ مومنین کے چھوٹے سے گروہ نے بھی) ان سے جھوٹ بولا تو اس موقع پر ہماری مدد ان کے پاس آئی۔ ہم جس شخص کو چاہتے ہیں نجات دیتے ہیں اور زیاں کار قوم کے لیے ہماری سزا اور عذاب کو پلٹایا نہیں جا سکتا۔

۱۱۱۔ ان کی سرگزشتوں میں صاحبانِ فکر کے لیے درس عبرت ہے۔ یہ واقعات جھوٹی بات نہیں تھے بلکہ (یہ آسمانی وحی ہے اور) اس (گزشتہ آسمانی کتب) سے ہم آہنگ ہیں جو اس کے سامنے ہیں اور ہر چیز (کہ جو سعادت انسانی کی بنیاد ہے) کی تشریح اور ہدایت و رحمت ہے ایسے گروہ کے لیے کہ جو ایمان لایا ہے۔

تفسیر

عبرت کے زندہ درس

زیر نظر پہلی آیت میں پیغمبر اسلامؐ سے اپنے آئین، دین، روش اور خط کو مشخص کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے، کہہ دو، میری راہ اور طریقہ یہ ہے کہ سب کو اللہ کی طرف (کہ جو ایک اکیلا خدا ہے) دعوت دوں (قل ھٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ سفر میں نے بے خبری میں یا تقلیداً اختیار نہیں کیا بلکہ میں خود اور میرے پیروکار دنیا کے سب لوگوں کو اس راستے کی طرف آگاہی اور بصیرت سے بلاتے ہیں (علی بصیرۃ انا و من اتبعنی)۔

یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا پیروکار ہر مسلمان اپنے مقام پر حق کی طرف بلانے والا ہے اور اسے چاہیے کہ اپنی گفتار اور کردار سے دوسروں کو راہِ خدا کی طرف دعوت دے۔ نیز یہ جملہ یہ بھی نشاندہی کرتا ہے کہ "رہبر کو کافی بصیرت، بینائی اور آگاہی کا حامل ہونا چاہیے ورنہ اس کی دعوت حق کی طرف نہیں ہو گی۔

اس کے بعد بطور تاکید کہا گیا ہے: خدا — یعنی وہ ذات جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں — ہر قسم کے عیب، نقص، شبیہ اور شریک سے پاک اور منزہ ہے (و سبحان اللہ)۔

مزید تاکید کے لیے ارشاد ہوتا ہے: "میں مشرکین میں سے نہیں ہوں" اور میں اس کے لیے کسی قسم کے شبیہ و شریک کا قائل نہیں ہوں (و ما انا من المشرکین)۔

واقعاً ایک سچے رہبر کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ صراحت سے اپنے پروگراموں اور اہداف کا اعلان کرے اور وہ خود اور اس کے پیروکار بھی ایک مشخص اور واضح پروگرام کی پیروی کریں، نہ یہ کہ اس کا ہدف، روش اور طریقہ ابہام میں ہو یا یہ کہ ہر ایک الگ الگ

Marfat.com

راہ پر چل رہا ہو۔ اصولی طور پر سچے رہبروں کو جھوٹے رہبروں سے جدا پہچاننے کا یہی ایک راستہ ہے کہ یہ صراحت سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کا راستہ واضح ہوتا ہے جب کہ جھوٹے رہبر اپنے کاموں کو چھپائے رکھتے ہیں اور ہمیشہ مبہم اور پہلودار باتیں کرتے ہیں۔

حضرت یوسفؑ سے متعلق آیات کے بعد اس آیت کا آنا اس طرف اشارہ ہے کہ میری راہ و رسم خدا کے عظیم پیغمبر حضرت یوسفؑ کی راہ و رسم سے جدا نہیں ہے۔ وہ بھی ہمیشہ یہاں تک کہ گوشۂ زندان میں بیٹھ کر بھی خدائے واحد و قہار کی طرف دعوت دیتے تھے اور اس کے اغیار کو اسماء بے مسمیٰ شمار کرتے تھے کہ جو تقلیداً جاہلوں کے ایک گروہ سے دوسرے تک پہنچے تھے —— جی ہاں! میری روش اور تمام انبیاء کی روش یہی ہے۔

گمراہ اور نادان قوموں کی طرف سے انبیاء پر ہمیشہ یہ اعتراض ہوتا تھا کہ وہ انسان کیوں ہیں، یہ ذمہ داری فرشتے کے کندھے پر کیوں نہیں رکھی گئی؟ طبعاً زمانۂ جاہلیت کے لوگ بھی پیغمبر اسلامؐ پر ان کی عظیم دعوت کے جواب میں یہی اعتراض کرتے تھے لہٰذا قرآن مجید ایک مرتبہ پھر اس اعتراض کا جواب دیتا ہے: ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجے مگر یہ کہ وہ مرد تھے کہ جن کی طرف وحی نازل ہوتی تھی، ایسے مرد کہ جو آباد شہروں اور عوامی مراکز سے اٹھتے تھے (وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیهم من اهل القری)۔

وہ بھی انہی شہروں اور آبادیوں میں دوسرے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور لوگوں سے میل جول رکھتے تھے۔ ان کی مصیبتوں، تکلیفوں، ضرورتوں اور مشکلوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

آیت میں لفظ "من اهل القری" آیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ "قریة" ہر قسم کے شہر اور آبادی کو کہا جاتا ہے اور یہ لفظ "بدو" کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہے بیابان۔ ہوسکتا ہے یہ ضمنی طور پر اس طرف اشارہ ہو کہ انبیاء الٰہی ہرگز بیاباں نشینوں میں سے نہیں ہوتے تھے (جیسا کہ بعض مفسرین نے تصریح بھی کی ہے) کیونکہ بیابانوں میں گردش کرنے والے عام طور پر جہالت، نادانی اور قساوت قلبی میں گرفتار ہوتے ہیں اور مسائلِ زندگی اور روحانی و مادی ضروریات سے بہت کم آگاہی رکھتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ سرزمین حجاز میں صحرا نورد اعراب اور بدو بہت زیادہ تھے لیکن پیغمبر اسلامؐ مکہ میں مبعوث ہوئے کہ جو اس وقت نسبتاً بڑا شہر تھا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ کنعان کا علاقہ سرزمین مصر کہ جس میں یوسفؑ حکومت کرتے تھے کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اسی بناء حضرت یوسفؑ نے اس کے بارے میں لفظ "بدو" استعمال کیا لیکن ہم جانتے ہیں پیغمبر خدا حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹے کبھی بھی صحرا نورد اور بیاباں نشیں نہیں تھے بلکہ ایک چھوٹے سے قصبے کنعان میں زندگی بسر کرتے تھے۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے: یہ جو تیری دعوت کے خلاف ہیں، جب کہ تیری دعوت توحید کی طرف ہے ان کے لیے بہتر ہے کہ جائیں اور گزشتہ لوگوں کے آثار اور نشانات دیکھیں تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ ان کی مخالفتوں کا انجام کیا ہوگا۔ کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ وہ دیکھ سکتے کہ گزشتہ قوموں کا انجام کیا ہوا (افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلهم)۔

کیونکہ یہ "زمین میں سیر"، روئے زمین پر گردش، گزشتہ لوگوں کے آثار کا مشاہدہ اور عذاب الٰہی کی تباہ کن ضربوں کے نتیجے میں ان کے محلوں اور آبادیوں کی ویرانی بہترین درس ہے۔ یہ زندہ اور محسوس درس ہے اور ایسا درس ہے جو سب کے لیے قابلِ لمس ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے مسلماً بہتر ہے (ولدار الاٰخرة خیر للذین اتقوا)۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے اور اپنی فکر و نظر کو کام میں نہیں لاتے (افلا تعقلون) کیونکہ یہاں کا گھر تو ناپائیدار ہے۔ یہاں تو طرح طرح کے

Marfat.com

مصائب و آلام اور تکلیفیں ہیں لیکن وہاں کا گھر جاودانی ہے اور ہر قسم کے رنج و تکلیف اور پریشانی سے خالی ہے۔

بعد والی آیت میں انبیاء کی زندگی کے حساس ترین اور زیادہ بحرانی لمحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: خدائی پیغمبر حق کی طرف دعوت دینے کی راہ میں استقامت دکھاتے تھے اور ڈٹے رہتے تھے اور دوسری طرف گمراہ اور سرکش قومیں اپنی مخالفت کو اس طرح جاری رکھتی تھیں کہ آخرکار انبیاء مایوس ہو جاتے اور گمان کرنے لگتے کہ شاید مومنین کے چھوٹے سے گروہ نے بھی ان سے جھوٹ بولا ہے اور اپنی دعوت کے راستے میں وہ تن تنہا ہیں۔ اس وقت کہ جب ہر طرف سے ان کی اُمید ختم ہو گئی تو ہماری طرف سے نصرت و کامیابی آپہنچی جسے ہم چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں، نجات دیتے ہیں (حتی اذا استیئس الرسل وظنوا انهم قد کذبوا جاءهم نصرنا فنجی من نشاء)[1]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ہمارا عذاب و عقاب گنہگار اور مجرم قوم سے پلٹایا نہیں جائے گا (ولا یرد باسنا عن القوم المجرمین)۔

یہ ایک سنتِ الٰہی ہے کہ جب مجرمین اپنے کام پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے اوپر ہدایت کے دروازے بند کر لیتے ہیں اور ان پر اتمامِ حجت ہو جاتی ہے تو پھر خدائی عذاب اور سزائیں ان کا تعاقب کرتی ہیں اور پھر کسی کی قدرت میں نہیں کہ انہیں پلٹا سکے۔

اس آیہ کی تفسیر کے متعلق اور یہ کہ " ظنوا انهم قد کذبوا " کس گروہ کے بارے میں ہے، مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے یہی تفسیر بہت سے علماء نے انتخاب کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کا معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا تھا کہ وہ گمان کرنے لگتے کہ بغیر کسی استثناء کے تمام لوگ ان کی تکذیب کریں گے یہاں تک کہ اظہار ایمان کرنے والے مومنین بھی اپنے عقیدے میں ثابت قدم نہیں ہیں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "ظنوا" کا فاعل مومنین ہیں۔ یعنی مشکلات اور بحران کا عالم یہ ہوتا کہ ایمان لانے والے یہ خیال کرتے کہ کہیں انبیاء کی طرف سے دیا جانے والا نصرت و کامیابی کا وعدہ غلط ہی نہ ہو اور یہ سوئے ظن اور تنزل نئے ایمان لانے والوں میں پیدا ہونا کوئی بعید نہیں ہے۔

بعض نے آیت کی ایک اور تفسیر بھی کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء بلاشک و شبہ بشر تھے، جب انہیں زیادہ طوفانی حالات کا سامنا ہوتا تو حالات کی اس سنگینی کا اثر ان پر بھی ہوتا۔ وہ دیکھتے کہ تمام دروازے بند ہو گئے ہیں اور کشائش کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا، طوفانی حوادث کے تھپیڑے مسلسل انہیں پڑتے اور جن مومنین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ان کی فریاد متواتر ان کے کانوں سے ٹکراتی رہتی۔ جی ہاں! اس حالت میں ایک ناپائیدار لمحے میں طبیعتِ بشری کی بناء پر بے اختیار یہ فکر ان کے دماغ سے ٹکراتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کامیابی کا وعدہ ہی غلط ثابت ہو جائے یا ممکن ہے کامیابی کا وعدہ ایسے شرائط سے مشروط ہو کہ جو حاصل نہ ہوئی ہوں لیکن بہت جلد وہ اس فکر پر غالب آجاتے اور اسے صفحۂ دل سے محو کر دیتے اور اُمید کی بجلی ان کے دلوں میں کوندنے لگتی اور اس کے ساتھ ہی کامیابی کے آثار اور ہراول دستے ظاہر ہوتے۔

اس تفسیر کے لیے انہوں نے سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ سے شاہد پیش کیا ہے:

---

[1] "حتی" محذوف جملے کے لیے غایت وانتہا کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے:

ان الرسل اقاموا علی دعوتهم والکافرین بهم علی مخالفتهم حتی اذا استیئس الرسل ....

Marfat.com

حتیٰ یقول الرسول والذین اٰمنوا معہ متیٰ نصر اللہ

یعنی — گزشتہ قومیں شدائد و مصائب کے بھنور میں اس طرح پھنس گئیں اور وہ خوف سے لرزنے لگیں یہاں تک کہ ان کے پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والے پکار کے کہتے تھے: کہاں ہے خدا کی نصرت — لیکن انہیں جواب دیا جاتا تھا:

الا ان نصر اللہ قریب

خدا کی نصرت قریب ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں یہ احتمال ذکر کرنے کے بعد اسے بعید قرار دیا ہے کیونکہ مقام انبیاء سے اس قدر بھی بعید ہے۔

بہرحال پہلی تفسیر ہی زیادہ صحیح ہے۔

اس سورہ کی آخری آیت ایک بہت جامع مضمون کی حامل ہے۔ اس میں وہ تمام مباحث مختصر سے الفاظ میں جمع کر دیئے گئے ہیں جو اس سورہ میں گزرے ہیں — اور وہ یہ کہ حضرت یوسفؑ، ان کے بھائیوں، گزشتہ انبیاء و مرسلین اور مومن و غیر مومن قوموں کی سرگزشت اور حالاتِ زندگی میں غور و فکر کرنے والے تمام صاحبانِ عقل کے لیے عبرت کے عظیم درس موجود ہیں (لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب)۔

گزرے ہوؤں کی سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں فتح و شکست، کامیابی و ناکامی، خوش بختی و بدبختی اور سربلندی و ذلت سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان اس آئینے میں وہ کچھ بھی دیکھ سکتا ہے جو اس کی زندگی میں اہمیت اور منزلت رکھتا ہے اور وہ کچھ بھی دیکھ سکتا ہے جو اس کی زندگی میں اہمیت و منزلت نہیں رکھتا۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں گزشتہ قوموں اور عظیم رہبروں کے تمام تجربات کا ماحصل نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جس کا مشاہدہ کم عمر والے انسان کو تمام عالم بشریت کی عمر کے برابر طولانی زندگی والا کر دیتا ہے لیکن صرف اولوالالباب اور صاحبانِ فکر ہی ہیں جو اس عجیب و غریب آئینہ سے ان نقوشِ عبرت کو دیکھ سکتے ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے: جو کچھ کہا گیا ہے کوئی گھڑا ہوا افسانہ اور خیالی داستان نہیں ہے (ما کان حدیثاً یفتریٰ)۔

یہ آیات جو تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور گزشتہ لوگوں کی صحیح تاریخ کے چہرے سے پردہ ہٹاتی ہیں تیرے دماغ اور فکر کی پیداوار نہیں ہیں" بلکہ یہ ایک عظیم آسمانی وحی ہے، گزشتہ انبیاء کی بنیادی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی شہادت دیتی ہے" (ولکن تصدیق الذی بین یدیہ)۔

علاوہ ازیں جس چیز کی انسان کو ضرورت ہے اور جو کچھ اس کی سعادت اور تکامل کے لیے درکار ہے وہ ان آیات میں آیا ہے (وتفصیل کل شیٔ)۔

اسی بناء پر یہ جستجو کرنے والوں کے لیے سرمایۂ ہدایت ہے اور تمام ایمان لانے والوں کے لیے باعثِ رحمت ہے (وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون)۔

گویا مندرجہ بالا آیت اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہے کہ خوبصورت اور دل انگیز جعلی داستانیں تو بہت ہیں اور تمام قوموں میں ہمیشہ خیالی اور دلکش افسانے بہت رہے ہیں — کہیں کوئی یہ تصور نہ کرے کہ یوسفؑ کی سرگزشت یا قرآن میں آنے والے دیگر انبیاء

Marfat.com

کے واقعات بھی اسی قبیل سے ہیں۔

یہ امر بہت اہم ہے کہ یہ عبرت انگیز اور جھنجوڑنے والے واقعات عین حقیقت ہیں اور ان میں ذرہ بھر انحراف نہیں اور نہ کوئی خارجی چیز ان میں شامل کی گئی ہے۔ اسی بناء پر ان کی تاثیر بہت زیادہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خیالی افسانہ کتنا ہی جاذب نظر، ہلا دینے والا اور مرتب منظم ہو اس کی تاثیر ایک حقیقی واقعے کی نسبت کچھ بھی نہیں ہے ــــ کیونکہ:

اولاً ــــ جس وقت سننے والا اور پڑھنے والا داستان کے زیادہ ہیجان انگیز لمحات تک پہنچتا ہے اور اس سے لرزنے لگتا ہے تو اچانک یہ خیال بجلی کے کرنٹ کی طرح اس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک خیالی اور تصوراتی چیز سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ثانیاً ــــ یہ واقعات اور داستانیں در اصل انہیں پیش کرنے والے کی فکر کو بیان کرتی ہیں۔ وہ اپنے افکار اور خواہشات کا نچوڑ داستان کے ہیرو کے کردار میں مجسم کرتا ہے۔

لہٰذا ایک خیالی داستان ایک انسان کی فکر سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور یہ چیز ایک عینی حقیقت سے بہت مختلف ہے۔ خیالی بات کہنے والے کی نصیحت اور وعظ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن انسانوں کی حقیقی تاریخ کی یہ صورت نہیں ہے وہ تو نتیجہ خیز، پُر برکت اور ہر لحاظ سے راہ کشا ہوتی ہے۔

سورۂ یوسفؑ کا اختتام

پروردگارا!

ہمیں چشم بینا، گوش شنوا اور قلبِ دانا مرحمت فرما۔

تاکہ ہم گزشتہ لوگوں کی سرگزشتوں سے اپنی نجات کے راستے تلاش کر سکیں اور ان مشکلات سے نکل جائیں کہ جن میں اس وقت ہم غوطہ زن ہیں۔

خداوندا!

ہمیں تیز نگاہ عطا فرما۔

تاکہ ہم اقوام عالم کے انجام سے سبق حاصل کریں اور کامیابی کے بعد اختلاف و انتشار کی بناء پر دردناک ترین شکستوں سے دوچار ہونے والی اقوام کو ہم دیکھیں اور اس طرح ہم اس راستے پر نہ چلیں جس پر وہ قومیں چلی ہیں۔

بارالہا!

ہمیں ایسی خالص نیت عطا فرما ــــ کہ
ہم نفس کے دیو کے سر پر پاؤں رکھ دیں اور
ایسی معرفت عطا فرما ــــ کہ
ہم کامیابی پر مغرور نہ ہوں ــــ اور

Marfat.com

ایسی گزشت و بخشش عطا فرما کہ

اگر دوسرا ہم سے بہتر کام انجام دے تو وہ کام ہم اس کے سپرد کردیں۔

اگر یہ چیزیں تو ہمیں مرحمت فرما دے تو ہم تمام مشکلات پر کامیابی حاصل کرسکتے ہیں اور ہم اسلام و قرآن کا چراغ ساری دنیا میں روشن رکھ سکتے ہیں۔

Marfat.com

سُوْرَہٌ رَعْد

◎ــــــ مکہ میں نازل ہوئی

◎ــــــ اس کی ۴۳ آیتیں ہیں

Marfat.com

سورۂ رعد کے مضامین و مشتملات

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ مکی سورتیں چونکہ دعوتِ پیغمبرؐ کے آغاز میں اور مشرکین کے ساتھ سخت اور شدید مقابلے کے موقع پر نازل ہوئی ہیں لہٰذا زیادہ تر عقائد کے مسائل ان میں موجود ہیں خصوصاً توحید کی دعوت، شرک سے مقابلہ اور معاد و قیامت کے اثبات ان میں موجود ہیں جب کہ مدنی سورتیں کہ جو اسلام کی وسعت اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد نازل ہوئی ہیں وہ معاشرے کی ضروریات کے مطابق اجتماعی نظام سے مربوط احکام و مسائل کے متعلق بحث کرتی ہیں۔

زیرِ بحث سورہ ــــ سورہ رعد ــــ کہ جو مکی سورتوں میں سے ہے اسی پروگرام کے ذیل میں ہے اس میں قرآن کی حقانیت و عظمت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد توحید سے متعلق آیات ہیں، اسرارِ خلقت و آفرینش کا ذکر ہے کہ جو خدا کی ذاتِ پاک کی نشانیاں ہیں۔

کبھی بغیر ستون کے کھڑے آسمان کا ذکر ہے، کبھی حکم خدا سے آفتاب و ماہتاب کی تسخیر کے بارے میں تذکرہ ہے، کبھی زمین بچھانے کی بات ہے، کبھی پہاڑوں، نہروں، درختوں اور پھلوں کی خلقت کا ذکر ہے اور کبھی رات کے آرام بخش پردوں کا تذکرہ ہے کہ جو دن کو چھپا دیتے ہیں۔

قرآن کبھی لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر انگور کے باغوں، نخلستانوں اور لہلہاتی کھیتیوں میں لے جاتا ہے اور ان کے عجائب و غرائب شمار کرتا ہے اور پھر معاد و قیامت، انسان کی نئی زندگی اور پروردگار کی دادگاہِ عدل کے بارے میں بحث کرتا ہے اور یہ بحث مبداء و معاد کے تعارف، لوگوں کی ذمہ داریوں کے بیان اور یہ کہ ان کی سرنوشت میں ہر طرح کا تغیر اُن کے اپنے ہاتھ میں ہے، کے اصول کے تذکرے پر مکمل ہوتی ہے۔

قرآن دوبارہ مسئلہ توحید کی طرف لوٹتا ہے۔ رعد کی سنگین آواز اور برق کی وحشت انگیز کڑک کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور پھر آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں کے عظمتِ پروردگار کے سامنے سجدہ کرنے کی بات کرتا ہے۔

پھر آنکھوں اور کانوں کو کھولنے اور بینائی و دانائی کی بیداری کے لیے انسان کے اپنے ہاتھوں بنائے گئے بتوں کی بے وقعتی کا تذکرہ کرتا ہے، انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور حق و باطل میں تمیز کے لیے مثالیں پیش کرتا ہے ــــ زندہ اور محسوس مثالیں۔ سب کے لیے قابلِ ادراک مثالیں۔

اور چونکہ توحید و معاد کا آخری اور اصلی ثمرہ دینی اصلاحی و عملی پروگرام ہیں ــــ لہٰذا ان تمام مباحث کے بعد قرآن اس سورہ میں ایفائے عہد، صلہ رحمی، صبر و استقامت، آشکار و پنہاں انفاق اور ترکِ انتقام جوئی کی دعوت دیتا ہے۔

پھر دوبارہ نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا کی زندگی ناپائیدار ہے اور سکون و اطمینان خدا پر ایمان کے سائے کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

آخر میں لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر تاریخ کی پہنائیوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور گزر جانے والی باغی اور سرکش قوموں، کہ جنہوں نے حق پوشی کی یا لوگوں کو حق سے روکا، کے انجام کی نشاندہی کرتا ہے اور ہلا دینے والے الفاظ میں کافروں کو تہدید کرتے ہوئے یہ سورہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

لہٰذا ــــ سورتِ رعد عقائد و ایمان سے شروع ہوتی ہے ــــ اور اعمال، کردار اور انسان ساز پروگراموں کے ذکر پر تمام ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ الٓمّٓرٰ ۚ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ
وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ○

۲۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی
الۡعَرۡشِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ
الۡاَمۡرَ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ○

۳۔ وَہُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ وَجَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ وَاَنۡہٰرًا ؕ وَمِنۡ کُلِّ
الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیۡہَا زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ
ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ○

۴۔ وَفِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّزَرۡعٌ
وَّنَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّغَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۟ قف وَ
نُفَضِّلُ بَعۡضَہَا عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ
لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ المر یہ (آسمانی) کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

Marfat.com

۲۔ خدا وہی ہے جس نے آسمان کو قابلِ مشاہدہ ستون کے بغیر پیدا کیا پھر عرش کا کنٹرول سنبھالا (اور تدبیر عالم کی مہار اپنے ہاتھ میں لی) اور آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا کہ ان میں سے ہر ایک معین زمانے تک حرکت رکھتے ہیں، وہی کاموں کی تدبیر کرتا ہے، (تمہارے لیے) آیات کی تشریح کرتا ہے تاکہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین حاصل کرو۔

۳۔ وہ وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں اور اس میں تمام پھلوں کے دو جفت پیدا کیے۔ وہی دن کو رات (کا سیاہ پردہ) اوڑھاتا ہے۔ ان میں اُن کے لیے آیات ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

۴۔ اور روئے زمین میں ایسے قطعات ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نیز انگور کے باغات، کھیتیاں اور نخلستان ہیں کہ جو کبھی ایک ہی پائے پر اُگتے ہیں اور کبھی دو پایوں پر۔ وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے بعض کو پھل کے لحاظ سے ہم دوسرے پر برتری دیتے ہیں۔ ان میں اُن کے لیے نشانیاں ہیں جو اپنی عقل استعمال کرتے ہیں۔

تفسیر

آسمان و زمین اور سبزہ زار خدا کی نشانیاں ہیں

اس سورہ کے آغاز میں ہم پھر قرآن کے حروفِ مقطعات کا سامنا کر رہے ہیں۔ ایسے الفاظ قرآن کی ۲۹ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔ البتہ یہاں آنے والے حروف دراصل "الم" اور "الر" کا مرکب ہیں جو چند دیگر سورتوں کی ابتداء میں الگ الگ آئے ہیں۔ درحقیقت یہ وہ واحد سورۃ ہے جس کی ابتداء میں "المر" نظر آتا ہے اور چونکہ ہر سورہ کی ابتداء میں جو حروف مقطعات آتے ہیں وہ اس سورہ کے مضامین کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتے ہیں لہٰذا احتمال ہے کہ یہ ترکیب جو سورہ رعد کی ابتداء میں آئی ہے اس طرف اشارہ ہے کہ سورہ رعد کے مضامین ان دونوں قسم کی سورتوں کے مضامین کے جامع ہیں جن کی ابتداء میں "الم" اور "الر" آیا ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ ان سورتوں کے مضامین میں غور و خوض کرنے سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔

Marfat.com

قرآن کے حروف مقطعات کی تفسیر کے بارے میں اب تک ہم نے سورۂ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ اعراف کے آغاز میں تفصیلی بحث کی ہے کہ جس کے تکرار کی ہم ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

بہرحال اس سورہ کی سب سے پہلی آیت عظمتِ قرآن کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔

"یہ عظیم آسمانی کتاب کی آیات ہیں" (تلك اٰيٰت الكتٰب)[1] "اور جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے" (والذی انزل اليك من ربك الحق)۔ اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ حقائق عینی بیان کرنے والا جہانِ آفرینش اور اس کے انسان سے روابط کا عینی شاہد ہے۔

یہ ایسا حق ہے جو باطل میں ملا ہوا نہیں ہے۔ اسی لیے اس کی حقانیت کی نشانیاں اس کے چہرے سے ہویدا ہیں اور یہ مزید استدلال کی ضرورت نہیں رکھتا۔

لیکن اس کے باوجود بوالہوس اور نادان لوگ، کہ جن کی اکثریت ہے، ان آیات پر ایمان نہیں لاتے (ولٰكن اكثر الناس لا يؤمنون)۔

کیونکہ اگر انسان کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور وہ پاک دل معلم کی پیروی نہ کرے کہ جو رہِ حیات میں اس کی ہدایت اور تربیت کرے اور اس طرح وہ ہوا و ہوس کی پیروی کرنے میں بھی آزاد ہو تو اکثر وہ اپنے راستے سے بھٹک کر بے راہ روی کا شکار ہو جائے گا۔ لیکن اگر خدائی مربی اور راہِ حق کے ہادی ان انسانوں کے امام اور پیشوا ہوں اور وہ اپنے آپ کو ان کے اختیار میں دے دیں تو پھر اکثریت راہِ حق پر چلے گی۔

اس کے بعد توحید اور عالمِ آفرینش میں خدا کی نشانیوں کے اہم دلائل کی تشریح کی گئی ہے اور خاکی انسان کو آسمانوں کی وسعت میں گردش کرنے پر ابھارا گیا ہے اور اس کے لیے ان عظیم کروں، ان کے نظامِ حرکت اور ان کے اسرار کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ وہ اس کی لامتناہی اور بے پایاں قدرت و حکمت کو جان سکے۔ کس قدر خوبصورتی سے فرمایا گیا ہے: خدا وہی ہے کہ جو آسمانوں کو جیسا کہ تم دیکھتے ہو بغیر ستون کے قائم کیے ہوئے ہے یا وہ انہیں غیر مرئی ستونوں کے ساتھ بلند کیے ہوئے ہے (الله الذی رفع السمٰوٰت بغير عمد ترونها)[2]

"بغیر عمد ترونها" کے بارے میں علماء نے دو تفسیریں بیان کی ہیں:

پہلی یہ کہ "جس طرح تم دیکھتے ہو آسمان بغیر ستون کے ہے (گویا اصل میں ایسے تھا: (ترونها بغير عمد)۔

دوسری یہ کہ "ترونها" صفت ہے "عمد" کے لیے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ آسمانوں کو بغیر کسی مرئی ستون کے بلند کیا گیا جس کا لازمہ یہ ہے کہ آسمان کے لیے ستون ہے لیکن ایسا ستون جو غیر مرئی ہے۔

---

[1] جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ "تلك" اسم اشارہ بعید ہے، اس کا انتخاب قریب کے اشارہ "هذه" کی بجائے قرآنی آیات کی عظمت و رفعت کے لیے کنایہ ہے۔

[2] "عُمُد" (بروزن "صمد") اور "عَمَد" (بروزن "دهل") دونوں "عمود" بمعنی "ستون" کی جمع ہیں اگرچہ ادبی لحاظ سے پہلے کو جمع اور دوسرے کو اسم جمع سمجھا جاتا ہے (مجمع البیان ـ زیرِ بحث آیت کے ذیل میں)۔

Marfat.com

یہی بات امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے حسین بن خالد کی حدیث میں آئی ہے ، وہ کہتا ہے :

میں نے امام ابوالحسن رضاؑ سے پوچھا : یہ جو خدا کہتا ہے "والسماء ذات الحبك " (اس آسمان کی قسم جو راستوں کا حامل ہے اس سے کیا مراد ہے ؟

امام نے فرمایا

اس آسمان کے زمین کی طرف راستے ہیں۔

حسین بن خالد کہتے ہیں : میں نے عرض کیا :

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آسمان زمین کے ساتھ ارتباطی راستہ رکھتا ہو حالانکہ خدا فرماتا ہے آسمان ستون کے بغیر ہیں۔

اس پر امام نے فرمایا :

سبحان الله ! الیس الله یقول : بغیر عمد ترونها

سبحان اللہ ! کیا خدا نے نہیں فرمایا : بغیر ایسے ستون کے جو قابلِ مشاہدہ ہو ؟

فقلت بلیٰ

راوی کہتا ہے : میں نے کہا : جی ہاں

فقال ثم عمد ولکن لا ترونها

فرمایا : پس ستون تو ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے [1]

اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیرِ بحث آیت کی تفسیر کے ذیل میں آئی ہے ، اس آیت نے ایک سائنسی حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے کہ جو نزولِ آیات کے وقت کسی پر آشکار نہیں تھی کیونکہ اس زمانے میں بطلیموس کی ہیئت اپنی پوری طاقت کے ساتھ دنیا کے سائنسی مسائل اور لوگوں کے افکار و نظریات پر حکمران تھی اور اس کے مطابق آسمان ایک دوسرے پر پیاز کے چھلکوں کی طرح کرات کی شکل میں تھے ۔ ظاہر ہے اس طرح تو ان میں سے کوئی بھی معلق اور ستون کے بغیر نہ تھا بلکہ ہر ایک دوسرے کا سہارا لیے ہوئے تھا لیکن ان آیات کے نزول کے تقریباً ایک ہزار سال بعد انسانی علم اس مقام پر پہنچا ہے کہ پیاز کے چھلکوں والے افلاک کی بات موہومی ہے۔ واقعیت یہ ہے کہ آسمانی کرات میں سے ہر ایک اپنے مدار اور جگہ پر بغیر کسی سہارے کے ثابت اور معلق ہے اور وہ واحد چیز جو انہیں اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے وہ قوت جاذبہ اور دافعہ کا اعتدال ہے کہ جن میں سے ایک ان کرات کے جرم سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ان کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے ۔

جاذبہ و دافعہ کا یہ اعتدال ایک غیر مرئی ستون کی شکل میں آسمانی کرات کو اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے ۔

اس سلسلے میں ایک حدیث جو امیرالمومنین علیؑ سے نقل ہوئی ہے بہت ہی جاذب نظر ہے ۔ اس حدیث کے مطابق امام علیہ السلام نے فرمایا :

---

[1] یہ حدیث تفسیر برہان میں تفسیر علی بن ابراہیم اور تفسیر عیاشی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے ۔ (برہان جلد ۲ صفحہ ۲۷۸)

Marfat.com

هذه النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن الذی فی الارض مربوطة کل مدینة الی عمود من نور[1]

یہ ستارے جو آسمان میں ہیں یہ زمین کے شہروں کی طرح شہر ہیں کہ جن میں سے ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ (ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) نور کے ایک ستون کے ذریعے مربوط ہے۔

کیا اُس زمانے کے افق ادبیات میں قوتِ جاذبہ کی امواج اور اُن کے قوتِ دافعہ میں اعتدال کے لیے "غیر مرئی ستون" اور "نورانی ستون" سے بڑھ کر روشن اور رسا تعبیر ہو سکتی تھی؟[2]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا نے بغیر ستون کے ان آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد کہ جو اس کی لامتناہی عظمت و قدرت کی واضح نشانی ہیں عرش کا کنٹرول سنبھالا، یعنی عالمِ ہستی کی حکومت اپنے قبضے میں لی (ثم استوٰی علی العرش)۔

"عرش" کے معنی اور اس پر خدا کے تسلّط کے مفہوم کے سلسلے میں سورہ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں کافی بحث ہو چکی ہے۔[3]

آسمانوں کی خلقت اور ان پر پروردگار کی حکومت کا ذکر کرنے کے بعد سورج اور چاند کی تسخیر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ وہی ہے جس نے سورج اور چاند کو مسخر کیا اور انہیں فرمان بردار اور خدمت گزار قرار دیا (وسخر الشمس والقمر)۔

اس سے بڑھ کر تسخیر کیا ہو گی کہ یہ سب اس کے فرمان کے سامنے سرنگوں ہیں نیز انسانوں اور تمام زندہ موجودات کے خدمت گزار ہیں، نور چھڑکتے ہیں، ایک عالم کو روشن کرتے ہیں، موجودات کا بستر گرم رکھتے ہیں، موجوداتِ زندہ کی پرورش کرتے ہیں اور دریاؤں میں مدوجزر پیدا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمام حرکتوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہیں۔

لیکن جہانِ مادہ کا یہ نظام جاودانی اور ابدی نہیں ہے اور شمس و قمر میں سے ہر ایک، ایک مدتِ معین تک اپنے راستے پر حرکت جاری رکھے ہوئے ہے (کل یجری لاجل مسمّی)۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ یہ حرکات، گردشیں، آمد و شد اور تبدیلیاں بغیر کسی حساب و کتاب کے اور بے نتیجہ و بے فائدہ نہیں ہیں بلکہ "وہی ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے" اور ہر حرکت کے لیے حساب اور ہر حساب کے لیے ہدف اور مقصد نظر میں رکھتا ہے (یدبر الامر)۔

"وہ اپنی آیات تمہارے لیے شمار کرتا ہے اور ان کی باریکیاں تفصیل سے بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں لقائے پروردگار اور دوسرے جہان کا یقین پیدا ہو" (یفصل الاٰیات لعلکم بلقاء ربکم توقنون)۔

گزشتہ آیت انسان کو آسمانوں پرلے جاتی ہے اور عالمِ بالا میں اسے آیاتِ الٰہی کی طرف متوجہ کرتی ہے دوسری آیت انسان کو توحیدی آیات کے مطالعے کی دعوت دیتی ہے، انسان کو زمین، پہاڑوں، نہروں، انواع و اقسام کے پھلوں اور سورج کے طلوع و غروب

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۷۴ منقول از تفسیر علی بن ابراہیم قمی۔

[2] مزید وضاحت کے لیے کتاب "قرآن و آخرین پیغمبر" ص ۱۶۶ کے بعد کی طرف رجوع فرمائیں۔

[3] تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۱۷۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

پر غور کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ وہ سوچ بچار کرے کہ اس کا یہ مقام آسائش و آرام پہلے کیا تھا اور وہ اس شکل میں کیسے آیا۔

قرآن کہتا ہے: وہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا (وھو الذی مد الارض)۔ اس نے اسے یوں پھیلایا کہ وہ انسانی زندگی اور نباتات و حیوانات کی پرورش کے قابل ہو۔ تند اور خطرناک گڑھوں اور ڈھلوانوں میں پہاڑ داخل کر دیئے اور انہیں پتھروں کو مٹی میں تبدیل کر کے پُر کیا اور ان کی سطح کو قابلِ حیات بنایا حالانکہ ابتداء میں ان کے پیچ و خم ایسے تھے جن میں انسان کے لیے زندگی بسر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس جملے میں "مد الارض" سے یہ احتمال بھی ہے کہ جیسا کہ ماہرینِ ارض بھی کہتے ہیں ابتداء میں ساری زمین پانی کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی۔ پھر پانی گڑھوں میں چلا گیا اور خشکیاں تدریجاً پانی سے نمایاں ہونے لگیں اور دن بدن ان میں وسعتِ پیدائش ہوتی گئی یہاں تک کہ انہوں نے موجودہ صورت اختیار کر لی۔

اس کے بعد پہاڑوں کی پیدائش کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: خدا نے زمین میں پہاڑ بنائے ہیں (وجعل فیھا رواسی)۔

وہی پہاڑ — کہ جن کا قرآن کی دوسری آیات میں "اوتاد" (یعنی "زمین کی میخیں") کے طور پر تعارف کروایا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نیچے سے پہاڑوں نے ایک دوسرے میں پنجے ڈالے ہوئے ہیں اور زرہ کی طرح ساری سطحِ زمین کو ڈھانپا ہوا ہے تاکہ اندرونی دباؤ بھی ختم کر سکیں اور باہر سے چاند کی بہت زیادہ قوتِ جاذبہ اور مد و جزر کو بھی روکے رکھیں، اس طرح سے تزلزل اور دائمی زلزلوں کو ختم کر سکیں اور کرۂ زمین کو انسانی زندگی کے آرام و سکون کے لیے برقرار رکھیں۔

زمین کے پھیلانے اور بچھانے کے بعد پہاڑوں کا ذکر گویا اس طرف اشارہ ہے کہ زمین نہ اس طرح سے پھیلائی گئی ہے کہ اس میں کوئی پستی و بلندی نہ ہو کیونکہ اس صورت میں بارشیں اور پانی اس پر نہ ہوتے اور یا ہر جگہ ایک جوہڑ کی صورت میں تبدیل ہو جاتی اور اس کی سطح پر دائمی طوفان جاری رہتے لیکن پہاڑوں کی پیدائش سے ان دونوں صورتوں سے امان مل گئی ہے اور نہ ساری زمین پہاڑوں اور دروں پر مشتمل ہے کہ زندگی کے قابل ہی نہ ہو بلکہ زمین مجموعی طور پر ہموار بھی ہے اور اس میں پہاڑ اور درے بھی ہیں جو نوعِ بشر اور دیگر زندہ موجودات کی زندگی کے لیے بہترین ترکیب ہے۔

اس کے بعد ان پانیوں اور دریاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو روئے زمین پر چلتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: اور اس میں دریا جاری ہیں (و انھارا)۔

زمین کی آبیاری کے نظام کا پہاڑوں سے ارتباط اور پہاڑوں کا دریاؤں سے تعلق بہت جاذبِ نظر ہے کیونکہ زمین کے بہت سے پہاڑوں کی چوٹیوں اور دروں کے شگافوں میں برف کی صورت میں یہ دریا سٹور ہوتے ہیں جو تدریجاً پانی کی شکل اختیار کرتے ہیں اور قانونِ جاذبہ کے مطابق بلند تر مقامات سے زیریں اور کشادہ علاقوں کی طرف سفر کرتے ہیں اور بغیر کسی قوت کی احتیاج کے سال بھر طبیعی طور پر بہت وسیع زمینوں کی آبیاری کرتے ہیں اور انہیں سیراب کرتے ہیں اگر زمینوں میں مناسب ڈھلوان نہ ہوتی اور پانی اس شکل میں پہاڑوں پر ذخیرہ نہ ہوتا تو زیادہ تر خشک علاقوں کی آبیاری کا امکان نہ ہوتا اور اگر آبیاری ممکن بھی ہوتی تو بہت زیادہ مخارج کی ضرورت پڑتی۔

Marfat.com

اس کے بعد غذائی مواد اور ان پھلوں کا ذکر ہے کہ جو زمین، پانی اور سورج کی روشنی سے وجود میں آتے ہیں اور انسانی غذا کا بہترین وسیلہ ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: اور تمام پھلوں میں سے جوڑا جوڑا زمین پر قرار دیئے گئے ہیں (ومن کل الثمرات جعل فیہا زوجین اثنین)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ پھل بھی زندہ موجودات ہیں اور ان میں بھی نر اور مادہ نطفے موجود ہیں کہ جو تلقیح سے بار آور ہوتے ہیں۔

دانشمند "لینہ" اور مشہور ماہر نباتات "سونڈی" اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواسط میں یہ بات معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے کہ عالم نباتات میں زوجیت اور جفت کا معاملہ تقریباً عمومی اور کلی قانون ہے اور نباتات بھی حیوانات کی طرح نر اور مادہ کے نطفہ کی آمیزش سے بار آور ہوتے ہیں اور پھل دیتے ہیں جب کہ قرآن مجید نے اس سے گیارہ سو سال پہلے اس حقیقت کو فاش کر دیا تھا۔ یہ خود قرآن مجید کا ایک علمی معجزہ ہے کہ جس سے اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لینہ سے پہلے بہت سے ماہرین اجمالی طور پر بعض نباتات میں نر اور مادہ کا وجود معلوم کر چکے تھے یہاں تک کہ عام لوگ بھی جانتے تھے کہ اگر کھجور کے درخت بُور نہ دیں یعنی نر کا نطفہ مادہ حصوں پر نہ چھڑکا جائے تو وہ پھل نہیں دے گا لیکن کوئی شخص ٹھیک طرح سے یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ قانون تقریباً سب کے لیے ہے یہاں تک کہ لینہ اسے معلوم کرنے میں کامیاب ہوا مگر جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن صدیوں پہلے اس حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا چکا تھا۔

انسان اور دیگر تمام زندہ موجودات کی زندگی، بالخصوص نباتات، گیاہ اور پھلوں کی زندگی رات اور دن کے دقیق نظام کے بغیر ممکن نہیں لہٰذا آیت کے دوسرے حصے میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا رات کے ذریعے دن کو ڈھانپ دیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے (یغشی الیل النہار)۔

کیونکہ اگر رات کا سکون بخش پردہ نہ ہو تو سورج کا دائمی نور تمام سبزوں اور نباتات کو جلا دے اور صفحۂ زمین پر پھلوں کا بلکہ تمام زندہ موجودات کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔

کرۂ ماہتاب میں اگرچہ دن ہمیشہ نہیں رہتا لیکن وہاں دنوں کی لمبائی کرۂ زمین کے پندرہ رات دن کے برابر اور دن کے وسط میں کرۂ ماہتاب کا درجہ حرارت اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ اگر پانی یا کوئی دوسری بہنے والی چیز ہو تو اُبلنے لگے بلکہ اس کا درجہ حرارت اس سے بھی بڑھ جائے۔ کوئی زندہ موجود کہ جسے ہم زمین پر پہچانتے ہیں عام حالات میں یہ گرمی برداشت نہیں کر سکتا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جو امور بیان کیے گئے ہیں ان میں آیات اور نشانیاں ہیں، ان کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں (ان فی ذلک لاٰیات لقوم یتفکرون)۔

وہ لوگ جو اس بدیع اور تعجب خیز نظام میں سوچ بچار کرتے ہیں —— نور و ظلمت کے نظام میں، آسمانی کرات اور ان کی گردش کے نظام میں، آفتاب و مہتاب کی نور افشانی اور ان کی انسانوں کے لیے خدمت گزاری کے نظام میں، زمین بچھانے کے نظام میں، پہاڑوں اور دریاؤں کی پیدائش کے اسرار میں اور نباتات اور پھلوں کے نظام میں —— جی ہاں! جو لوگ اس نظام میں غور و فکر کرتے ہیں وہ ان میں قدرتِ لایزال کی آیات اور پروردگار کی حکمتِ بے پایاں واضح اور روشن طور پر دیکھتے ہیں۔

زیرِ بحث آخری آیت میں زمین شناسی اور نباتات شناسی کے جاذبِ نظر نکات کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک، ایک حساب شدہ نظامِ خلقت کی نشانی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: زمین میں مختلف قطعات اور ٹکڑے موجود ہیں

Marfat.com

کہ جو ایک دوسرے کے پاس اور ہمسائیگی میں ہیں (و فی الارض قطع متجاورات)[1]

باوجودیکہ یہ سب قطعات ایک دوسرے سے متصل اور مربوط ہیں، ہر ایک کی ساخت اور استعداد خود اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعض محکم ہیں اور بعض نرم، بعض نمکین ہیں اور بعض شیریں اور ان میں سے ہر ایک خاص نباتات، درختوں، پھلوں اور زراعتوں کی پرورش کی استعداد رکھتا ہے۔

انسان اور زمین میں رہنے والے جانداروں کی ضروریات چونکہ بہت زیادہ اور مختلف ہیں لہٰذا زمین کا ہر قطعہ گویا ان میں سے ایک ضرورت کو پورا کرنے کی ماموریت رکھتا ہے اور اگر سب قطعات ایک ہی طرح کے ہوتے یا یہ استعدادیں ان میں صحیح طور پر تقسیم نہ ہوتیں تو انسان غذائی مواد، دواؤں اور دیگر ضروریات کے لحاظ سے کیسی کیسی کمیابیوں میں گرفتار ہوتا لیکن ماموریت کی اس حساب شدہ تقسیم کی وجہ سے اور مختلف قطعات زمین کو پرورش کی مختلف استعدادیں دیئے جانے کے باعث یہ ضروریات مکمل طور پر پوری ہو جاتی ہیں۔

نیز یہ کہ "اسی زمین میں انواع و اقسام کے انگوروں، زراعتوں اور کھجوروں کے باغات اور پودے موجود ہیں" (وجنات من اعناب و زرع و نخیل)[2]۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ درخت اور ان کی مختلف انواع و اقسام کبھی تو ایک ہی پایہ و بنیاد پر اگتی ہیں اور کبھی مختلف پایوں اور بنیادوں پر (صنوان وغیر صنوان)[3]۔

"صنوان" جمع ہے "صنو" کی کہ جو دراصل شاخ کے معنی میں ہے کہ جو درخت کے اصلی تنے سے نکلتی ہے اس بناء پر "صنوان" کا معنی ہے "ایک تنے سے پھوٹنے والی مختلف شاخیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان شاخوں میں سے ہر ایک پھل کی ایک خاص قسم دیتی ہے۔ یہ جملہ درختوں کی پیوند کی استعداد کے مسئلے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ کبھی ایک ہی پایہ اور شاخ پر چند مختلف پیوند لگائے جاتے ہیں اور ان پیوندوں میں سے ایک نشو و نما حاصل کرتا ہے اور اس سے پھل کی ایک خاص قسم حاصل ہوتی ہے۔ مٹی ایک، جڑ ایک اور شاخ ایک لیکن اس کا پھل اور محصول مختلف ہوتا ہے۔

زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ "وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں (یسقی بماء واحد)۔

ان تمام چیزوں کے باوجود" ہم ان میں سے بعض درختوں کو بعض دوسرے درختوں پر پھل کے لحاظ سے برتری اور فضیلت دیتے ہیں"

---

[1] "متجاور" "جار" کے مادہ سے ہمسایہ اور نزدیک کے معنی میں ہے لیکن جب "قطع متجاورات" فرمایا گیا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مختلف قطعات ہیں کہ جو ایک دوسرے کے پاس پاس ہیں۔ اور اگر وہ سب کے سب یکساں ہوتے تو اس تعبیر کا کوئی معنی نہ ہوتا۔

[2] "اعناب" "عنب" کی جمع ہے اور "نخیل" "نخل" کی جمع ہے اور شاید جمع کا صیغہ یہاں انگور اور کھجور کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان دو قسم کے پھلوں میں سے ہر ایک کی شاہد ہیں ذائقے اور رنگ کے اعتبار سے کئی سو اقسام ہیں۔

[3] "صنو" کے لیے ایک اور معنی بھی ذکر ہوا ہے اور وہ ہے "شبیہ" لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معنی بھی مذکورہ بالا معنی سے لیا گیا ہے۔

Marfat.com

(ونفضل بعضها علی بعض فی الاکل)۔

یہاں تک کہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک ہی درخت میں یا ایک ہی شاخ میں ایک ہی جنس کے پھل لگے ہوتے ہیں مگر ان کا ذائقہ اور رنگ مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح پھولوں کی دنیا میں ہم نے بہت دیکھا ہے کہ ایک ہی پودے میں بلکہ ایک ہی شاخ پر بالکل مختلف رنگوں والے پھول اُگے ہوتے ہیں۔

یہ کیسی تجربہ گاہ ہے اور کیسی اسرار آمیز لیبارٹری درختوں کی شاخوں میں لگائی گئی ہے کہ جو بالکل ایک ہی مواد سے بالکل مختلف ترکیبات کو جنم دیتی ہے کہ جن میں سے ہر ایک انسانی ضروریات کے ایک حصے کو پورا کرتی ہے۔

کیا ان اسرار میں سے ہر ایک کسی ایک حکیم و عالم مبداء کے وجود کی دلیل نہیں کہ جو اس نظام کی رہبری کرتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ان امور میں عظمتِ خدا کی نشانیاں ہیں، ان کے لیے جو تعقل اور سوچ بچار رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **توحید اور قیامت میں تعلق:** زیر بحث پہلی آیت کے آغاز میں اسرار خلقت اور توحید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن آیت کے آخر میں ہے:

یفصل الاٰیات لعلکم بلقاء ربکم توقنون

خدا تمہارے لیے اپنی آیات کی تشریح کرتا ہے تاکہ تم قیامت اور معاد پر ایمان لے آؤ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مسئلہ توحید اور مسئلہ معاد کے درمیان کونسا تعلق ہے کہ جس کی بناء پر ان کا ذکر ایک دوسرے کے نتیجے کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ:

اولاً اس جہان کے ایجاد کرنے میں خدا کی قدرت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس کے اعادہ کی بھی قدرت رکھتا ہے، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں ہے:

کما بدأکم تعودون

جیسے اُس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا ہے ویسے ہی پلٹائے گا۔

اور سورہ یٰسٓ کے اواخر میں ہے:

کیا وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ان کی مثل ایجاد کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

ثانیاً جیسا کہ ہم نے معاد و قیامت کی مباحث میں کہا ہے کہ اگر عالم آخرت نہ ہو تو اس جہان کی خلقت فضول اور بے ہودہ ہوگی کیونکہ فقط یہ زندگی اس وسیع جہان کی خلقت کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید معاد سے مربوط آیات (مثلاً سورہ واقعہ آیہ ۶۲) میں کہتا ہے:

Marfat.com

ولقد علمتم النشأة الاولى فلولا تذکرون

تم نے جو اس جہان کو دیکھا تو پھر دھیان کیوں نہیں دیتے کہ یقیناً اس کے بعد ایک اور جہان ہوگا[1]

۲۔ قرآن کے سائنسی معجزات: قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو ایسے سائنسی اسرار کے ایک پہلو سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ جو اس زمانے کے ماہرین کی نظروں سے پوشیدہ تھے اور یہ امر خود قرآنی اعجاز اور عظمت کی نشانی ہے۔ وہ محققین کہ جنہوں نے اعجاز قرآن کے سلسلے میں بحث کی ہے اکثر و بیشتر ان آیات کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ان میں سے ایک آیت سطور بالا میں ذکر ہوئی ہے کہ جو عالم نباتات میں زوجیت اور جفت ہونے کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے عالم نباتات میں زوجیت کا مسئلہ جزوی طور پر تو عرصۂ قدیم سے جانا پہچانا تھا لیکن ایک کلی اور عمومی قانون کے طور پر پہلی مرتبہ یورپ میں اٹھارھویں صدی کے وسط میں ایک اٹلی سائنسدان "لینہ" نے اس کا انکشاف کیا لیکن قرآن مسلمانوں کو ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی قبل اس کی خبر دے چکا تھا۔

یہ مسئلہ سورہ لقمان کی آیہ ۱ میں بھی بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وانزلنا من السماء ماءً فانبتنا فیھا من کل زوج کریم

ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے زمین پر زوج اور جفت سے مفید گیاہ اگایا۔

بعض دوسری آیات میں بھی اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ سورج اور چاند کی تسخیر: ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا کہ خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات ہیں کہ جو کہتی ہیں کہ آسمانی کرات، زمینی موجودات اور رات دن وغیرہ سب انسان کے لیے مسخر ہیں۔ ایک موقع پر ہے:

وسخر لکم الانھار

خدا نے تمہارے لیے دریاؤں کو مسخر کیا ہے۔ (ابراہیم - ۳۲)

ایک اور موقع پر ہے:

وسخر لکم الفلك

تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا ہے۔ (ابراہیم - ۳۲)

ایک اور جگہ پر ہے:

وسخر لکم اللیل والنھار

رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔ (نحل - ۱۲)

ایک اور مقام پر ہے:

---

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

وسخر لکم الشمس والقمر
سورج اور چاند تمہارے لیے مسخر کیے ہیں (ابراہیم - ۳۳)
ایک اور جگہ پر ہے:
وھو الذی سخر البحر لتاکلوا منه لحما طریا
تمہارے لیے دریا مسخر کیا ہے تاکہ اس سے تازہ گوشت کھاؤ۔ (نحل - ۱۴)
ایک اور مقام پر ہے:
الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض
کیا دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے ان تمام چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے جو روئے زمین پر ہیں۔ (حج - ۶۵)
اور ایک موقع پر ہے:
وسخر لکم ما فی السموٰت وما فی الارض جمیعا منه
جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے (جاثیہ - ۱۳)
ان تمام آیات سے مجموعی طور پر اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ:
اولاً انسان اس جہان کا سب سے اکمل اور ترقی یافتہ موجود ہے اور اسلام کی جہان بینی کی نظر سے اسے اس قدر مقام دیا گیا ہے کہ دوسرے تمام موجودات کو اس انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے کہ جو "خلیفة اللہ" ہے اور اس کا دل مقامِ نورِ خدا ہے۔
ثانیاً ان آیات میں تسخیر اس معنی میں نہیں کہ یہ تمام چیزیں انسان کے تحتِ فرمان ہیں بلکہ اس قدر ہے کہ یہ اس کے فائدے اور منافع کے لیے اور اس کی خدمت کے لیے حرکت کر رہے ہیں۔
مثلاً—آسمانی کرات اس کے لیے نور افشانی کرتے ہیں یا ان سے دیگر فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ اس کی تسخیر میں ہیں۔
کوئی مکتب و مذہب اس قدر بلند انسانی مقام کا قائل نہیں اور کسی فلسفہ میں انسان یہ حیثیت اور مقام نہیں رکھتا— اور یہ دین اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے انسانی وجود کی اہمیت اس حد تک بلند کر دی ہے کہ جس سے آگاہی انسانی تربیت اور ارتقا کے لیے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے کیونکہ جب انسان یہ سوچے کہ خدا نے یہ تمام عظمتیں اسے بخشی ہیں اور—
ابر و باد و ماہ و خورشید در کارند
یعنی— بادل، ہوا، چاند اور سورج سب محوِ کار ہیں اور سب اس کے فرماں بردار اور خدمت گزار ہیں۔
ایسا انسان غفلت اور پستی کے لیے تیار نہیں ہوتا، اپنے آپ کو خواہشات و شہوات کا اسیر نہیں کرتا اور ثروت و مقام اور زر و زور کا غلام نہیں بنتا— وہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آسمانوں کی اوج پر پرواز کرتا ہے۔
کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سورج اور چاند انسان کے مسخر نہیں ہیں حالانکہ وہ اپنی نور افشانی سے حیاتِ انسانی کو روشن اور گرم کیے ہوئے ہیں۔ اگر سورج کی روشنی نہ ہو تو کرۂ ارض پر کوئی جنبش و حرکت نہ ہو۔
دوسری طرف سورج کی قوت جاذبہ زمین کی حرکت کو اس کے مدار میں منظم کرتی ہے۔

Marfat.com

دریاؤں اور سمندروں کا مدوجزر چاند کی مدد سے پیدا ہوتا ہے کہ جو خود بہت سی برکات اور منافع کا سرچشمہ ہے۔
کشتیاں، دریا، نہریں اور دن رات ہر ایک کسی نہ کسی طرح انسان کی خدمت کرتے ہیں اور اس کے فائدے کے لیے رواں دواں ہیں۔
ان تسخیرات اور ان کے حساب شدہ نظام میں غور وفکر کیا جائے تو یہ خالق کی عظمت، قدرت اور حکمت کی واضح دلیل ہیں۔

Marfat.com

۵۔ وَاِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ○

۶۔ وَیَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبۡلَ الۡحَسَنَةِ وَقَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمُ الۡمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلۡمِهِمۡ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ○

ترجمہ

۵۔ اور اگر تو (کسی چیز پر) تعجب کرنا چاہتا ہے تو ان کی گفتگو عجیب ہے کہ جو کہتے ہیں کہ کیا جس وقت ہم مٹی ہوگئے تو ہم دوبارہ زندہ ہوں گے اور کیا) ہم نئی خلقت کے ساتھ پلٹ آئیں گے۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو اپنے پروردگار سے کافر ہوگئے ہیں اور یہ وہ ہیں جن کی گردن میں زنجیریں اور یہ اہل نار ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

۶۔ وہ تجھ سے حسنہ (اور رحمت) سے پہلے جلدی سے سیئہ (اور عذاب) کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے عبرت انگیز بلائیں اور مصیبتیں نازل ہوئی ہیں اور اگرچہ لوگ ظلم کرتے ہیں تیرا پروردگار ان کے لیے صاحبِ مغفرت ہے اور تیرا پروردگار عذابِ شدید بھی رکھتا ہے۔

تفسیر

قیامت کے بارے میں کافروں کا تعجب

عظمتِ الٰہی کی نشانیوں کے بارے میں جو آیات گزری ہیں ان کے بعد زیرِ بحث پہلی آیت میں مسئلہ معاد پیش کیا گیا ہے اور مسئلہ مبداء و معاد میں جو خاص ربط اور تعلق ہے اس کی بنیاد پر اس بحث کو پختگی دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اگر تم کسی چیز پر تعجب کرنا چاہتے ہو تو ان کی اس بات پر تعجب کرو کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں نئی خلقت دی جائے گی (و ان تعجب فعجب قولهم

Marfat.com

ءاذا کنا ترابًا ءانا لفی خلق جدید)۔[1]

یہ وہی تعجب ہے جو تمام جاہل قوموں کو مسئلہ معاد کے بارے میں تھا۔ وہ موت کے بعد حیاتِ نو اور خلقتِ جدید کو محال سمجھتے تھے حالانکہ گزشتہ آیات میں اور دیگر قرآنی آیات میں اس مسئلے کا اچھی طرح سے جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ آغازِ خلقت اور تجدیدِ خلقت میں کیا فرق ہے۔ وہ ذات جو آغازِ خلقت میں انہیں پیدا کرنے پر قادر تھی وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کے بدن کو حیاتِ نو عطا کرے۔ گویا یہ اپنی خلقت کی ابتدا کو بھول چکے ہیں تبھی تو اس کی تجدید کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن ان لوگوں کی موجودہ کیفیت اور انجام کو تین جملوں میں بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے کافر ہوگئے ہیں (اولئك الذین کفروا بربھم)۔ کیونکہ اگر یہ لوگ خدا کو اور اس کی ربوبیت کو قبول کرتے تو پھر معاد اور تجدیدِ حیاتِ انسانی کے بارے میں شک نہ کرتے لہٰذا مسئلہ معاد میں ان کی خرابی مسئلہ توحید و ربوبیتِ الٰہی کے بارے میں ان کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

دوسرا یہ کہ کفر اور بے ایمانی اختیار کرنے کی وجہ سے اور توحید کے پرچم آزادی کے سائے سے نکل جانے کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو طوق و زنجیر میں گرفتار کر لیا ہے۔ انہوں نے بت پرستی، ہوس پرستی، مادہ پرستی اور جہالت و خرافات کے طوق اپنے ہاتھوں اپنی گردن میں ڈالے ہیں" اور ان کی گردن میں یہ طوق ہیں" (واولئك الاغلال فی اعناقھم)۔

"اس کیفیت اور اس کردار کی وجہ سے ایسے لوگ یقیناً اہل دوزخ ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے" اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی نتیجہ اور توقع نہیں ہے (واولئك اصحاب النار ھم فیھا خلدون)۔

بعد والی آیت میں مشرکین کی ایک اور غیر منطقی بات پیش کی گئی ہے۔ فرمایا: بجائے اس کے کہ وہ تیرے ذریعے خدا سے رحمت کا تقاضا کرتے عذاب، کیفرِ کردار اور سزا میں تعجیل کا تقاضا کرتے ہیں (ویستعجلونك بالسیئة قبل الحسنة)۔

یہ قوم اس قدر ہٹ دھرم اور جاہل کیوں ہے۔ یہ لوگ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اگر تو سچ کہتا تو ہم پر اس طرح یا اُس طرح رحمتِ خدا نازل کرا۔ الٹا کہتے ہیں کہ اگر تیری بات سچی ہے تو ہم پر عذابِ خدا نازل کر۔

کیا اُن کا خیال ہے کہ خدا کی سزا اور عذاب کی بات غلط ہے" حالانکہ گزشتہ زمانوں میں سرکش امتوں پر عذاب نازل ہوئے" جن کی خبریں صفحاتِ تاریخ پر اور زمین کے دل پر ثبت ہیں (وقد خلت من قبلھم المثلٰت)۔[2]

---

[1] "ان تعجب فعجب قولھم"۔ اس جملے کا درحقیقت یہ معنی ہے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں تعجب کرے تو ان کی بات پر تعجب کر کیونکہ یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے اور "فعجب قولھم" دراصل جملہ شرطیہ کی جزا ہے۔
مندرجہ بالا جملے کے بارے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے: اگر ان کی بت پرستی پر تعجب کرتے ہو تو صرف یہی باعثِ تعجب نہیں بلکہ ان کی طرف سے معاد کا انکار بھی باعثِ تعجب ہے۔
البتہ پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[2] "مَثُلَات"، "مَثُلَة" کی جمع ہے۔ یہ بلاؤں اور سزاؤں کے معنی میں ہے جو گزشتہ امتوں پر اس طرح سے نازل ہوئیں کہ ضرب المثل ہو گئیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: لوگوں کی برائیوں، قباحتوں اور ظلم وستم کے مقابلے میں خدا صاحب مغفرت ہے اور شدید العقاب بھی ہے (وان ربك لذو مغفرة للناس علىٰ ظلمهم وان ربك لشديد العقاب)۔

اس کی شدتِ عقاب وسزا اس کی رحمت عام کے لیے ہرگز رکاوٹ نہیں جیسا کہ اس کی رحمتِ عام شدتِ عقاب وسزا میں رکاوٹ نہیں ہے۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ظالموں کو موقع دیتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں کریں کیونکہ ایسے مواقع پر تو وہ شدید العقاب ہے۔ پروردگار کی یہ دو صفات یعنی "ذو مغفرة" اور "شديد العقاب" کے آثار کا تعلق خود انسان کے وجود سے ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **خلقتِ نو کے بارے میں تعجب کیوں؟** قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی مشکلات میں سے ایک مشرک قوموں کے سامنے معادِ جسمانی کے اثبات کا مسئلہ تھا کیونکہ وہ لوگ ہمیشہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ کس طرح سے انسان مٹی ہونے کے بعد دوبارہ حیات کی طرف پلٹ آئے گا۔ یہ جو محلِ بحث آیات میں ہے:

ءاذا كنا ترابا ءانا لفي خلق جديد

کیا جب ہم مٹی ہو جائیں تو دوبارہ حیاتِ نو پائیں گے۔

ایسی ہی تعبیرات تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن کی سات دیگر آیات میں موجود ہیں، جو یہ ہیں:

مومنون — ۳۵، مومنون — ۸۲، نمل — ۶۷، صٰفٰت — ۱۶، صٰفٰت — ۵۳، قٓ — ۳ اور واقعہ — ۴۷۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اعتراض ان کی نگاہ میں بہت ہی اہم تھا۔ تبھی تو ہر جگہ اسی کا سہارا لیتے تھے لیکن قرآن مجید بہت ہی مختصر عبارتوں میں انہیں دوٹوک اور قاطع جواب دیتا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں:

كما بدأكم تعودون

جیسا کہ ابتدا میں تمہیں پیدا کیا گیا ہے اسی طرح پھر لوٹائے جاؤ گے۔

چند الفاظ میں یہ ایک دندان شکن جواب ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

وهو اهون عليه

تمہاری بازگشت تو تمہارے آغاز سے بھی سادہ اور آسان ہے۔ (روم — ۲۷)

کیونکہ ابتدا میں تم کچھ بھی نہیں تھے لیکن اب کم از کم بوسیدہ ہڈی یا مٹی کی صورت میں تو تم موجود ہو۔

بعض مقامات پر قرآن لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر وسیع کائنات زمین و آسمان میں عظمت قدرتِ خدا کا مشاہدہ کرواتا ہے اور کہتا ہے:

کیا وہ ذات جو یہ سب کرات، کہکشائیں، ثوابت اور سیارے پیدا کر سکتی ہے اس کے اعادہ پر قادر نہیں ہے۔ (یٰسین - ۸۱)

۲۔ **کیا خدا ستمگروں کو بخش دیتا ہے:** مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ پروردگار لوگوں کے ظلم کے باوجود صاحبِ مغفرت و بخشش ہے۔ مسلم ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا اپنی عفو و بخشش ان ظالموں کے شاملِ حال کرتا ہے جو اپنے ظلم پر اصرار کرتے ہیں

Marfat.com

بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ظالموں کو بھی اس وسیلے سے بازگشت اور اپنی اصلاح کا امکان فراہم کرے ورنہ دوسرے جملے میں ان کے انجام کی طرف اشارہ موجود ہے کہ "تیرا پروردگار شدید العقاب ہے"۔

ضمناً اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہانِ کبیرہ (کہ جن میں سے ایک ظلم ہے) بھی قابل بخشش ہیں (تمام تر شرائط کے ساتھ)۔ یہ آیت اور اس جیسی دیگر آیات اس غلط بات کا دو ٹوک اور قاطع جواب دیتی ہے جو قدیم زمانے سے معتزلہ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے کہ جو کہتے ہیں کہ گناہانِ کبیرہ کبھی بھی نہیں بخشے جائیں گے۔

بہر حال پروردگار کی "وسیع مغفرت" اور اس کے "شدید عقاب" کا ذکر درحقیقت سب کو میانہ راہ پر اور خوف و رجا کے درمیان لاتا ہے کہ جس کا اہم عامل انسان کی تربیت ہے کہ نہ بالکل رحمتِ الٰہی سے مایوس ہو جائے چاہے اس کا جرم سنگین بھی ہو اور نہ ہی کبھی اپنے آپ کو اس کی سزا سے مامون سمجھے چاہے اس کا گناہ خفیف ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے روایت ہے:

لولا عفو الله و تجاوزه ما هنا احدا العيش، و لولا وعيد الله و عقابه لاتكل كل واحد

اگر خدا کی عفو و بخشش نہ ہوتی تو زندگی ہرگز کسی کے حلق میں گوارا نہ ہوتی اور اگر خدائی تہدیدیں اور سزائیں نہ ہوتیں تو ہر شخص اس کی رحمت کے نام پر جو چاہتا انجام دیتا۔[1]

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ گناہ انجام دیتے ہوئے بڑے غرور سے کہتے ہیں کہ "خدا کریم ہے" درحقیقت انہوں نے خدا کے کرم پر بھروسہ نہیں کیا وہ جھوٹ بولتے ہیں اور اصل میں وہ پروردگار کی سزا اور عذاب سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان صفحہ ۲۷۸ جلد ۵ و ۶ زیر بحث آیت کے ذیل میں، تفسیر قرطبی جلد ۶ صفحہ ۳۵۱۴۔

Marfat.com

۷۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

ترجمہ

۷۔ اور وہ جو کافر ہوگئے کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر آیت (اور معجزہ) کیوں نازل نہیں ہوا۔ تُو تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر گروہ کے لیے ہدایت کرنے والا ہوتا ہے (اور یہ تو سب بہانے ہیں نہ کہ حقیقت کی جستجو)۔

تفسیر

پھر بہانہ سازی

گزشتہ آیات میں کچھ اشارے مسئلۂ توحید کے متعلق کیے گئے ہیں اور ایک اشارہ مسئلۂ معاد کی طرف کیا گیا ہے۔ اس کے بعد زیرِ بحث آیت میں ہٹ دھرم مشرکین کی طرف سے "نبوت" کے بارے میں ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کفار کہتے ہیں: اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں کوئی معجزہ اور نشانی نازل نہیں ہوئی (ویقول الذین کفروا لولا انزل علیه اٰیة من ربه)۔

واضح ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی حقانیت کی سند کے طور پر اور وحی الٰہی سے اپنے تعلق کے ثبوت میں معجزات پیش کرے اور متلاشیانِ حق نبوت کی دعوت میں شک و تردد کے موقع پر حق رکھتے ہیں کہ معجزے کا مطالبہ کریں لیکن اگر نبوت کے دلائل دوسرے طریقے سے آشکار اور واضح ہوں تو پھر وہ حق نہیں رکھتے لیکن ایک نکتے کی طرف بھرپور توجہ کرنا چاہیے کہ مخالفینِ انبیاء ہمیشہ حسنِ نیت کے حامل نہیں ہوتے تھے یعنی معجزات حق معلوم کرنے کے لیے طلب نہیں کرتے تھے بلکہ ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کے لیے بھی ہر وقت معجزے اور عجیب و غریب خارقِ عادت کا تقاضا کرتے تھے۔ ایسے معجزات کہ جنہیں "معجزاتِ اقتراحی" کہا جاتا ہے ہرگز کشفِ حقیقت کے لیے نہیں تھے۔ اسی لیے انبیاء ان کا تقاضا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت ان ہٹ دھرم کفار کا یہ خیال تھا کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دعویٰ ہے کہ میں ہر چیز انجام دینے پر قادر ہوں اور معجزہ گر ہوں اور یہاں بیٹھا ہوں جو شخص بھی کسی معجزے کا تقاضا کرے گا وہ پیش کردوں گا۔

لیکن انبیاء یہ حقیقت بیان کرکے ایسے لوگوں کی خواہشات ٹھکرا دیتے تھے کہ معجزات خدا کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے حکم سے انجام پاتے ہیں اور ہماری ذمہ داری لوگوں کی تعلیم و تربیت ہے۔

اسی لیے زیرِ بحث آیت میں ہے کہ خدا تعالیٰ اس گفتگو کے بعد فرماتا ہے: اے پیغمبر! تُو تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم و ملت

Marfat.com

کے لیے ہادی و راہنما ہوتا ہے (انما انت منذر و لکل قوم ھاد)۔

دو سوال اور ان کے جواب

۱۔ **کافروں کا جواب کیسے ہوا؟** سوال پیدا ہوا کہ "انما انت منذر و لکل قوم ھاد" کس طرح کافروں کی معجزہ طلبی کا جواب ہو سکتا ہے۔

جو بات مندرجہ بالا سطور میں کہی گئی ہے اس کی طرف توجہ دینے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر ایک ایسی شخصیت نہیں کہ ہر تقاضے، ہر مقصد اور ہر مراد کے لیے معجزہ ایجاد کر دے۔ پہلے تو اس کی ذمہ داری ہے "انذار" اور انہیں ڈرانا جو بے راہ چلتے ہیں اور صراطِ مستقیم کی دعوت دینا۔ البتہ جس مقام پر انذار اور ڈرانے کی تکمیل کے لیے اور گمراہوں کو صراطِ مستقیم پر لانے کے لیے معجزے کی ضرورت ہو مسلم ہے کہ پیغمبر کوتاہی نہیں کرے گا۔ البتہ ان ہٹ دھرم لوگوں کے جواب میں ہرگز اس کی ایسی کوئی ذمہ داری نہیں جو بالکل راستے پر نہیں آتے۔

دراصل قرآن کہتا ہے کہ یہ کفار پیغمبر کی اصلی ذمہ داری بھول چکے ہیں اور وہ ہے انذار، ڈرانا اور خدا کی طرف دعوت دینا اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی بنیادی ذمہ داری معجزہ دکھانا ہے۔

۲۔ **"لکل قوم ھاد" سے کیا مراد ہے؟** کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ دونوں صفات "منذر" اور "ہادی" پیغمبر اکرمؐ کی طرف لوٹتی ہیں۔ ان کے خیال میں دراصل یہ جملہ یوں ہے:

انت منذر و ھاد لکل قوم

تو ہر قوم اور ہر گروہ کے لیے ڈرانے والا اور ہادی ہے۔

لیکن یہ تفسیر مندرجہ بالا آیت کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ واؤ نے "لکل قوم ھاد" کو "انما انت منذر" سے جدا کر دیا ہے۔ ہاں البتہ اگر لفظ "ھاد" "لکل قوم" سے پہلے ہوتا تو یہ معنی پورے طور پر قابلِ قبول تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں مقصد یہ تھا کہ حق کی طرف دعوت کرنے والوں کی دو قسمیں بیان کی جائیں۔ پہلی قسم ان دعوت کرنے والوں کی جو انذار کریں اور ڈرائیں اور دوسری قسم ان دعوت کرنے والوں کی جو ہدایت کریں۔

حتماً آپ سوال کریں گے کہ "انذار اور "ہدایت" میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "انذار" اس لیے ہے کہ گمراہی اور بے راہ روی سے راستے کی طرف پلٹایا جائے اور صراطِ مستقیم پر پہنچایا جائے لیکن "ہدایت" اس لیے ہے کہ لوگوں کو راستے پر آ جانے کے بعد آگے لے جایا جائے۔

حقیقت میں "منذر" "علت محدثة" یعنی ایجاد کرنے والے سبب" کی طرح ہے اور "ہادی" "علت مبقیة" یعنی باقی رکھنے والے اور آگے لے جانے والے سبب" کی مانند ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم "رسول" اور "امام" سے تعبیر کرتے ہیں۔ رسولِ شریعت کی بنیاد رکھتا ہے اور امام شریعت کا محافظ اور نگہبان ہے (اس میں شک نہیں کہ دیگر مواقع پر خود ذاتِ پیغمبر پر لفظ "ہادی" کا اطلاق ہوا ہے لیکن زیرِ بحث آیت میں "منذر" کے ذکر کے قرینے سے ہم سمجھتے ہیں کہ "ہادی" سے یہاں مراد وہ شخص ہے جو راہِ پیغمبر کو جاری و ساری

Marfat.com

رکھے اور اس کی شریعت کا محافظ و نگہبان ہو)۔

متعدد روایات کہ جو پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہیں اور شیعہ سنی کتب میں موجود ہیں ان میں آپ نے فرمایا ہے کہ:

میں منذر ہوں اور علی ہادی ہیں۔

یہ روایات مندرجہ بالا تفسیر کی مکمل طور پر تائید کرتی ہیں۔ چند ایک روایات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) اسی آیت کے ذیل میں فخرالدین رازی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں:

وضع رسول الله يده على صدره فقال انا المنذر، ثم اومأ الى منكب عليؑ وقال انت الهادي بك يهتدي المهتدون من بعدي

رسول اللہ نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر مارا اور فرمایا: میں منذر ہوں۔ پھر علی کے کندھے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا تو ہادی ہے اور تیرے ذریعے میرے بعد ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے۔[1]

یہ روایت اہل سنت کے مشہور عالم علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں، اسی طرح علامہ ابن صباغ مالکی نے "فصول المہمہ" میں، گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب میں، طبری نے اپنی تفسیر میں، ابو حیان اندلسی نے اپنی تفسیر "بحر المحیط" میں، علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح دیگر بہت سے علماء نے نقل کی ہے۔

(۲) حموینی جو اہل سنت کے مشہور عالم ہیں اپنی کتاب "فرائد السمطین" میں ابو ہریرہ اسلمی سے اس طرح نقل کرتے ہیں:

ان المراد بالهادي علي (ع)

ہادی سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔

(۳) "حبیب السیر" کے مؤلف میر غیاث الدین اپنی کتاب کی دوسری جلد صفحہ ۱۲ پر اس طرح لکھتے ہیں:

قد ثبت بطرق متعددة انه لما نزل قوله تعالى "انما انت منذر ولكل قوم هاد" قال لعلي "انا المنذر وانت الهادي بك يا علي يهتدي المهتدون من بعدي"۔

متعدد طرق سے نقل ہوا ہے کہ جب آیت "انما انت منذر ولكل قوم هاد" نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم نے حضرت علی سے فرمایا: "میں منذر ہوں اور تو ہادی ہے اور میرے بعد ہدایت پانے والوں کی تیرے ذریعے ہدایت ہوگی"۔

آلوسی نے "روح المعانی" میں، شبلنجی نے "نورالابصار" میں اور شیخ سلیمان قندوزی نے "ینابیع المودۃ" میں یہی حدیث انہی الفاظ میں یا اس کے قریب قریب الفاظ میں نقل کی ہے۔

اکثر روایات میں اس حدیث کے راوی اگرچہ ابن عباس ہیں تاہم یہ روایت ابن عباس میں منحصر نہیں ہے بلکہ حموینی کی نقل کے مطابق خود حضرت علیؑ سے بھی مروی ہے، آپ فرماتے ہیں:

المنذر النبي والهادي رجل من بني هاشم يعني نفسه

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۹ صفحہ ۱۴۔

Marfat.com

مسند پیغمبرؐ میں ہادی بنی ہاشم میں سے ایک شخص ہے کہ اس سے مراد خود آپ کی ذات ہے[1]

اس حدیث میں اگرچہ مسئلہ ولایت اور خلافتِ بلافصل کی تصریح نہیں کی گئی تاہم اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہدایت اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے حضرت علیؑ میں منحصر نہ تھی بلکہ تمام سچے علماء اور رسول اللہ کے خاص اصحاب یہ کام انجام دیتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ "ہادی" کے طور پر حضرت علیؑ کا تعارف آپ کے خاص امتیاز اور خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ آپؑ بہترین اور افضل ترین ہادی کے مصداق ہیں اور اس قسم کا مطلب ولایت اور خلافتِ پیغمبرؐ سے جدا نہیں ہو سکتا۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب نفیس "احقاق الحق"، جلد ۳ صفحہ ۸۷ سے بعد اور مختلف شیعہ سنی حضرات کی تفاسیر کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

۸۔ اَللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ کُلُّ اُنۡثٰی وَ مَا تَغِیۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَ مَا تَزۡدَادُ ؕ وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ ○

۹۔ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ الۡکَبِیۡرُ الۡمُتَعَالِ ○

۱۰۔ سَوَآءٌ مِّنۡکُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ وَ مَنۡ جَہَرَ بِہٖ وَ مَنۡ ہُوَ مُسۡتَخۡفٍۭ بِالَّیۡلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّہَارِ ○

ترجمہ

۸۔ خدا ان تمام جنینوں سے آگاہ ہے جن کا ہر مادہ انسان یا مادہ جانور حامل ہے اور جسے رحم کم کرتے ہیں (اور مقررہ مدت سے پہلے جنتے ہیں) اور جسے زیادہ کرتے ہیں اور اُس کے ہاں ہر چیز کی مقدار معین ہے۔

۹۔ وہ غیب و شہود سے آگاہ ہے اور بزرگ و متعال ہے۔

۱۰۔ اُسے فرق نہیں پڑتا کہ تم میں سے کچھ پنہاں گفتگو کرتے ہیں یا آشکار اور وہ جو رات کو خفیہ حرکت کرتے ہیں یا دن کی روشنی میں۔

تفسیر

خدا کا بے پایاں علم

ان آیات میں پروردگار کی کچھ صفات بھی ہیں اور یہ آیات توحید اور معاد کی بحث کی تکمیل بھی کرتی ہیں۔ یہاں پروردگار کے وسیع علم اور ہر چیز کے بارے میں اس کی آگاہی کے متعلق گفتگو ہے۔ وہی علم جو نظامِ آفرینش، عجائباتِ خلقت اور دلائلِ توحید کا سرچشمہ ہے۔ وہی علم جو قیامت اور اُس کی عظیم عدالت کی بنیاد ہے۔ ان آیات میں علم کے دونوں پہلوؤں (نظامِ آفرینش کا علم اور بندوں کے اعمال کا علم) کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے، خدا ان جنینوں (جو بچے شکمِ مادر میں ہوتے ہیں) سے آگاہ ہے کہ جنہیں ہر عورت اور ہر مادہ جانور (اپنے شکم میں اُٹھائے) ہوتا ہے (اللہ یعلم ما تحمل کل انثٰی)۔

Marfat.com

اور اسی طرح انہیں بھی جانتا ہے جنہیں رحم وقت مقررہ سے پہلے جنم دیتے ہیں (و ما تغیض الارحام)[1]
اور یونہی ان سے بھی باخبر ہے جنہیں رحم وقت مقررہ سے زیادہ روک رکھتے ہیں (وما تزداد)۔
مندرجہ بالا تین جملوں کی تفسیر کے بارے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔
جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے بعض مفسرین حمل کی تین قسموں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ یعنی کبھی وہ وقت مقررہ پر پیدا ہوتا ہے، کبھی وقت سے پہلے (گویا درکار وقت کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے) اور کبھی وقت مقررہ کے بعد۔ خدا ان تمام کو جانتا ہے۔ وہ جنین کی تاریخ تولد اور لمحۂ ولادت سے بے کم و کاست آگاہ ہے اور یہ ایسے امور میں سے ہے جسے کوئی شخص اور کوئی مشینری حتماً معین نہیں کر سکتی۔ یہ علم پروردگار کی ذات پاک سے مخصوص ہے اور اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ رحموں اور جنینوں کی استعداد بالکل مختلف ہوتی ہے اور کوئی شخص بھی ان اختلافات سے حتماً اور کاملاً آگاہ نہیں ہے۔
بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تین جملے حمل کے دنوں میں رحم کی مختلف حالتوں کی طرف اشارہ ہیں۔ پہلا جملہ خود جنین کی طرف اشارہ ہے کہ رحم اسے محفوظ کر لیتا ہے۔ دوسرا جملہ خونِ حیض کی طرف اشارہ ہے جو رحم میں گرتا ہے اور جنین اسے جذب کر لیتا ہے، اسے چوستا ہے اور اسے نگل لیتا ہے اور تیسرا جملہ اضافی خون کی طرف اشارہ ہے جو حمل کے دنوں میں کبھی کبھار باہر گرتا ہے یا ولادت کے وقت یا اس کے بعد رحم سے الگ ہوتا ہے۔[2]
آیت کی تفسیر کے سلسلے میں دیگر احتمالات بھی ذکر کیے گئے ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی مختلف ہونے کے باوجود دوسرے سے متضاد نہیں ہے اور ہو سکتا ہے یہ آیت ان تمام تفاسیر کی طرف اشارہ ہو اگرچہ ظاہری مفہوم وہی ہے جو پہلی تفسیر کے ضمن میں پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ لفظ "تحمل" جنین کے اٹھانے کا معنی دیتا ہے اور اس کے قرینے سے "تغیض" اور "تزداد" کے الفاظ دورانِ حمل کی کمی اور بیشی کی طرف اشارہ ہیں۔
ایک حدیث جو امام محمد باقر علیہ السلام یا امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے، اس طرح ہے:
الغیض کل حمل دون تسعۃ اشہر، وما تزداد کل شیء یزداد علی تسعۃ اشہر
"غیض" ہر اس حمل کو کہتے ہیں جس کی مدت ۹ ماہ سے کم ہو اور "ما تزداد" ہر وہ چیز ہے جو ۹ ماہ سے زیادہ ہو۔
اس حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں:
و کلما رأت المرأۃ الدم الخالص فی حملها فانها تزداد و بعدد الایام التی زاد فیها فی حملها من الدم

---

[1] "تغیض"، "غیض" کے مادہ سے ہے۔ یہ اصل میں بہنے والی چیز کو نگل جانے اور اسے ٹھہرا لینے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے یہ لفظ نقصان اور فساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ "غیض"، ایسے مکان اور جگہ کو کہا جاتا ہے جس میں پانی کھڑا ہو جائے اور اسے نگل جائے۔ "لیلۃ غائضۃ" تاریک رات کے معنی میں ہے یعنی ایسی رات جو سارا نور نگل گئی ہو۔

[2] تفسیر المیزان میں آیت کی اس تفسیر کی تائید کے ضمن میں صاحب تفسیر فرماتے ہیں کہ آئمہ اہل بیتؑ کی بعض روایات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں اور جو کچھ ابن عباس سے نقل ہوا ہے وہ بھی احتمالاً اسی معنی پر منطبق ہوتا ہے۔
لیکن جو روایات تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ذیل میں آئمہ اہل بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں وہ زیادہ تر اسی پہلے معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جو ہم متن میں ذکر کر چکے ہیں۔

Marfat.com

جب عورت حمل کی حالت میں خالص خون دیکھے تو اس خون کے ایام کی تعداد کے برابر حمل کی مدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ہر چیز خدا کے ہاں معین مقدار کی حامل ہے (وکل شیء عندہ بمقدار)۔ کہیں یہ خیال نہ ہو کہ مدت حمل کی یہ کمی بیشی بغیر کسی حساب کتاب کے اور بغیر کسی سبب کے ہے بلکہ اس مدت کی ہر گھڑی اور ہر لحظہ ناپا تلا ہے۔

بعد والی آیت درحقیقت گذشتہ آیت میں بیان کی گئی بات کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا غیب و شہود (اور پنہاں و آشکار) سب کو جانتا ہے (عالم الغیب والشہادۃ)۔

غیب و شہود کے بارے میں اس کی آگاہی اس بناء پر ہے کہ "وہ بزرگ و برتر ہے، ہر چیز کے لیے متعال ہے اور ہر چیز پر مسلط ہے" اسی بناء پر وہ ہر جگہ حاضر ہے اور کوئی چیز اس کی نگاہِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے (الکبیر المتعال)۔

اس بحث کی تکمیل کے لیے اور اس کے علم بے پایاں کے بارے میں تاکید کے لیے مزید فرمایا گیا ہے "خدا کے لیے ان لوگوں میں کوئی فرق نہیں کہ جو اپنی بات چھپاتے ہیں اور وہ جو آشکار کرتے ہیں وہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے (سواء منکم من اسر القول ومن جھر بہ)۔

نیز اس کے لیے ان لوگوں میں کچھ فرق نہیں کہ جو خفیہ طور پر رات کی تاریکی میں اور ظلمت کے پردوں میں قدم اٹھاتے ہیں اور وہ کہ جو آشکارا روز روشن میں اپنے کاروبار کے لیے نکلتے ہیں (ومن ھو مستخف باللیل وسارب بالنھار)۔[2]

اصولی طور پر اس شخص کے لیے نور و ظلمت، تاریکی و روشنی اور غیب و شہود کوئی مفہوم نہیں رکھتے جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ یکساں طور پر ان سب سے آگاہ اور باخبر ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **قرآن اور جنین شناسی:** قرآن مجید میں بارہا جنین، اس کے عجائب و غرائب اور نظام کی طرف توحید، خداشناسی اور حضرت حق کے علم بے پایاں کی ایک دلیل کے طور پر اشارہ ہوا ہے۔ البتہ جنین شناسی ایک بالکل نیا علم ہے۔ گذشتہ زمانے میں علماء اور سائنسدان جنین اور اس کے مختلف مراحل کے بارے میں بہت محدود اطلاعات رکھتے تھے لیکن علم اور سائنس کی پیش رفت کے ساتھ اس علم میں تیزی سے غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اور اس خاموش اور بے آواز دنیا کے بہت سے اسرار و عجائب منکشف ہوئے ہیں اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ جنین کی خلقت، اس کے تحول و تکامل میں خداشناسی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

اس موجود کی کون خبر پا سکتا ہے جو ہر کسی کی دسترس سے باہر ہو قرآنی الفاظ میں جو "ظلمات ثلاث" (تین تاریکیوں) میں موجود ہو اور جس کی زندگی انتہائی ظریف اور دقیق ہو۔ کون اسے ضروری مقدار میں غذا بہم پہنچا سکتا ہے اور کون تمام مراحل میں اس کی ہدایت کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں جب خدا فرماتا ہے کہ "خدا جانتا ہے کہ ہر مادہ جانور کے رحم میں کیا ہے" تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ صرف اس کی جنسیت (یعنی نر یا مادہ ہونے) کے بارے میں آگاہ ہے بلکہ اس کی تمام مشخصات، استعداد، ذوق اور طاقت کہ جو بالقوۃ اس میں پوشیدہ ہے کے متعلق آگاہ ہے

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۴۸۵۔

[2] "سارب" اصل میں "سرب" (بروزن "ضرب") کے مادہ سے "جاری پانی" کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں یہ لفظ اس انسان کے بارے میں استعمال ہونے لگا جو کسی کام کے پیچھے چل پڑے۔

Marfat.com

اور یہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص کسی بھی ذریعے سے آگاہی حاصل نہیں کرسکتا۔

اس بناء پر جنین میں حساب شدہ نظاموں کی موجودگی اور دقیق و پیچیدہ ارتقاء میں اس کی راہبری ایک عالم و قادر مبداء کے بغیر ممکن نہیں۔

۲۔ ہر چیز کی ایک حد اور مقدار ہے: قرآن مجید کی مختلف آیات میں ہے کہ ہر چیز کی ایک حد ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتی

سورہ طلاق آیہ ۳ میں ہے:

قد جعل اللّٰہ لکل شیءٍ قدرا

خدا نے ہر چیز کے لیے ایک مقدار معین کی ہے

سورہ حجر آیہ ۲۱ میں ہے:

وان من شیءٍ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم

ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ایک معین مقدار کے سوا نازل نہیں کرتے۔

زیر بحث آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے:

و کل شیءٍ عندہٗ بمقدار

اور تمام چیزوں کی اس کے ہاں ایک مقدار ہے۔

یہ سب آیات اس امر کی طرف اشارہ ہیں کہ اس عالم کی کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے یہاں تک کہ طبیعی دنیا میں جن موجودات کو ہم بغیر حساب کتاب کے فرض کرتے ہیں وہ سب دقیق اور جچا تلا حساب رکھتی ہیں چاہے ہم اسے جانیں یا نہ جانیں۔ اصولی طور پر خدا کے حکیم ہونے کا بھی اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں کہ ہر چیز کی خلقت میں ایک پروگرام، حد اور مقدار معین ہوتی ہے۔ جن اسرار خلقت کو ہم نے آج علوم کے ذریعے معلوم کیا ہے وہ اس حقیقت کی پورے طور پر تاکید کرتے ہیں۔ مثلاً انسان کا خون کہ جو اس کے وجود کی زندگی کا سب سے اہم مادہ ہے اور جو تمام ضروری مواد کو انسانی بدن کے تمام خلیوں تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے بیس سے زیادہ عناصر کا مرکب ہے۔ ان عناصر کا تناسب اور کیفیت اس قدر دقیق اور جچی تلی ہے کہ اس میں تھوڑے سے تغیر سے بھی انسانی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدن کی خرابیوں کو پہچاننے کے لیے فوراً خون ٹیسٹ کرتے ہیں اور شوگر، چربی، اورہ، آئرن اور دیگر اجزائے ترکیبی کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور ان اجزاء کی کمی بیشی سے فوراً بدن کی بیماریوں کے علل و اسباب معلوم کر لیے جاتے ہیں۔

ان کا خون ہی ایسی دقیق ترکیب نہیں رکھتا بلکہ یہی صورت تمام عالم ہستی کی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھار وہ چیزیں جنہیں ہم عالم ہستی کی بے نظمیاں خیال کرتے ہیں دراصل ہمارے علم کی نارسائی اور ناپختگی سے مربوط ہیں۔ ایک موحد اور سچا خدا پرست عالم کے بارے میں کبھی بھی ایسا تصور نہیں کرسکتا اور علوم کی تدریجی پیش رفت اسی حقیقت کی گواہ ہے۔

اس گفتگو سے ہم یہ سبق بھی سیکھ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرہ جو پورے نظام ہستی کا ایک حصہ ہے اگر صحیح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ "کل شیءٍ عندہ بمقدار" کا اصول اس کے سارے وجود پر حکمران ہو وہ ہر قسم کے افراط و تفریط سے بچے اور ہر اس کام سے پرہیز کرے جو بغیر کسی حساب کتاب کے ہو اور اس کے تمام اجتماعی اصول جچے تلے ہونے چاہئیں۔

Marfat.com

۳- **خدا کے لیے غیب و شہود برابر ہیں:** زیر بحث آیات میں یہ بات ذکر ہوئی ہے کہ غیب و شہود بارگاہ خداوندی میں واضح اور روشن ہے۔ بنیادی طور پر غیب و شہود دو نسبتی مفہوم ہیں کہ جو ایسے موجود کے بارے میں استعمال ہوتے ہیں جس کا علم اور ہستی محدود ہوں۔ مثلاً ہم حواس خمسہ کے حامل ہیں تو جو کچھ ہماری آنکھوں، قوت سماعت اور دیگر حواس کی پہنچ کے اندر ہے وہ ہمارے لیے "شہود" ہے اور جو کچھ ہماری دید و شنید سے باہر ہے ہمارے لیے وہ "غیب" ہے۔ فرض کیا اگر ہماری نگاہ کی قدرت لا محدود ہوتی، ہم اشیاء کے ظاہر و باطن کو دیکھ سکتے اور ذرات عالم کے اندر ہماری نظر اتر جاتی تو تمام چیزیں ہمارے لیے "شہود" ہو جاتیں۔

خدا کی ذات پاک کے علاوہ باقی تمام چیزیں چونکہ محدود ہیں لہٰذا ان تمام چیزوں کے لیے غیب و شہود موجود ہے لیکن ذات الٰہی چونکہ لا محدود ہے اور ہر جگہ موجود ہے لہٰذا اس کے لیے تمام چیزیں شہود ہیں اور اس کی ذات پاک کے بارے میں "غیب" کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا "عالم الغیب والشهادة" ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے لیے غیب یا شہود ہے اُس کے لیے یکساں اور شہود ہے۔

اگر ہم روشنی میں اپنی ہتھیلی کی طرف دیکھیں تو کیا ممکن ہے کہ جو کچھ اس میں ہو ہم اس سے بے خبر رہ جائیں۔ عالم ہستی علم خدا کے سامنے اس سے بھی کئی درجے زیادہ واضح و آشکار ہے۔

۴- **علم خدا کی طرف توجہ کے تربیتی آثار:** یہ جو ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھتے ہیں کہ خدا پنہاں و آشکار سب چیزوں کو، رات اور دن کی آمد و رفت کو اور تمہاری تمام حرکات کو یکساں طور پر جانتا ہے اور اس کے علم کی بارگاہ میں یہ سب آشکار ہیں۔ اس حقیقت پر اگر ہم حقیقی ایمان رکھتے ہوں اور یہ احساس رکھتے ہوں کہ وہ ہمارے اُوپر ہر وقت نگران ہے تو اس سے ہماری روح، فکر، گفتار اور کردار میں ایک بہت گہرا انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا: آپ کی زندگی کا پروگرام کیا ہے؟
آپ نے چند امور بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

علمت ان الله مطلع علی فاستحییت

میرا ایک پروگرام یہ ہے کہ میں نے جان لیا ہے کہ خدا میرے تمام کاموں سے آگاہ ہے اور ان کے بارے میں باخبر ہے لہٰذا میں اس کی نافرمانی سے حیا کرتا ہوں۔

تاریخ اسلام میں اور حقیقی مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں ہم اس حقیقت کے بہت سے جلوے مشاہدہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک باپ بیٹا ایک باغ میں پہنچے۔ باپ باغ کے مالک کی اجازت کے بغیر پھل توڑنے کے لیے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کا بیٹا جو بامعرفت نوجوان تھا کہنے لگا: ابا! نیچے اُتر آؤ۔

باپ پریشان ہوا اور ڈرا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے فوراً نیچے اتر آیا۔ اُس نے پوچھا: مجھے نظر نہیں آیا، کون تھا جو مجھے دیکھ رہا تھا؟
لڑکے نے کہا: تمہارے اُوپر سے۔
اُس نے اُوپر کی طرف دیکھا تو اسے کوئی چیز نظر نہ آئی۔
بیٹے نے کہا: میری مراد خدا ہے، جو ہم سب سے مافوق اور ہم سب پر محیط ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان کے دیکھنے سے تو تمہیں خوف آتا ہے لیکن خدا جو تمہیں ہر حالت میں دیکھ رہا ہے اس سے تجھے کوئی خوف نہیں آتا۔ یہ کیسا ایمان ہے؟

Marfat.com

۱۱۔ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ○

ترجمہ

۱۱۔ انسان کے لیے کچھ مامورین ہیں کہ جو پے درپے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے اسے (غیر حتمی) حوادث سے محفوظ رکھتے ہیں لیکن خدا کسی قوم (اور ملت) کی سرنوشت کو نہیں بدلتا مگر یہ کہ وہ خود اسے تبدیل کریں اور جب خدا کسی قوم کے بارے میں (ان کے اعمال کی وجہ سے) برا ارادہ کرتا ہے تو کوئی چیز اس کے لیے رکاوٹ نہیں ہوتی اور خدا کے علاوہ ان کا کوئی سرپرست نہیں ہوگا۔

تفسیر

غیبی محافظ

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا عالم الغیب والشہادۃ ہونے کی بناء پر لوگوں کے پنہاں اور آشکار سے باخبر ہے اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

زیر بحث آیت میں مزید ارشاد فرمایا گیا ہے اس کے علاوہ کہ خدا اپنے بندوں کا محافظ اور نگہبان ہے "کچھ مامورین ہیں کہ جو پے درپے آگے اور پیچھے سے حوادث سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں" (لہ معقبات من بین یدیہ ومن خلفہ یحفظونہ من امر اللہ)[1]

لیکن اس بناء پر کوئی یہ اشتباہ نہ کرے کہ یہ حفاظت و نگہبانی بلا مشروط ہے اور انسان کہیں اپنے آپ کو گڑھے میں نہ گرا دے یا کہیں انسان

---

[1] مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ "لہ" کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے۔ مشہور تفسیر یہی ہے کہ یہ انسان کی طرف لوٹتی ہے جس کی طرف قبل کی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ پیغمبر یا خدا کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہ احتمال ذیل کی آیت سے مناسبت نہیں رکھتا (غور کیجیے گا)

Marfat.com

ہر طرح کے گناہ کا مرتکب نہ ہونے لگے اور اس طرح اپنے آپ کو عذاب کا سزاوار بنا کر بھی توقع رکھے کہ خدا اور اس کے مامور محافظین اس کی حفاظت کریں گے، مزید فرمایا گیا ہے، خدا کسی قوم و ملت کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہ کرے (ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم)۔ دوبارہ اس لیے کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ انسانی حفاظت کے مامورین ہونے کے باوجود مجازات و سزا اور خدائی امتحانات کا کیا معنی ہے، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، جس وقت خدا کسی قوم کے لیے برائی کا ارادہ کرتا ہے تو پھر دفاع اور بازگشت کی کوئی صورت نہیں ہے (واذا اراد اللہ بقوم سوءًا فلا مرد لہ)۔

"اور خدا کے علاوہ ان کا کوئی والی و ناصر اور یار و مددگار نہیں ہو سکتا" (وما لھم من دونہ من وال)۔

اسی بناء پر جب کسی قوم کے لیے خدا کی طرف سے عذاب، سزا اور نابودی کا فرمان صادر ہو جاتا ہے تو محافظین اور نگہبان الگ ہو جاتے ہیں اور انسان کو حوادث کے سپرد کر دیتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **"معقبات" کیا ہیں؟** جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں اور بعض دوسرے بزرگ مفسرین نے کہا ہے "معقبات" جمع ہے "معقبہ" کی جبکہ خود "معقبہ" بھی "معقب" کی جمع ہے اور یہ اس گروہ کو کہتے ہیں جس کے افراد پے در پے ایک دوسرے کی نیابت میں کسی کام کے لیے نکلیں۔

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے کچھ فرشتوں کی یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ رات دن باری باری انسان کے پاس آئیں اور آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت کریں۔

بے شک انسان اپنی زندگی میں بہت سی آفات و بلیات سے دوچار ہے۔ اندرونی و بیرونی حوادث، طرح طرح کی بیماریاں، جراثیم اور مختلف قسم کے حادثات و خطرات کہ جو زمین و آسمان سے ابھرتے ہیں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ خصوصاً بچپن کے زمانے میں جب گرد و پیش کی کیفیتوں سے انسان بہت کم آگاہ ہوتا ہے، اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا، ہر قدم پر اسے کوئی نہ کوئی خطرہ درپیش ہوتا ہے اور کبھی تو انسان تعجب کرتا ہے کہ ان تمام حوادث سے بچہ کس طرح بچ نکلتا ہے اور بڑا ہو جاتا ہے خصوصاً ایسے گھرانوں میں جہاں ماں باپ مسائل سے بالکل آگاہ بھی نہیں ہوتے یا ان کے پاس وسائل نہیں ہوتے۔ خاص طور پر دیہات میں پلنے بڑھنے والے وہ بچے جو محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں اور بیماری اور خطرات کے عوامل میں گھرے ہوتے ہیں۔

اگر ان مسائل پر ہم حقیقی طور پر غور و فکر کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ ایک محافظ طاقت ہے کہ جو ان حوادث سے ہماری حفاظت کرتی ہے اور سپر اور ڈھال کی طرح آگے اور پیچھے سے ہماری محافظ و نگہبان ہے۔

بہت سے مواقع پر انسان کو خطرناک حادثات پیش آتے ہیں اور وہ معجزانہ طور پر ان سے بچ نکلتا ہے اس طرح سے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سب چیزیں اتفاقی نہیں ہیں بلکہ ایک محافظ طاقت اس کی نگہبانی کر رہی ہے۔

پیشوایانِ اسلام سے مروی بہت سی روایات بھی اس پر تاکید کرتی ہیں۔ ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ زیر بحث آیت کی تفسیر میں آپؑ نے فرمایا:

یحفظ بامر اللہ من ان یقع فی رکی او یقع علیہ حائط او یصیبہ شیء حتی اذا جاء القدر

Marfat.com

خلوا بینہ و بین یدفعونہ الی المقادیر وھما ملکان یحفظانہ باللیل و ملکان من نھار یتعاقبانہ

حکم خدا سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے، کنوئیں میں گرنے سے یا دیوار اوپر آپڑنے سے یا کوئی اور حادثہ سے مگر جب حتمی مقدرات آپہنچیں تو محافظین ایک طرف ہو جاتے ہیں اور اسے حوادث کے سپرد کردیتے ہیں۔ اور دو فرشتے انسان کی رات کو حفاظت کرتے ہیں اور (ان کے علاوہ) دو فرشتے دن کے وقت باری باری ذمہ داری پوری کرتے ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

مامن عبد الا و معہ ملکان یحفظانہ فاذا جاء الامر من عند اللہ خلیا بینہ وبین امر اللہ

کوئی بھی ایسا بندہ نہیں کہ جس کے ساتھ دو فرشتے نہ ہوں کہ جو اس کی حفاظت کرتے ہوں لیکن جب خدا کا قطعی فرمان آپہنچتا ہے تو وہ اسے حوادث کے سپرد کردیتے ہیں[2] (اس بناء پر وہ انسان کی حفاظت صرف ان حوادث سے کرتے ہیں جن کے بارے میں خدا کا قطعی حکم نہیں ہوتا)۔

نہج البلاغہ میں بھی ہے کہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:

ان مع کل انسان ملکین یحفظانہ فاذا جاء القدر خلیا بینہ و بینہ

ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں کہ جو اس کی حفاظت کرتے ہیں لیکن جب حتمی مقدرات آپہنچتے ہیں تو وہ اُسے چھوڑ دیتے ہیں۔[3]

اسی طرح نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں فرشتوں کی تعریف اور ان کے مختلف گروہوں کے بارے میں ہے:

ومنھم الحفظۃ لعبادہ

ان میں سے ایک گروہ خدا کے بندوں کا محافظ ہے۔

البتہ حسی ذرائع سے یا طبیعی علوم کے ذریعے ان فرشتوں کے وجود کے بارے میں عدم آگاہی ان کے وجود کی نفی کی دلیل نہیں ہوسکتی اور یہ بات زیر بحث آیت میں منحصر نہیں ہے بلکہ قرآن مجید اور اسی طرح دیگر مذاہب بہت سے ایسے امور کی خبر دیتے ہیں جو حسِ انسانی سے ماوراء ہیں کہ جن کے بارے میں انسان عام ذرائع سے آگاہی حاصل نہیں کرسکتا۔

اس سے قطع نظر جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہمیں اس محافظ قوت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ بہت سے تباہ کن حوادث سے ہم معجزانہ طور پر نجات حاصل کرتے ہیں کہ جن کی تفسیر عام طریقے سے نہیں ہوسکتی یا جنہیں اتفاق قرار دینا مشکل ہے۔

خود راقم نے اپنی زندگی میں اس کے نمونے دیکھے ہیں کہ جو یقیناً حیرت انگیز ہیں کہ جو مجھ جیسے جلدی یقین نہ کرنے والے شخص کے لیے بھی

---

[1] و [2] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۸۳۔

[3] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۲۰۱۔

Marfat.com

اس غیر مرئی محافظ کے وجود کے لیے دلیل تھے۔

۲۔ تبدیلی ہمیشہ خود ہمارے ہاتھوں سے آتی ہے: "ان اللہ لایغیر ما بقوم حتّٰی یغیروا ما بانفسھم" یہ جملہ قرآن میں دو مواقع پر مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے اس میں ایک عمومی اور کلی قانون بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک حیات ساز، انقلاب آفرین اور خبردار اور ہوشیار کرنے والا قانون ہے۔

یہ قانون اسلام میں جہاں بینی اور معاشرہ شناسی کی بنیاد ہے ـــــ یہ قانون ہم سے کہتا ہے کہ تمہاری تقدیر ہر چیز اور ہر شخص سے پہلے خود تمہارے ہاتھ میں ہے اور قوموں کی خوش بختی و بدبختی کے سلسلے میں تبدیلی اور تغیر پہلے درجے میں خود انہی سے وابستہ ہے۔ قسمت، اقبال، اتفاقات اور اوضاعِ فلکی کی تاثیر وغیرہ کوئی بھی بنیاد نہیں رکھتی۔ اساس و بنیاد یہی ہے کہ ہر شخص خود چاہے تو سربلند اور کامیاب ہو یا اس کے علاوہ خود چاہے تو اپنے آپ کو ذلت، زبوں حالی اور شکست کے سپرد کر دے۔ یہاں تک کہ لطفِ الٰہی یا عذابِ الٰہی کسی ملت پر بغیر کسی مقدمہ اور تمہید کے نہیں آتا بلکہ یہ ملتوں کا اپنا ارادہ، خواہش اور ان کے اندرونی تغیرات ہیں کہ جو انہیں لطفِ خدا یا عذابِ خدا کا مستحق بناتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اسلام کے اجتماعی پروگرام کے ایک اہم ترین گوشے سے آگاہ کرنے والا یہ قانون ہم سے کہتا ہے کہ ہر قسم کے بیرونی تغیرات اور تبدیلیاں ملتوں اور قوموں کے اندرونی تغیرات پر منحصر ہوتی ہیں اور کسی قوم کو پیش آنے والی ہر قسم کی فتح و شکست کا سرچشمہ اس کے اندر ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ کہ جو اپنا دامن بچانے کے لیے ہر وقت "بیرونی عوامل" کے پیچھے پھرتے ہیں اور ہمیشہ اقتدار پرست اور استعماری طاقتوں کو اپنی بدبختی کا عامل شمار کرتے ہیں بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ اگر کسی معاشرے کے اندر ان جہنمی طاقتوں کو کوئی مرکز حاصل نہ ہو تو یہ کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ان توسیع پسندوں، استعماری قوتوں اور سپر طاقتوں کی چھاؤنیاں اور مراکز اپنے معاشرے سے درہم برہم کر دیں اور ان کی سرکوبی کریں تاکہ ان کے لیے نفوذ کی کوئی راہ ہی باقی نہ رہے۔

یہ طاقتیں شیطان کی مانند ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے بقول شیطان ان لوگوں پر دسترس حاصل نہیں کر سکتا جو "عباد اللہ المخلصین" ہیں۔ وہ صرف ان لوگوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے جنہوں نے اپنے وجود کے اندر شیطان کے لیے کوئی جگہ بنا رکھی ہے۔

قرآن کی اس بنیادی تعلیم کا تقاضا ہے کہ بدبختیوں اور ناکامیوں کو ختم کرنے کے لیے اندرونی انقلاب کی طرف بڑھیں۔ ایک فکری اور ثقافتی انقلاب کی طرف، ایک ایمانی اور اخلاقی انقلاب کی طرف۔ بدبختیوں کے چنگل میں گرفتاری کے وقت اپنے کمزور پہلوؤں کو فوراً تلاش کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی روح سے اپنی کمزوری کے داغ توبہ اور حق کی طرف بازگشت کے پانی سے دھونے چاہئیں۔ اس طرح ہم ایک نیا جنم لیں گے، نیا نورِ بصیرت ملے گا اور نئی قوت حرکت پیدا ہوگی اور اس کے ذریعے ہم اپنی ناکامیوں اور شکستوں کو کامیابی میں بدل سکتے ہیں۔ یہ کامیابی اس طرح سے ممکن نہیں کہ ہم اپنے کمزور پہلوؤں کو خود خواہی اور خود غرضی کے پردوں میں چھپا دیں اور عوامل شکست کو اپنے معاشرے کے باہر سے تلاش کرتے پھریں۔

پہلے مسلمانوں کی فتح و کامرانی اور بعد والے مسلمانوں کی شکست کے عوامل پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی مباحث سنگلاخ زمین پر ہل چلانے اور بے سمت چلنے کے مترادف ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ کامیابی اور ناکامی کے عوامل خود مسلمانوں کے فکری، اعتقادی اور اخلاقی تغیرات میں تلاش کریں۔ خود مسلمانوں کی عملی زندگی کا مطالعہ کریں نہ کہ اس سے ہٹ کر۔

Marfat.com

دورِ حاضر کے انقلابات کہ جن میں سے ایک ہماری ملت کا انقلاب ہے اسی طرح اگر ہم الجزائر، افغانستان اور دیگر مقامات کی انقلابی جدوجہد کا مطالعہ کریں تو ہم ان میں واضح طور پر اس قرآنی اصل کی حاکمیت کا مشاہدہ کریں گے۔

یعنی ــــ سامراجی حکومتوں اور توسیع پسند سپر طاقتوں نے تو اپنی روش نہیں بدلی لیکن جب ہم اندر سے تبدیل ہو گئے تو ہر چیز بدل گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صرف وہی رہبر اور قائد کامیاب ہوئے ہیں کہ جنہوں نے اس بنیادی قانون کے مطابق اپنی ملت کی رہبری کی ہے اور اس میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے۔

تاریخ اسلام اور دورِ حاضر کی تاریخ اس اساسی و بنیادی اور جاودانی و دائمی قانون کی صداقت کے شواہد سے بھری پڑی ہے کہ جن کے تفصیلی ذکر سے ہماری بحث ہمیں اس تفسیر کی روش سے دور لے جائے گی۔

Marfat.com

۱۲۔ هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ
الثِّقَالَ ۚ○
۱۳۔ وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ
فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ
الْمِحَالِ ؕ○
۱۴۔ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ
لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ
وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ○
۱۵۔ وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ
بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ○

ترجمہ

۱۲۔ وہ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے کہ جو خوف کا بھی باعث ہے اور اُمید کا بھی نیز وہ بوجھل بادل پیدا کرتا ہے۔

۱۳۔ اور گرج اس کی تسبیح اور حمد کرتی ہے اور فرشتے (بھی) اس کے خوف سے (مشغول تسبیح ہیں) اور وہ صاعقہ بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس میں گرفتار کرتا ہے حالانکہ وہ (خدا کی ان آیات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود) خدا کے بارے میں مجادلہ میں مشغول ہیں اور اس کی قدرت لامتناہی (اور عذاب دردناک) ہے۔

۱۴۔ حق کی دعوت اس کی طرف سے ہے اور جو (مشرک) لوگ غیر خدا کو پکارتے ہیں ان کی پکار کا وہ کوئی جواب نہیں دیتے یہ لوگ اس شخص کی طرح ہیں جو پانی کی طرف اپنی ہتھیلیاں کھولتا ہے تاکہ پانی اس کے منہ تک

Marfat.com

پہنچ جائے لیکن وہ کبھی نہیں پہنچے گا اور کافروں کی پکار ضلالت (اور گمراہی) کے سوا کچھ نہیں۔

۱۵۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے طوعاً یا کرھاً خدا کے لیے سجدہ ریز ہے۔ اسی طرح دن رات اُن کے سائے بھی سجدہ گزار ہیں۔

تفسیر

عظمتِ الٰہی کی کچھ اور نشانیاں

قرآن یہاں ایک مرتبہ پھر آیاتِ توحید، عظمتِ پروردگار کی نشانیاں اور اسرارِ آفرینش بیان کر رہا ہے۔ عالم طبیعت میں نمودار ہونے والی مختلف قدرتوں کی نشاندہی کی گئی ہے نیز ان کے اسرار کی طرف مختصر اور پُرمعنی اشارے کرتے ہوئے خدا سے بندوں کو زیادہ قریب کر کے ان دلوں پر ایمان و معرفت کی نور پاشی کی گئی ہے۔

پہلے بادلوں میں پیدا ہوتے والی بجلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ وہی ہے جو تمہیں وہ بجلی دکھاتا ہے جو خوف اور اُمید کا باعث ہے (ھو الذی یریکم البرق خوفًا وطمعًا)۔

ایک طرف تو اس کی شعاعِ درخشاں آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور رعد کی رعب دار آواز جو اس سے اُٹھتی ہے بعض اوقات تمہیں وحشت زدہ کر دیتی ہے۔ اس سے جو آتش سوزی کے خطرات پیدا ہوتے ہیں وہ خوف و اضطراب پیدا کر دیتا ہے خصوصاً جو لوگ بیابانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں یا بیابانوں سے گزر رہے ہوتے ہیں انہیں اس سے بہت وحشت آتی ہے۔

دوسری طرف عموماً چونکہ اس کے ساتھ ساتھ موٹے قطروں والی بارش بھی ہوتی ہے جو بیابانوں کے تشنہ کاموں اور پیاسوں کو خوشگوار پانی بخشتی ہے اور اس سے درخت اور زراعت سیراب ہوتے ہیں لہٰذا اس سے ان کے دل میں ایک اُمید بھی پیدا ہوتی ہے اور یوں وہ خوف و اُمید کے حساس لمحے گزارتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: وہ وہی ہے جو بوجھل اور پُربار بادل پیدا کرتا ہے کہ جو پیاسی زمینوں کی آبیاری کر سکتے ہیں (و ینشیء السحاب الثقال)۔

رعد و برق کی برکتیں

ہم جانتے ہیں کہ سائنسی لحاظ سے برق اس طرح سے پیدا ہوتی ہے کہ بادل کے دو ٹکڑے مختلف بجلی کے لحاظ سے (مثبت اور منفی پول کی صورت میں) ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ان سے بالکل اس طرح سے کرنٹ پیدا ہوتا ہے جیسے بجلی کے دو تار جن میں مختلف (مثبت اور منفی فیز PHASE کی بجلی آ رہی ہو جب ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو بہت زیادہ کرنٹ پیدا ہوتا ہے اور اصطلاح کے مطابق

Marfat.com

ہو جاتے ہیں۔

تاروں کے دو سرے جب آپس میں ملتے ہیں تو ہمارے سامنے معمولی سا کرنٹ اور شعلہ پیدا ہوتا ہے اور ایک ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوتی ہے جب کہ آسمانی بجلی کے ساتھ بادلوں کی وسعت کے اعتبار سے الیکٹرک ڈسچارج اس قدر شدید ہوتا ہے کہ اس سے "رعد" اور گرج پیدا ہو جاتی ہے۔

بادل کا ٹکڑا جو مثبت رو ہوتی ہے جب زمین کے نزدیک ہو جائے کہ جس میں ہمیشہ منفی رو ہوتی ہے تو زمین اور بادل کے درمیان کرنٹ پیدا ہو جاتا ہے جسے "صاعقہ" کہتے ہیں۔ یہ برقی رو اس لیے خطرناک ہوتی ہے کہ اس کا ایک سرا زمین کے بلند مقامات ہوتے ہیں۔ اصطلاح کے مطابق یہ بلند جگہیں منفی رو کی حامل تار کے سرے یا نوک میں بدل جاتی ہیں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ کسی بیابان میں ایک انسان عملی طور پر اس منفی تار کی نوک میں بدل جائے اور بہت وحشت ناک کرنٹ اس کے سر پر آگرے اور مختصر سے لمحے میں وہ خاکستر ہو جائے۔ لہٰذا بیابانوں میں رعد اور برق کے موقع پر فوراً درخت، دیوار یا پہاڑ کے دامن میں یا کسی اونچی جگہ کی اوٹ میں پناہ لینا چاہیے یا کسی گڑھے میں لیٹ جانا چاہیے۔

بہرحال برق کہ جو شاید بعض کی نگاہ میں عالم طبیعت کی شوخی ہے موجودہ سائنسی انکشافات سے ثابت ہوا ہے کہ اس کے بہت سے فوائد و برکات ہیں۔ ذیل میں ہم ان فوائد کے تین پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں؛

۱۔ **آبیاری**؛ بجلیاں عموماً بہت زیادہ حرارت پیدا کرتی ہیں جو بعض اوقات تقریباً ۱۵ ہزار سنٹی گریڈ تک ہوتی ہے۔ یہ حرارت اس مقصد کے لیے کافی ہے کہ اطراف کی زیادہ تر ہوا کو جلا دے اور اس کے نتیجے میں فوراً ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کم دباؤ کی صورت میں ہی بادل برستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر بجلی چمکنے اور گرنے کے بعد ہی اولے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں اور بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگتے ہیں۔ اس بناء پر بجلی کی درحقیقت ایک ذمہ داری آبیاری ہے۔

۲۔ **جراثیم پر سمپاشی**؛ جس وقت بجلی اپنی اس حرارت کے ساتھ چمکتی ہے تو بارش کے قطرات اضافی آکسیجن کی مقدار میں ترکیب ہوتے ہیں اور یہ بھاری پانی یعنی ہائیڈروجن پر آکسائیڈ پیدا کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ بھاری پانی کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جراثیم کش ہوتا ہے۔ اسی بناء پر طبی مصارف میں اسے زخموں کو دھونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بھاری پانی کے یہ قطرات جس وقت زمین پر برستے ہیں تو نباتاتی بیماریوں کے جراثیم ختم کر دیتے ہیں۔ گویا یا پانی جراثیم پر خوب سم پاشی کرتا ہے۔ اسی بناء پر ماہرین نے کہا ہے کہ جس سال رعد و برق کم ہو نباتاتی آفات اور بیماریاں زیادہ ہوتی ہیں۔

۳۔ **تغذیہ اور کھاد رسانی**؛ بجلی، شدید حرارت اور کیمیائی ترکیب سے بارش کے قطرے کاربانک ایسڈ[1] کی حالت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ جب زمینوں پر چھڑکے جاتے ہیں تو کیمیائی اثرات کی بدولت نباتات کے لیے ایک موثر کھاد کا کام دیتے ہیں۔ اس طرح سے نباتات کو غذا ملتی ہے۔

بعض ماہرین کے مطابق آسمانی بجلیوں کے ذریعے کرہ زمین کو سال بھر میں ملنے والی کھاد سینکڑوں لاکھ ٹن ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پاؤں کے نیچے روندی جانے والی بظاہر ایک بے خاصیت چیز کس قدر پربار اور پُر برکت ہے آبیاری بھی کرتی ہے، جراثیم پر سم پاشی بھی کرتی ہے اور غذا بھی بنتی ہے۔ یہ عالم ہستی کے عجیب و غریب اور وسیع و عریض اسرار میں خداشناسی کی طرف

---

[1] CARBONIC ACID (H_2CO_3)
بے رنگ و بو بھاپ جو کچھ ترش مزہ ہوتی ہے طب میں ہاضمے کی تقویت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

واضح راہنمائی کرنے والا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔

یہ سب ایک طرف بجلی کی برکات ہیں اور دوسری طرف یہ آتش سوزاں کو بھی وجود دیتی ہے کہ جس کی ایک قسم "صاعقہ" ہے۔ یہ بجلی ہو سکتی ہے کہ ایک یا کئی انسانوں کو یا درختوں کو جلا ڈالے۔ یہ چیز اگرچہ کم اور نادر ہے اور اس سے بچا بھی جا سکتا ہے تاہم خوف و ہراس کا عامل بن سکتی ہے۔

اس طرح سے یہ جو ہم نے آیت بالا میں پڑھا ہے کہ برق خوف کا سبب بھی ہے اور اُمید کا بھی — ہو سکتا ہے کہ یہ ان تمام امور کی طرف اشارہ ہو۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ " وینشئ السحاب الثقال " جو مندرجہ بالا آیت کے آخر میں آیا ہے وہ بجلی کی اسی خاصیت کے ساتھ مربوط ہو کہ جو بادلوں کو بارش کے انہی بھری ہوئی پشت والے قطروں سے بوجھل کرتی ہے۔

بعد والی آیت میں " رعد " کی آواز کا ذکر ہے کہ جو برق سے جدا نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: رعد خدا کی تسبیح اور حمد کرتی ہے" (ویسبح الرعد بحمدہ)۔

جی ہاں! عالم طبیعت کی یہ سخت آواز کہ جو بہت بڑی آواز کے لیے ضرب المثل ہے چونکہ بجلی سے منسلک ہے اور دونوں ایک ہی مقصد کو پورا کرتی ہیں اور بہت اہم اور سوچی سمجھی خدمات انجام دیتی ہیں کہ جن کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے عملی طور پر خدا کی تسبیح کرتی ہیں دوسری طرف " رعد " " برق " کی زبان گویا ہے جو نظام آفرینش اور عظمتِ خالق کی ترجمانی کرتی ہے۔

یہ وہی چیز ہے جسے ہم " زبانِ حال " کہتے ہیں۔ ایک جامع کتاب، ایک قصیدہ غراء، ایک خوبصورت اور دل انگیز مصوری کا نمونہ اور ایک مستحکم و دلنظر عمارت سب اپنی زبان حال سے اپنے لکھنے والے، کہنے والے، نقاش اور معمار کے علم و دانش اور ذوق و مہارت کی بات کرتے ہیں اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

اس عالم ہستی کا ہر ذرہ اسرار آمیز ہے اور بہت ہی دقیق اور حساب شدہ نظام رکھتا ہے۔ سب ذراتِ کائنات خدا کی پاکیزگی اور ہر قسم کے نقص و عیب سے اس کے منزہ ہونے کی حکایت کرتے ہیں (کیا "تسبیح" — تنزیہ اور پاک جاننے کے علاوہ کچھ اور ہے؟) اور سب کے سب اس کی قدرت اور علم و حکمت کی خبر دیتے ہیں (کیا "حمد" — صفاتِ کمال بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟)[1]

فلاسفہ کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس جہان کے تمام ذرات میں سے ہر ایک ایک قسم کا عقل و شعور رکھتا ہے اور اسی عقل و شعور کی بناء پر خدا کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے نہ صرف زبانِ حال سے اور اپنے وجود سے کہ جو وجود خدا کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ زبان قال سے بھی اس کی تعریف کرتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ صدائے رعد اور عالم مادہ کے دیگر اجزاء اس کی تسبیح کرتے ہیں بلکہ " تمام فرشتے بھی خدا کے خوف و خشیت سے اس کی تسبیح میں مشغول ہیں " (والملائکۃ من خیفتہ)[2]

---

[1] " تسبیح و تقدیس " کہ جو موجودات کرتی ہیں — کے بارے میں مزید وضاحت انشاء اللہ آیہ شریفہ " وان من شیء الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم " (بنی اسرائیل — ۴۴) کے ذیل میں آئے گی۔

[2] شیخ طوسی تفسیر تبیان میں فرماتے ہیں:
" خیفۃ " اور " خوف " کے درمیان فرق یہ ہے کہ " خیفۃ " حالت کو بیان کرتا ہے اور " خوف " مصدر ہے یعنی پہلا حالتِ خوف کے معنی میں ہے اور دوسرا ڈرنے کے معنی میں ہے

وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں فرمانِ خدا پر عمل کرنے میں اور نظامِ ہستی کے بارے میں عائد شدہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے اور اس طرح کہیں وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جو احساسِ مسئولیت رکھتے ہیں ان کے لیے ذمہ داریاں خوف کا باعث ہوتی ہیں ــــ ایک اصلاحی خوف کو جو انسان کو سعی و کاوش اور تحرک پر آمادہ کرتا اور اُبھارتا ہے۔

" رعد و برق " کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے "صواعق" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا صواعق کو بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان کے ذریعے تکلیف پہنچاتا ہے (و یرسل الصواعق فیصیب بھا من یشاء)۔

لیکن ــــ ان سب چیزوں کے باوجود ــــ عالمِ آفرینش، وسیع آسمان و زمین، نباتات، رعد و برق اور اس طرح کی دیگر چیزوں میں عظمتِ الٰہی کی آیات دیکھنے کے باوجود ــــ حوادث یہاں تک کہ ایک آسمانی شعلے کے سامنے انسانی طاقت کی بے بسی کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ــــ بے خبروں کا ایک گروہ خدا کے بارے میں مجادلے اور جنگ کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے (و ھم یجادلون فی اللّٰہ)۔

حالانکہ خدا کی قدرت لامتناہی ہے، اس کا عذاب دردناک ہے اور اس کی سزا بڑی سخت ہے (و ھو شدید المحال)۔

" محال " اصل میں " حیلہ " سے ہے اور " حیلہ " ہر قسم کی مخفی اور پنہاں چارہ اندیشی کے معنی میں ہے (غلط کوششوں اور چارہ جوئیوں کے معنی میں نہیں کہ جس میں یہ لفظ فارسی زبان میں مشہور ہو چکا ہے)۔ یہ بات مسلّم ہے کہ جو چارہ جوئی پر بہت زیادہ قدرت رکھتا ہے وہ وہی ہے جو قدرت کے لحاظ سے بھی غیر معمولی ہے اور علم و حکمت کے لحاظ سے بھی اور اس بنا پر وہ اپنے دشمنوں پر مسلط اور کامیاب ہوتا ہے اور کسی کو اُس کے مرکزِ قدرت سے نکل بھاگنے کا یارا نہیں ہے اسی لیے مفسرین میں سے ہر ایک نے " شدید المحال " کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ سب نے اس کے مفہوم کی بنیاد مذکورہ معنی کو قرار دیا ہے۔ بعض نے اسے " شدید القوہ "، بعض نے " شدید العذاب "، بعض نے " شدید القدرۃ " اور بعض نے " شدید الاخذ " کے معنی میں اور اس جیسے الفاظ میں اس کی تفسیر کی ہے [۱]

زیرِ بحث آخری آیت دو مطالب کی طرف اشارہ کرتی ہے:

پہلا یہ کہ " دعوتِ حق (اور حقیقی دعا) خدا کے لیے ہے " (لہ دعوۃ الحق)۔ یعنی جس وقت ہم اسے پکاریں تو وہ سنتا ہے اور ہماری پکار کا جواب دیتا ہے اور وہ بندوں کی دعا سے آگاہی بھی رکھتا ہے اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اس لیے اُسے پکارنا اور اُس کی مقدس ذات سے تقاضا کرنا حق ہے نہ کہ باطل اور بے اساس و بے بنیاد۔

دوسرا یہ ہے کہ بتوں کو پکارنا اور اُن سے درخواست اور دعا کرنا دعائے باطل ہے کیونکہ " جن لوگوں کو مشرکین خدا کے علاوہ پکارتے ہیں اور اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کے لیے جن کا سہارا لیتے ہیں وہ ہرگز انہیں جواب نہیں دیں گے اور ان کی دعا قبول نہیں کریں گے " (و الذین یدعون من دونہ لا یستجیبون لھم بشیء)۔

جی ہاں ــــ باطل کو پکارنا ایسا ہی ہے کیونکہ وہ خیالی تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور بتوں کے لیے وہ جیسے بھی علم و قدرت کے قائل ہوں سب موہوم، بے پایہ و بے اساس ہے۔

---

[۱] بعض " محال " کو " حیلہ " کے مادہ سے نہیں سمجھتے بلکہ " محل " اور " ماحل " کے مادہ سے قرار دیتے ہیں کہ جو مکر و جدال اور عذاب دینے اور سزا دینے کے لیے عزمِ صمیم کرنے کے معنی سے لیا گیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے متن میں کہا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ دونوں معانی قریب الافق ہیں۔

Marfat.com

کیا حیثیت، واقعیت اور مایۂ خیر و برکت کے سوا "حق" کچھ اور ہے اور خیال، توہم اور مایۂ شر و فساد کے علاوہ "باطل" کچھ اور ہے۔

اس کے بعد جیسا کہ قرآن کی روش ہے اس عقلی بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ ایک خوبصورت حسی اور رسا مثال پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ کہ جو غیر خدا کو پکارتے ہیں، اس شخص کی طرح ہیں جو ایسے پانی کے کنارے بیٹھا ہو جس کی سطح اس کی دسترس میں نہ ہو اور وہ اس امید سے پانی کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ وہ اس کے دہن میں پہنچ جائے حالانکہ وہ ہرگز نہیں پہنچے گا۔ یہ کیسا بے ہودہ اور فضول خواب و خیال ہے (الا کباسط کفیہ الی الماء لیبلغ فاہ وما ھو ببالغہ)۔

کیا کنویں کے کنارے بیٹھ کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر، اشارے سے پانی منہ تک پہنچایا جا سکتا ہے؟ ایسا کام کسی دیوانے اور سادہ لوح شخص کے کوئی نہیں کرسکتا ہے۔

مذکورہ جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ بت پرستوں کو ایک شخص سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پوری طرح کھول کر افقی شکل میں پانی میں داخل کرتا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ پانی اس کے ہاتھ میں ٹھہر جائے حالانکہ پانی سے نکلتے ہی پانی کے قطرے انگلیوں کی طرف سے نکل جائیں گے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔

مفسرین نے اس جملے کے لیے ایک تیسری تفسیر بھی ذکر کی ہے اور وہ یہ کہ بت پرست جو اپنی مشکلات کے حل کے لیے بتوں کے پاس جاتے ہیں اس شخص کی طرح ہیں جو چاہتا ہے کہ پانی اپنی مٹھی میں بند رکھے۔ کیا کبھی پانی کو مٹھی میں بند رکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات عربوں میں مشہور ضرب المثل سے لی گئی ہے کہ جب وہ اس شخص کے لیے کوئی مثال ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ جو بے ہودہ اور فضول کوشش کرتا ہے تو کہتے ہیں:

هو كقابض الماء باليد

وہ اس شخص کی طرح ہے جو پانی کو ہاتھ سے پکڑنا چاہتا ہے۔

ایک عرب شاعر کہتا ہے:

فاصبحت فيما كان بيني وبينها
من الود مثل قابض الماء باليد

میری حالت تو یہ ہوگئی کہ میں اپنے اور اس کے درمیان محبت برقرار رکھنے کے لیے اس شخص کی طرح ہوگیا کہ جو پانی کو ہاتھ میں روک رکھے[1]

آیت کے آخر میں اس بات کی تاکید کے لیے قرآن کہتا ہے: کافروں کا بتوں سے دعا اور درخواست کرنا گمراہی میں قدم اٹھانے کے علاوہ کچھ نہیں (وما دعاء الكافرين الا في ضلال)۔

اس سے بڑھ کر کیا گمراہی ہو سکتی ہے کہ انسان اس راستے میں اپنی کاوشیں صرف کرے کہ جو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا اور اس راستے میں وہ اپنے آپ کو خستہ و بے حال کر دے لیکن اسے کوئی نتیجہ اور فائدہ حاصل نہ ہو۔

زیر بحث آخری آیت میں یہ نشاندہی کرنے کے لیے کہ بت پرست عالم ہستی کے کارواں سے کس طرح الگ ہو گئے ہیں اور تنہا بے راہ روی

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۵ ص ۳۵۲۹

Marfat.com

میں سرگرداں ہیں فرمایا گیا ہے، آسمانوں اور زمین کے تمام رہنے والے اطاعت و تسلیم سے یا کراہت و ناپسندیدگی سے سربسجود ہیں اور اسی طرح ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ ریز ہیں (وللہ یسجد من فی السمٰوٰت والارض طوعًا وکرھًا وظلالھم بالغدو والاٰصال)۔

چند اہم نکات

۱ **موجودات کے سجدہ کرنے سے کیا مراد ہے:** ایسے مواقع پر سجدہ خضوع و خشوع، انتہائی قسم کی تواضع و انکساری اور سرِتسلیم خم کرنے کے معنی میں ہے یعنی تمام فرشتے، انسان اور سب صاحبانِ عقل و فکر خدا کے سامنے متواضع ہیں اور اس کے حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہیں البتہ کچھ مخلوقات کا سجدہ صرف تکوینی پہلو رکھتا ہے یعنی وہ عالم آفرینش کے قوانین کے سامنے خاضع ہیں لیکن کچھ مخلوقات سجودِ تکوینی کے علاوہ سجودِ تشریعی کی بھی حامل ہیں۔

سجودِ تشریعی — یعنی اپنے ارادے اور رضا و رغبت سے کیے جانے والے سجدے۔

جب کہ سجودِ تکوینی کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی مخلوق موت و حیات، نشو و نما، رشد و تکامل اور سلامتی و بیماری وغیرہ کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہے تو تسلیم و خضوع کی یہ حالت درحقیقت قوانینِ آفرینش کے لیے ان کی طرف سے ایک قسم کا سجدہ تکوینی ہے۔

۲۔ **"طوعًا وکرھًا" سے مراد:** ہوسکتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ مومنین بارگاہِ پروردگار میں رضا و رغبت سے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس کے سامنے خضوع کرتے ہیں لیکن غیر مومنین اگرچہ ایسے سجدے کے لیے تیار نہیں ہیں تاہم ان کے وجود کے تمام ذرات قوانینِ آفرینش کے پیشِ نظر فرمانِ خدا کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہیں، وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔

ضمناً توجہ رہے کہ "کرہ" (بروزن "جرم") اس کراہت کے معنی میں ہے جس کا سرچشمہ انسان کا اندر اور باطن ہے اور "کرہ" (بروزن "شرح") اس کراہت کے معنی میں ہے جس کا عامل بیرونی اور خارجی ہو۔ زیرِ بحث مقام پر چونکہ غیر مومنین خارج از ذات عوامل کے زیرِ اثر قوانینِ آفرینش کے مقہور و مغلوب ہیں اس لیے "کرہ" (بروزن "شرح") استعمال ہوا ہے۔

"طوعًا وکرھًا" کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "طوعًا" سے مراد عالمِ خلقت کے وہ واقعات ہیں جو ایک موجود کی فطری اور طبیعی رضا و رغبت کے موافق ہیں (مثلاً زندہ رہنے کے لیے موجودِ زندہ کی رغبت) اور "کرھًا" سے مراد وہ میلان ہے جو ایک موجود کو خارج سے لاحق ہو۔ مثلاً جراثیم کے حملے سے ایک زندہ موجود کی موت۔

۳۔ **"ظلال" کا مفہوم:** "ظلال" جمع ہے "ظل" کی، جو "سایہ" کے معنی میں ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ سجود سے مراد صرف تشریعی سجدہ نہیں کیونکہ موجودات کے سائے تو اپنا کوئی ارادہ و اختیار نہیں رکھتے بلکہ وہ تو روشنی کی چمک کے قوانین کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ اس بنا پر ان کا سجدہ تکوینی ہے — یعنی وہ قوانینِ آفرینش کے سامنے سرِتسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

البتہ لفظ "ظلال" کے ذکر کا یہ مطلب نہیں کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات کا وجود مادی ہے اور ان سب کا سایہ ہوتا ہے بلکہ یہ صرف ان موجودات کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا سایہ ہوتا ہے۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ شہر کے علماء اور ان کے فرزندوں نے فلاں مجلس میں شرکت کی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے فرزندوں نے شرکت کی کہ جن کے فرزند تھے۔ اس جملے سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ شہر کے تمام علماء صاحبِ اولاد ہیں (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

بہرحال سایہ اگرچہ ایک عدمی چیز کے علاوہ کچھ نہیں کہ جو روشنی کا فقدان اور نہ ہونا ہی ہے لیکن چونکہ ہر طرف سے نور کا وجود اس کا احاطہ کیے ہوتا ہے لہٰذا اس کی بھی ایک موجودیت ہے اور وہ بھی آثار رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ کی تصریح شاید تاکید کے لیے ہے کہ موجودات کے سائے تک بارگاہِ خداوندی میں سرخمیدہ ہیں۔

۴۔ "آصال" اور "غدو" کا مطلب : "آصال" (بروزن "وصال") "اصل" کی جمع ہے اور "اصل" بھی "اصیل" کی جمع ہے کہ جو "اصل" کے مادہ سے لی گئی ہے اور یہ دن کے آخری حصے کو کہتے ہیں اس لیے کہ دن کا یہ حصہ رات کی اصل اور بنیاد شمار ہوتا ہے۔

نیز "غدو" جمع ہے "غداۃ" کی کہ جو دن کے پہلے حصے کے معنی میں ہے (اور بعض اوقات یہ مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اگرچہ حکمِ خدا کے سامنے عالمِ ہستی کی موجودات کا سجدہ اور خضوع صبح اور عصر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت ہے پھر بھی ان دو مواقع کا ذکر یا تو اس امر کے دوام کے لیے کنایہ ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح و شام تحصیلِ علم میں مشغول ہے یعنی ہمیشہ تحصیلِ علم میں محو ہے اور یا اس بنا پر ہے کہ گزشتہ جملے میں موجودات کے سایوں کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی اور سائے دن کے آغاز اور اختتام پر دیگر اوقات کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔

Marfat.com

۱۶۔ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○

ترجمہ

۱۶۔ کہو: آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہہ دو: "اللہ"، پھر کہو: تم نے اپنے لیے اس کے علاوہ اولیاء (اور خدا) بنا لیے ہیں، کہ جو اپنے سود و زیاں کے (بھی) مالک نہیں ہیں (چہ جائیکہ تمہارے)۔ کہو: کیا بینا اور نابینا برابر ہیں یا ظلمتیں اور نور برابر ہیں؟ کیا انہوں نے انہیں خدا کا اس لیے شریک قرار دیا ہے کہ وہ خدا کی طرح خلقت رکھتے ہیں اور یہ خلقتیں ان کے لیے مشتبہ ہو گئی ہیں؟ کہہ دو: خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہے یکتا و کامیاب۔

تفسیر

بت پرستی آخر کیوں؟

گزشتہ آیات میں وجودِ خدا کی معرفت کے بارے میں بہت سی بحثیں تھیں۔ اس آیت میں مشرکین اور بت پرستوں کے اشتباہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور اس کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے پیغمبر کی طرف رُوئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور مدبر کون ہے (قل من رب السمٰوٰت والارض)۔

اس کے بعد بغیر اس کے کہ پیغمبر ان کے جواب کے انتظار میں رہے حکم دیا گیا ہے کہ اس سوال کا جواب خود دو، کہو: "اللہ" (قل اللّٰہ)۔

پھر انہیں یوں ملامت کی گئی ہے: ان سے کہو: کیا تم نے غیر خدا کو اپنے لیے اولیاء، سہارا اور معبود قرار دے لیا ہے حالانکہ یہ بت تو اپنے

Marfat.com

نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں (قل افاتخذتم من دونہ اولیاء لایملکون لانفسہم نفعا و لا ضرا)۔

درحقیقت پہلے "خدا کی ربوبیت" کے حوالے سے بحث کی گئی ہے نیز یہ کہ وہی عالم کا مالک و مدبر ہے ہر خیر و نیکی اسی کی جانب سے ہے اور وہی ہر شر کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے یعنی جب کہ تم یہ بات قبول کرتے ہو کہ خالق اور پروردگار وہ ہے تو اب جو مانگنا ہے اسی سے مانگو نہ کہ بتوں سے کہ جو تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کر سکتے۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر فرمایا گیا ہے کہ وہ تو اپنے نفع و نقصان تک کے مالک نہیں ہیں چہ جائیکہ تمہارے۔ ان حالات میں وہ تمہاری کونسی مشکل آسان کر سکتے ہیں جس کی بناء پر تم ان کی پرستش کرتے ہو جب وہ اپنے لیے بے بس ہیں تو تم ان سے کیا توقع رکھتے ہو۔

اس کے بعد دو واضح اور صریح مثالوں کے ذریعے "موحد" اور "مشرک" کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کہو: کیا نابینا اور بینا برابر ہیں (قل ھل یستوی الاعمیٰ والبصیر)۔

جس طرح نابینا اور بینا برابر نہیں ہیں اسی طرح کافر اور مومن بھی برابر نہیں ہیں اور بتوں کو "اللہ" کا شریک قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسرا یہ کہ: کیا ظلمات اور نور برابر ہیں (ام ھل تستوی الظلمات والنور)۔

وہ ظلمت ــ کہ جو انحراف، گمراہی، اشتباہ اور خوف و خطر کا مرکز ہے اسے اس نور کے برابر کیسے سمجھا جا سکتا ہے جو رہنما اور حیات بخش ہے۔ کس طرح سے بتوں کو کہ جو محض ظلمات ہیں خدا کے ساتھ شریک کیا جا سکتا ہے کہ جو عالم ہستی کا نور مطلق ہے۔ ایمان اور توحید کہ جو روح نور ہے اسے شرک و بت پرستی سے کیا نسبت کہ جو ظلمت کی روح رواں ہے۔

اس کے بعد ایک طریقے سے مشرکین کے عقیدے کا بطلان ثابت کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ کہ جنہوں نے خدا کے لیے شریک قرار دیئے ہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی خدا کی طرح خلق کیا ہے اور یہ خلقت ان کے لیے مشتبہ ہوگئی ہے اور انہیں یہ گمان ہو گیا ہے کہ بت بھی خدا کی طرح عبادت کے مستحق ہیں کیونکہ ان کی نظر میں بت بھی وہی کام کرتے ہیں کہ جو خدا کرتا ہے (ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیہم) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بت پرست بھی بتوں کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھتے۔ وہ بھی خدا کو تمام چیزوں کا خالق سمجھتے ہیں اور عالم خلقت کو فقط اس سے مربوط شمار کرتے ہیں۔

اسی لیے فوراً فرمایا گیا ہے: کہہ دو خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہے یکتا و کامیاب (قل اللہ خالق کل شیء و ھو الواحد القھار)۔

چند اہم نکات

۱۔ **خالقیت و ربوبیت معبودیت سے مربوط ہے:** زیر نظر آیت سے پہلے تو یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ جو خالق ہے وہ رب اور مدبر بھی ہے کیونکہ خلقت ایک دائمی اور مسلسل امر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ خداوند عالم موجودات کو پیدا کر کے ایک طرف بیٹھ جائے بلکہ فیض ہستی خدا کی طرف سے دائمی طور پر ہوتا ہے اور ہر موجود اس کی پاک ذات سے ہستی اور وجود حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس بناء پر آفرینش کا پروگرام اور عالم ہستی کی تدبیر ابتدائے خلقت کی طرح خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سود و زیاں اور نفع و نقصان کا مالک وہی ہے اور اس کے علاوہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے ــ اس کے باوجود کیا خدا کے علاوہ کوئی معبودیت کے اہل ہے؟

Marfat.com

۲۔ خود ہی سوال اور خود ہی جواب: محلِ بحث آیت سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو کیونکر یہ حکم دیتا ہے کہ مشرکین سے سوال کریں کہ آسمان و زمین کا پروردگار اور مالک کون ہے اور اس کے بعد بغیر جواب کا انتظار کیے اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس سوال کا جواب دیں اور اس کے بعد بلا فاصلہ ان مشرکین کو سرزنش کی گئی ہے کہ وہ بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں۔

یہ سوال و جواب کا کیسا طریقہ ہے؟

ایک نقطے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ایک سوال کا جواب اس قدر واضح ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ مدمقابل کے جواب کا انتظار کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ ہم کسی سے سوال کرتے ہیں کہ اس وقت رات ہے یا دن اور پھر بلا فاصلہ ہم خود جواب دیتے ہیں کہ یقیناً رات ہے۔ یہ دراصل اس امر کے لیے ایک لطیف کنایہ ہے کہ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ جواب کے انتظار کرنے کی محتاج نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مشرکین خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے اور وہ ہرگز یہ بات نہیں کہتے تھے کہ بت زمین و آسمان کے خالق ہیں بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ شفیع ہیں اور انسان کو نفع و نقصان پہنچانے پر قادر ہیں اور اسی بناء پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی عبادت کرنا چاہیے۔ لیکن چونکہ "خالقیت" اور "ربوبیت" (عالمِ ہستی کی تدبیر اور اس کے نظام کو چلانا) ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے لہٰذا مشرکین پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے اور انہیں کہا جا سکتا ہے کہ تم جو خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہو تو ربوبیت کو بھی اس کے ساتھ مخصوص سمجھو اور اس کے ساتھ عبادت بھی اسی سے مخصوص ہو گی۔

۳۔ چشمِ بینا اور روشنی لازم و ملزوم ہیں: آیت میں "نابینا و بینا" اور "ظلمات و نور" دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک حقیقتِ عینی کے مشاہدہ کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ چشمِ بینا کی بھی اور نور کی شعاعوں کی بھی۔ ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو مشاہدہ ممکن نہیں۔ لہٰذا سوچنا چاہیے کہ ان لوگوں کی کیا حالت ہو گی کہ جو ان دونوں سے محروم ہوں، بینائی سے بھی اور نور سے بھی۔ اس کا حقیقی مصداق مشرکین ہیں کہ جن کی چشمِ بصیرت بھی اندھی ہے اور جن کی زندگی کو بھی کفر و بت پرستی کی تاریکی نے گھیر رکھا ہے اسی لیے وہ تاریک گھاٹیوں اور گڑھوں میں سرگرداں ہیں۔ جب کہ ان کے برعکس مومنین نگاہِ بینا رکھتے ہیں۔ ان کا پروگرام واضح ہے اور انہوں نے نورِ وحی اور تعلیماتِ انبیاء کی مدد سے اپنی زندگی کو صحیح راستے پر ڈال لیا ہے۔

۴۔ کیا خدا کی خالقیت جبر و اکراہ کی دلیل ہے؟ نظریہ جبر کے بعض طرفداروں نے محلِ بحث آیت کے جملے "اللہ خالق کل شیء" سے اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کاموں کا خالق بھی خدا ہے یعنی ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔

اس بات کا دو طریقوں سے جواب دیا جا سکتا ہے:

پہلا یہ کہ اس آیت کے دوسرے جملے اس بات کی پورے طور پر نفی کرتے ہیں کیونکہ ان میں بت پرستوں کو بڑی ملامت کی گئی ہے۔ اگر واقعاً ہم اپنے اعمال میں کوئی اختیار نہیں رکھتے تو پھر تنبیہ اور سرزنش کس بناء پر؟ اگر خدا چاہتا ہے کہ ہم بت پرست رہیں تو پھر وہ کیوں سرزنش کرتا ہے اور کیوں ہدایت کے لیے اور راہ بدلنے کے لیے استدلال کرتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ لوگ اپنی راہ انتخاب کرنے میں آزاد اور مختار ہیں۔

دوسرا یہ کہ ہر چیز میں خالقیت بالذات خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن پھر بھی یہ چیز اپنے افعال میں ہمارے مختار ہونے کے منافی

Marfat.com

نہیں ہے کیونکہ ہماری طاقت اور ہماری عقل بلکہ ہمارے ارادے کی آزادی سب کے سب اسی کی جانب سے ہیں۔ اس بنا پر ایک لحاظ سے وہ بھی خالق ہے (تمام چیزوں کا خالق حتیٰ کہ ہمارے افعال و اعمال کا خالق) اور ہم بھی فاعل مختار ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے طول میں ہیں نہ کہ عرض میں۔ وہ فعل کے تمام وسائل اور ذرائع پیدا کرنے والا ہے اور ہم خیر یا شر کے راستے پر ان وسائل سے استفادہ کرنے والے ہیں۔

یہ بالکل اس طرح ہے جس طرح سے کوئی شخص بجلی گھر یا پانی سپلائی کا مرکز تیار کرکے ہمارے اختیار میں دے دیتا ہے۔ مسلم ہے کہ ہم اس بجلی یا پانی سے جس طرح کا بھی استفادہ کریں اس کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھا لیکن اس کے باوجود آخری فیصلہ خود ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اس بجلی سے کسی قریب المرگ بیمار کے لیے آپریشن تھیٹر کو روشن کریں یا ایک برائی کے مرکز کو۔ اسی طرح پانی سے کسی تشنہ لب کو سیراب کریں اور پھولوں کے پودوں کی آبیاری کریں یا کسی بے گناہ کے گھر کی بنیادوں میں پانی ڈال کر اسے تباہ کر دیں۔

Marfat.com

۱۷۔ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِیَۃٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّیۡلُ
زَبَدًا رَّابِیًا ؕ وَمِمَّا یُوۡقِدُوۡنَ عَلَیۡهِ فِی النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡیَۃٍ اَوۡ مَتَاعٍ
زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَقَّ وَالۡبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ
فَیَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ کَذٰلِکَ
یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ؕ۝

ترجمہ

۱۷۔ خدا نے آسمان سے پانی بھیجا اور ہر دَرّہ اور دریا سے ان کی مقدار کے مطابق سیلاب امنڈ پڑا پھر پانی کے ریلوں پر جھاگ پیدا ہو گئی اور جن (بھٹیوں) میں زیورات یا اسباب زندگی تیار کرنے کے لیے آگ روشن کرتے ہیں ان سے بھی جھاگ نکلنے لگی —— اس طرح خدا حق اور باطل کے لیے مثال بیان کرتا ہے۔ لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے اور لوگوں کے لیے فائدہ رساں چیز) پانی یا خالص دھات) زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ خدا اسی طرح سے مثال بیان کرتا ہے۔

تفسیر

حق و باطل کی منظر کشی

قرآن کہ جو تعلیم و تربیت کی کتاب ہے اس کی روش ہے کہ وہ مسائلِ عینی کی بنیاد پر گفتگو کرتا ہے لہٰذا اس میں پیچیدہ مسائل کو ذھن نشین کروانے کے لیے لوگوں کی روزمرہ زندگی سے عمدہ، خوبصورت اور حسی مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔ زیرِ نظر آیت میں بھی توحید و شرک، ایمان و کفر اور حق و باطل کے بارے میں گزشتہ آیات میں ذکر کیے گئے حقائق کو مجسم کرنے کے لیے ایک بہت ہی رسا اور عمدہ مثال بیان کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے (انزل من السماء ماء)۔ زندگی بخش اور حیات آفریں پانی —— نشوونما اور حرکت کا سرچشمہ پانی۔

اس وقت یہ پانی زمین کے دروں، گڑھوں، دریاؤں اور نہروں میں ان کی وسعت کے مطابق سما جاتا ہے (فسالت اودیة بقدرها)۔

Marfat.com

چھوٹی چھوٹی ندیاں ایک دوسرے سے گلے ملتی ہیں — تو دریا وجود میں آتے ہیں — دریا باہم مل جائیں تو دامنِ کہسار سے سیلاب عظیم امنڈ پڑتا ہے — پانی کندھوں اور سروں سے بلند ہو جاتا ہے اور جو کچھ اس کی راہ میں آتا ہے اسے بہالے جاتا ہے۔ ایسے میں پانی کی موجیں اور لہریں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو جھاگ پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: سیلاب کے اُوپر جھاگ اٹھتی ہے (فاحتمل السیل زبدًا رابیًا)۔

"رابیا" کا مادہ "ربو" (بروزن "غلو") ہے۔ یہ بلندی و برتری کے معنی میں ہے۔ "ربا" کہ جو سود یا اضافی رقم یا اضافی جنس کے معنی میں ہے وہ بھی اسی مادہ سے اسی معنی میں ہے چونکہ یہ اضافے اور زیادتی کا معنی دیتا ہے۔

جھاگ صرف بارش برسنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ جو دھاتیں آگ کے ذریعے پگھلتی ہیں تاکہ ان سے زیورات یا دیگر اسبابِ زندگی تیار کیے جائیں ان سے بھی پانی کی جھاگ کی طرح جھاگ نکلتی ہے (و مما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ)[1]

یہ ایک ایسی وسیع مثال بیان کی گئی ہے جو صرف پانی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دھاتوں کے بارے میں بھی ہے چاہے وہ دھاتیں زیورات بنانے کے لیے استعمال ہوتی ہوں یا دیگر اسبابِ حیات تیار کرنے کے کام آتی ہوں۔ اس کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس طرح خدا حق اور باطل کے لیے مثال بیان کرتا ہے (کذٰلک یضرب اللہ الحق والباطل)۔

پھر اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے اور وہ پانی کہ جو لوگوں کے لیے مفید اور سود مند ہوتا ہے زمین میں باقی رہ جاتا ہے (فاما الزبد فیذھب جفاء و اما ماینفع الناس فیمکث فی الارض)۔

فضول شوریلی اور اندر سے خالی جھاگ کہ جو ہمیشہ اُوپر اُوپر ہوتی ہے لیکن کوئی فائدہ بخش نہیں ہوتی اسے ایک طرف پھینک دینا چاہیے لیکن خاموش، بے صدا، متواضع، مفید اور سود مند پانی باقی رہ جاتا ہے اور اگر زمین کے اُوپر نہ ہو تو زمین کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ رواں چشموں اور کنوؤں کی صورت میں زمین سے نکل آتا ہے اور تشنہ کاموں کو سیراب کرتا ہے۔ درختوں کو بارآور، گلوں کو شگفتہ اور پھلوں کو تیار کرتا ہے اور ہر چیز کو سرو سامانِ حیات عطا کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے طور پر اور اس آیت میں زیادہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس طرح خدا مثالیں بیان کرتا ہے (کذٰلک یضرب اللہ الامثال)۔

چند اہم نکات

اس معنی خیز مثال میں نہایت موزوں الفاظ اور جملے استعمال ہوئے ہیں۔ حق و باطل کی منظر کشی نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے حقائق پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

---

[1] اس جملے کا لفظی ترجمہ یہ ہے
جس پر زیور یا اور متاع حاصل کرنے کے لیے آگ روشن کرتے ہیں اس سے پانی کی جھاگ کی طرح جھاگ حاصل ہوتی ہے۔
یہ تعبیر ان کٹھالیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں دھاتیں پگھلانے کے لیے ان کے نیچے بھی آگ ہوتی ہے اور اُوپر بھی۔ اس طرح سے نیچے آگ ہوتی ہے پھر اس کے اُوپر ایسے پتھر کہ جن میں بہت سا مواد ہوتا ہے ڈالے جاتے ہیں اور پھر اس کے اُوپر بھی آگ ڈالتے ہیں۔ یہ بہترین قسم کی کٹھالی ہے کہ جن میں آگ نے پگھلنے کے قابل مواد کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہوتا ہے۔

Marfat.com

۱۔ **حق و باطل کی شناخت کے لیے علامتیں:** حق و باطل کی پہچان کہ جو درحقیقت واقعیت اور حقیقت کو خالی اور جعلی باتوں سے الگ کرنے کا نام ہے بعض اوقات انسان کے لیے اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ کسی حتمی اور یقینی علامت کو تلاش کرنا پڑتا ہے اور علامتوں کے ذریعے حقائق کو اوہام سے اور حق کو باطل سے جدا کر کے پہچاننا پڑتا ہے۔ قرآن نے مذکورہ مثال میں ان علامتوں کو اس طرح سے بیان کیا ہے:

الف: حق ہمیشہ مفید اور سود مند ہوتا ہے ___ آبِ شیریں کی طرح کہ جو باعثِ حیات ہے لیکن باطل بے فائدہ اور فضول ہوتا ہے۔ پانی کے اوپر والی جھاگ کسی کو سیراب کرتی ہے نہ درخت اُگاتی ہے۔ کٹھالی میں پگھلنے والی دھاتوں سے نکلنے والی جھاگ بھی نہ زیور بنانے کے کام آتی ہے نہ زندگی کا کوئی اور ساز و سامان۔ اگر اس جھاگ کا کوئی مصرف ہے تو پست اور بے وقعت جو کسی حساب شمار میں نہیں آتا۔ جیسے خس و خاشاک کو جلانے کے کام لایا جائے۔

ب: باطل ہمیشہ متکبر، بالانشین اور قال و قیل اور شور و غوغا سے پُر لیکن اندر سے خالی اور کھوکھلا ہوتا ہے لیکن حق متواضع، کم صدا، باعمل، بامقصد اور وزنی ہوتا ہے۔[1]

ج: حق ہمیشہ اپنے اُوپر تکیہ کرتا ہے لیکن باطل حق کی آبرو کا سہارا لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو حق کے لباس میں پیش کرے اور اس کے مقام سے استفادہ کرے۔ جیسے کہا جاتا ہے:

"ہر دروغی از راست فروغ می گیرد"

یعنی ___ ہر دروغ اور جھوٹ سچ سے فروغ حاصل کرتا ہے۔

کیونکہ اگر سچ بات دنیا میں نہ ہوتی تو کوئی شخص کبھی جھوٹ کا اعتبار نہ کرتا اور اگر خالص جنس دنیا میں نہ ہوتی تو کوئی ملاوٹی اور جعلی چیز سے فریب نہ کھاتا۔ اس بناء پر باطل کا کم عمر فروغ اور وقتی آبرو بھی حق کی وجہ سے ہے لیکن حق ہر جگہ اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی آبرو کا سہارا لیتا ہے۔

۲۔ **"زبد" کیا ہے؟** "زبد" پانی کے اوپر والی یا ہر قسم کی جھاگ کو کہتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آبِ شیریں پر بہت کم جھاگ آتی ہے کیونکہ پانی کے خارجی اجسام سے آلودہ ہونے کی وجہ سے جھاگ پیدا ہوتی ہے۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر حق اپنی اصل صفائی اور پاکیزگی پر رہے تو اس کے اطراف میں باطل کی جھاگ کبھی پیدا نہ ہوگی لیکن جب حق آلودہ اور گندے ماحول میں ہو اور حقیقت خرافات میں کھو جائے، درستی نادرستی سے مل جائے اور پاکیزگی ناپاکی سے خلط ملط ہو جائے تو باطل کی جھاگ اس کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے۔

اسی امر کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

---

[1] حضرت علی علیہ السلام اپنے متعلق اور اپنے دشمنوں، جیسے اصحاب جمل تھے، کے بارے میں فرماتے ہیں:

وقد ارعدوا وابرقوا ومع ھذین الامرین الفشل ولسنا نرعد حتی نوقع ولا نسیل حتی نمطر

وہ رعد و برق کی سی گرج چمک دکھاتے ہیں لیکن انجام کار سستی اور ناتوانی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس ہم جب تک کوئی کام انجام نہ دے لیں گرج چمک نہیں دکھاتے۔ ہم نہ برسیں تو سیلاب خروشاں نہیں اٹھاتے (ہمارا پروگرام عمل ہے نہ کہ باتیں کرنا)۔ (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۹)۔

Marfat.com

لو ان الباطل خلص من مزاج الحق لم یخف علی المرتادین ولو ان الحق خلص من لبس الباطل انقطعت عنہ السن المعاندین

اگر باطل حق سے نہ مل جائے تو حق کے متلاشیوں کے لیے مخفی نہ رہے اور اگر حق باطل سے جدا ہو جائے تو بدگو لوگوں کی زبان اس سے منقطع ہو جائے گی[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں درحقیقت تین تشبیہیں ہیں۔

۱۔ آسمان وحی سے آیاتِ قرآن کا نزول ــــ جسے بارش کے حیات بخش قطرات کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔ انسانوں کے دلوں کو ایسی زمینوں، دروں اور گہرائیوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی وسعت اور ظرف کے لحاظ سے استفادہ کرتے ہیں۔

۳۔ شیطانی وسوسوں کو پانی پر پیدا ہونے والی ایسی گندی جھاگ سے تشبیہ دی گئی ہے جو پانی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ پانی کے گرنے کی جگہ کی گندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی بناء پر نفس اور شیطان کے وسوسے خدائی تعلیمات میں سے نہیں ہیں بلکہ انسان کے دل کی آلودگی میں سے ہیں۔ بہرحال آخرکار یہ وسوسے مومنین کے دلوں سے برطرف ہو جاتے ہیں اور وحی کا آبِ شیریں باقی رہ جاتا ہے جو انسانوں کی ہدایت اور حیات کا موجب ہے۔

۳۔ **فائدہ ہمیشہ اہلیت کے اعتبار سے ہوتا ہے:** اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خدائی فیض کے مبداء میں کسی قسم کا کوئی بخل، محدودیت اور ممنوعیت نہیں ہے۔ جیسا کہ آسمانی بادل ہر جگہ بغیر کسی قید کے برستے ہیں اور زمین کے مختلف حصے اور درے اپنے وجود کی وسعت کے اعتبار سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جو زمین چھوٹی ہے اس کا حصہ کم ہے اور جو بڑی ہے اُس کا حصہ زیادہ ہے۔ انسانوں کے دل اور روحیں بھی خدائی فیض سے اسی اعتبار سے مستفید ہوتی ہیں۔

۴۔ **باطل سرگرداں ہے:** جس وقت سیلِ آب کسی صاف صحرا میں پہنچتا ہے اور پانی کا جوش و خروش مدہم پڑ جاتا ہے تو جو چیزیں پانی سے مخلوط ہوئی ہوتی ہیں آہستہ آہستہ تہ نشین ہو جاتی ہیں اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے۔ صاف و شیریں پانی نمایاں ہو جاتا ہے۔ باطل بھی اسی طرح پریشاں حال ہے وہ مفاد اٹھانے کے چکر میں ہے لیکن جس وقت سکون آتا ہے اور ہر شخص اپنے مقام پر بیٹھ جاتا ہے حقیقی معیار اور ضابطے حاکم میں ظاہر ہوتے ہیں تو پھر باطل کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور وہ جلد ہی رفو چکر ہو جاتا ہے۔

۵۔ **باطل صرف ایک لبادے میں نہیں ہوتا:** باطل کی خصوصیات میں سے ہے کہ لحہ بہ لحہ شکلیں اور لباس بدلتا رہتا ہے۔ تاکہ اگر اُسے ایک بہروپ میں پہچان لیا جائے تو وہ دوسرے میں اپنے تئیں چھپالے۔

مندرجہ بالا آیت میں بھی اس معاملے کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جھاگ نہ صرف پانی پر ظاہر ہوتی ہے بلکہ ہر کٹھالی اور سانچے میں سے کہ جس میں دھاتوں کو پگھلایا جاتا ہے نئی جھاگ نئی شکل میں اور نئے لباس میں آشکار ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حق و باطل ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہر بہنے والی چیز میں جھاگ اپنی خاص شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم شکلیں

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۰۔

Marfat.com

بدلنے سے دھوکا نہ کھائیں اور ہر جگہ باطل کو اس کی مخصوص صفات سے پہچان لیں کیونکہ اس کی صفات ہر جگہ ایک ہی طرح کی ہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان صفات کے حوالے سے باطل کو پہچان کر اسے حق سے الگ کر دینا چاہیے۔

۶۔ **ہر موجود کی بقاء اُس کے فائدے سے وابستہ ہے:** اس سلسلے میں زیرِ بحث آیت میں ہے کہ جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے باقی رہ جاتی ہے (واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض)۔

یعنی صرف پانی کہ جو باعثِ حیات ہے باقی رہ جاتا ہے اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے بلکہ دھات بھی چاہے وہ زیور کے لیے ہو چاہے اسبابِ زندگی تیار کرنے کے لیے اُس میں سے بھی خالص دھات جو مفید، سودمند یا صاف و شفاف اور خوبصورت و زیبا ہوتی ہے باقی رہ جاتی ہے اور جھاگ کو دور پھینک دیتی ہے۔

اسی طرح سے انسان، گروہ، مکاتب فکر اور پروگرام جس قدر سودمند ہیں اس قدر بقا و حیات کا حق رکھتے ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی انسان یا باطل مکتب و مذہب ایک مدت تک باقی رہ جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی حق کی وہ مقدار ہے جو اس میں ملا ہوا ہے اور وہ اتنی مقدار کے لیے حقِ حیات پیدا کر چکا ہے۔

۷۔ **حق باطل کو کس طرح باہر نکال پھینکتا ہے:** لفظ "جفاء" جو گر جانے اور باہر کی طرف جا پڑنے کے معنی میں ہے اپنے اندر ایک لطیف نکتہ لیے ہوتے ہے اور وہ یہ کہ باطل اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اور ہر وقت معاشرے سے باہر جا گرنا چاہتا ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب حق جوش میں آتا ہے اور جس وقت حق میں حرکت اور جوش و خروش پیدا ہوتا ہے تو باطل کسی برتن کی جھاگ کی طرح اچھل کر باہر جا پڑتا ہے اور یہ بات خود اس امر کی دلیل ہے کہ حق کو ہمیشہ جوش اور جنبش و خروش میں رہنا چاہیے تاکہ باطل کو اپنے سے دور رکھے۔

۸۔ **باطل اپنی بقاء میں حق کا مقروض ہے:** جیسا کہ ہم نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے اگر پانی نہ ہو تو جھاگ کبھی بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اسی طرح اگر حق نہ ہو تو باطل کے لیے فروغ و ظہور ممکن نہیں۔ اگر صالح اور اچھے لوگ نہ ہوتے تو کوئی شخص خائن اور دھوکا باز افراد سے متاثر نہ ہوتا اور ان کے فریب میں نہ آتا لہٰذا باطل کا یہ جھوٹا جولان اور فروغ بھی فروغِ حق سے بہرہ وری ہے:

کان دروغ از راست می گیرد فروغ

جھوٹ سچ سے فروغ پاتا ہے۔

۹۔ **حق اور باطل میں ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے:** قرآن نے یہاں حق و باطل کو مجسم کرنے کے لیے ایک ایسی مثال دی ہے جو کسی مکان و زمان سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو دنیا کے مختلف علاقوں میں انسانوں کے سامنے آتا رہتا ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حق و باطل کے مابین جنگ کوئی وقتی اور مقامی جنگ نہیں ہے۔ صاف اور آلودہ پانی کی یہ ندیاں مخلوق پر صور پھونکے جانے تک اسی طرح جاری رہیں گی مگر یہ کہ ایک آئیڈیل معاشرہ وجود میں آ جائے (مثلاً حضرت مہدی علیہ السلام کے دورِ قیام کا معاشرہ)۔ جو اس مبارزہ کے اختتام کا اعلان ہوگا۔ حق کا لشکر کامیاب ہو جائے گا۔ باطل کی بساط الٹ جائے گی۔ بشریت اپنی تاریخ کے نئے مرحلے میں داخل ہوگی اور جب تک یہ تاریخی مرحلہ نہ آ جائے ہر جگہ حق و باطل کے تصادم کی انتظار میں رہنا چاہیے اور باطل کے مقابلے کے لیے ضروری اہتمام کرنا چاہیے۔

Marfat.com

۱۰۔ زندگی جہاد و جستجو کے سائے میں: زیرِ بحث آیت میں دی گئی خوبصورت مثال انسانی زندگی کی اس بنیادی حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ زندگی بغیر جہاد کے اور بقا و سربلندی بغیر سعی و کوشش کے ممکن نہیں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ لوگ وسائل زندگی یا زیور کی تیاری کے لیے جو کچھ بھٹیوں اور کٹھالیوں میں ڈالتے ہیں اس میں سے ہمیشہ غیر ضروری مواد نکلتا ہے اور جھاگ پیدا ہوتی ہے اور یہ دو قسم کے وسائل یعنی ضروری اور رفاہی وسائل (ابتغاء حلیة او متاع) حاصل کرنے کے لیے اصلی مواد کو جو عالمِ طبیعت میں اصلی شکل میں نہیں مل سکتا اور ہمیشہ دوسری چیزوں میں ملا ہوتا ہے اسے آگ کی کٹھالی میں ڈالنا پڑتا ہے اور اسے پاک صاف کرنا پڑتا ہے تاکہ خالص دھات میسر آسکے اور یہ کام سعی و جستجو کے بغیر ممکن نہیں۔

اصولی طور پر دنیاوی زندگی کا مزاج یہ ہے کہ گلوں کے ساتھ خار، نوش کے ساتھ نیش، اور کامیابیوں کے ساتھ مشکلات ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے کی کہاوت ہے کہ:

— خزانے ویرانوں میں ہوتے ہیں اور ہر خزانے کے اوپر ایک اژدہا سویا ہوا ہے۔

کیا یہ ویرانے اور اژدہا سوائے مشکلات کے کسی اور چیز کا نام ہے کہ جو کامیابی کے راستے میں موجود ہیں۔

ایرانی داستانوں میں بھی رستم کی داستان میں ہے کہ وہ کامیابی تک پہنچنے کے لیے مجبور تھا کہ سات خوان سے گزرے کہ جن میں سے ہر ایک انبوہِ مشکلات کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر مثبت کام کے راستے میں درپیش ہوتی ہیں۔

بہرحال قرآن نے یہ حقیقت بار بار بیان فرمائی ہے کہ انسان کوئی کامیابی مشکلات اور تکالیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے قرآن میں مختلف عبارتیں ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ میں ہے:

ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستهم البأساء و الضراء و زلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معه متی نصر الله الا ان نصر الله قریب

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تم آسانی سے جنت میں جا پہنچو گے اور تمہیں وہ حوادث پیش نہیں آئیں گے جو گزشتہ لوگوں کو درپیش ہوئے۔ وہی لوگ کہ جنہیں دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوئیں اور وہ ایسے دکھ درد میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ اہلِ ایمان کہنے لگے خدا کی مدد کہاں ہے تو ان بہت ہی سخت اور دردناک لمحات میں خدائی نصرت ان کے پاس آپہنچی اور ان سے کہا گیا کہ خدائی مدد قریب ہے۔

قرآنی مثالیں

مباحث کی توضیح و تفسیر میں مثال کی تاثیر ناقابلِ انکار ہے۔ اسی بنا پر کسی بھی علم میں حقائق کے اثبات اور توضیح کے لیے اور انہیں ذہن کے قریب لانے کے لیے ہم مثال پیش کرنے سے بے نیاز نہیں ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک برمحل مثال کو جو مقصود سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور اس پر منطبق ہو مطلب کو آسمان سے زمین پر لے آتی ہے اور اسے سب کے لیے قابلِ فہم بنا دیتی ہے۔

بہرحال کہا جا سکتا ہے کہ مختلف علمی، تربیتی، اجتماعی اور اخلاقی مباحث میں مثال مندرجہ ذیل موثر اثرات رکھتی ہے۔

Marfat.com

۱۔ مثال مسائل کو حسی بنا دیتی ہے: انسان چونکہ زیادہ تر محسوسات سے مانوس ہے اور پیچیدہ عقلی حقائق نسبتاً افکار کی دسترس سے دور ہوتے ہیں لہٰذا حسی مثالیں ان دور دراز فاصلوں کو سمیٹ دیتی ہیں اور انہیں محسوسات کے آستانے پر لا کھڑا کرتی ہیں اور ان کے ادراک کو دلچسپ، شیریں اور اطمینان بخش بنا دیتی ہیں۔

۲۔ مثال راستے کو مختصر کر دیتی ہے: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک گہرا منطقی اور عقلی مسئلہ ثابت کرنے کے لیے انسان کو مختلف استدلالات کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر پھر بھی اس کے گرد ابہام موجود رہتا ہے لیکن ایک واضح اور مقصد سے ہم آہنگ مثال راستہ اس قدر مختصر کر دیتی ہے کہ استدلال کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور متعدد استدلالات کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

۳۔ مثال مسائل کو سب کے لیے یکساں بنا دیتی ہے: بہت سے علمی مسائل کہ جو اپنی اصل صورت میں صرف خواص کے لیے قابلِ فہم ہیں اور عامۃ الناس اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتے لیکن جب ساتھ مثال موجود ہو اور اس کے ذریعے وہ قابلِ فہم ہو جائیں تو ان سے سب لوگ مستفید ہوں گے چاہے وہ علم و دانش کے اعتبار سے جس درجے پر بھی ہوں۔ لہٰذا مثالیں علم و دانش کو عمومیت دینے کے اعتبار سے ناقابلِ انکار کارآمد چیز ہیں۔

۴۔ مثال مسائل کو زیادہ قابلِ اطمینان بنا دیتی ہے: کلیاتِ عقلی جس قدر بھی مستدل اور منطقی ہوں جب تک ذہن تک رہتے ہیں ان کے بارے میں کافی اطمینان پیدا نہیں ہوتا کیونکہ انسان ہمیشہ اطمینان کو عینیت اور ظاہری وجود میں ڈھونڈتا ہے اور مثال ذہنی مسائل کو عینیت بخشتی ہے اور انہیں عالمِ خارج میں واضح کر دیتی ہے۔ اسی لیے باور کرنے، قبول کرنے اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے مثال بہت موثر ہوتی ہے۔

۵۔ مثال ہٹ دھرموں کو خاموش کر دیتی ہے: اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسائل کلیات مستدل اور منطقی صورت میں پیش کیے جائیں تو ایک ہٹ دھرم شخص ان پر خاموش نہیں ہوتا اور اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے لیکن جب مسئلہ مثال کے قالب میں ڈھالا جائے تو اس کے لیے راستہ بند ہو جاتا ہے اور اس میں بہانہ جوئی کی مجال نہیں رہتی۔

نامناسب نہیں ہوگا اگر ہم اس موضوع کے لیے چند مثالیں پیش کریں تاکہ واضح ہو جائے کہ مثال میں کس قدر اثر ہے۔

جو لوگ یہ اعتراض کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ صرف ماں سے کس طرح پیدا ہو گئے اور کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص بغیر باپ کے پیدا ہو جائے، قرآن ان کے جواب میں فرماتا ہے:

ان مثل عیسی عند اللہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب

عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ جسے اس نے مٹی سے پیدا کیا۔ (آل عمران — ۵۹)

صحیح طرح سے غور کریں کہ ہم جس قدر بھی ہٹ دھرم لوگوں کے سامنے کہیں کہ یہ کام خدا کی لامتناہی قدرت کے سامنے نہایت معمولی ہے پھر بھی ممکن ہے وہ بہانے ڈھونڈیں لیکن جب ان سے یہ کہیں کہ کیا تم یہ مانتے ہو کہ حضرت آدمؑ کہ جو پہلے انسان تھے مٹی سے پیدا ہوئے تھے تو جو خدا ایسی قدرت رکھتا ہے وہ کسی بشر کو بغیر باپ کے پیدا کیوں نہیں کر سکتا۔

جن منافقوں نے اپنے نفاق کے زیرِ سایہ چند دن ظاہراً سکون و آرام سے بسر کیے ہیں قرآن مجید ان کے بارے میں ایک خوبصورت مثال پیش کرتا ہے۔ قرآن انہیں ایسے مسافر سے تشبیہ دیتا ہے جو تاریک بیابان سے گزر رہا ہے۔ رات اندھیری ہے بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرج

Marfat.com

ہے ہیں ۔ مسافر آندھی، طوفان اور بارش میں گرفتار ہو جاتا ہے ۔ وہ اس طرح سے سرگرداں ہے کہ اسے کسی طرف کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں جب آسمانی بجلی چمکتی ہے تو بیابان کی فضا چند لمحوں کے لیے روشن ہو جاتی ہے اور وہ ارادہ کرتا ہے کہ کسی طرف جائے تاکہ اسے راستہ مل جائے لیکن جلد ہی وہ بجلی خاموش ہو جاتی ہے اور وہ اسی طرح بیابان میں سرگرداں رہ جاتا ہے ۔ (بقرہ - ۲۰)

کیا سرگرداں منافق کی حالت کی تصویر کشی کے لیے کہ جو اپنی روحِ نفاق اور منافقانہ عمل سے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنا چاہتا ہو اس سے زیادہ جاذبِ نظر مثال ہو سکتی ہے ؟

یا یہ کہ جب ہم کچھ لوگوں سے کہتے ہیں کہ راہِ خدا میں خرچ کرو تو خدا تمہیں کئی گنا زیادہ اجر دے گا تو ہو سکتا ہے کہ عام لوگ اس بات کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن جب یہ کہا جائے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنا اس بیج کی مانند ہے جسے زمین میں ڈالا جائے کہ جس سے سات خوشے اُگتے ہیں اور ہر خوشے میں ہو سکتا ہے ایک سو دانے ہوں تو پھر یہ مسئلہ پوری طرح سے قابلِ فہم ہو جاتا ہے ___ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے :

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ (بقرہ - ۲۶۱)

عام طور پر ہم کہتے ہیں کہ ریاکاری والے اعمال فضول اور بے کار ہیں اور انسان کو ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہو سکتا ہے یہ بات کچھ لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم ہو کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک فائدہ مند عمل مثلاً ایک ہسپتال یا ایک مدرسہ اگرچہ دکھاوے اور ریاکاری کے ارادے سے ہو بارگاہِ قدرت میں بے وقعت ہو لیکن قرآن ایک مثال کے ذریعے اس بات کو پوری طرح سے قابلِ فہم اور دلچسپ بنا دیتا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :

فمثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل فترکہ صلدًا

ایسے اشخاص کا عمل پتھر کے ایک ٹکڑے کی مانند ہے کہ جس پر کچھ مٹی ڈال دی گئی ہو اور اس پر کچھ بیج چھڑک دیا جائے ۔ تو جس وقت بارش برستی ہے تو بجائے کہ یہ بیج بارآور ہو بارش اسے پتھر پر پڑی ہوئی سطحی مٹی کے ساتھ دھو ڈالتی ہے اور اسے ایک طرف پھینک دیتی ہے ۔ (بقرہ - ۲۶۴)

ریاکاری اور بے بنیاد اعمال کی بھی یہی حالت ہے ۔

ہم دور نہ نکل جائیں اسی زیرِ بحث مثال میں کہ جو حق و باطل کے مابین مقابلے کے بارے میں ہے اس میں معاملے کی کیسی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے اور اسے دقیق طور پر مجسم کیا گیا ہے ۔ تمہید، نتائج اور حق و باطل کی مخصوص صفات اور آثار میں سے ہر ایک کو اس ایک مثال میں اس طرح سے منعکس کیا گیا ہے کہ مسئلہ سب لوگوں کے لیے قابلِ فہم اور اطمینان بخش ہو گیا ہے ۔ اس کے پیش کیے گئے حقائق ہٹ دھرم افراد کو خاموش کر دینے والے ہیں نیز تمام چیزوں سے قطع نظر یہ مثال طولانی مباحث کی زحمت سے بچا دیتی ہے ۔

ایک روایت میں ہے کہ مادہ پرست امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا :

قرآن میں ہے کہ جس وقت دوزخیوں کے جسم کا چمڑا آگ کی شدت سے جل جائے گا تو ہم اسے دوسرا چمڑا پہنا دیں گے تاکہ وہ عذاب کا ذائقہ اچھی طرح سے چکھیں ۔ اس دوسرے چمڑے کا کیا گناہ ہے کہ اسے سزا اور عذاب دیا جائے ۔

اس کے جواب میں امامؑ نے فرمایا :

Marfat.com

وہ چمڑا بعینہ پہلے والا چمڑا بھی ہے اور اس کا غیر بھی ہے۔

سوال کرنے والے اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور اس جواب سے کچھ نہ سمجھ سکا لیکن امامؑ نے ایک ناطق مثال کے ذریعے معاملہ اس طرح سے واضح کر دیا کہ گفتگو کی گنجائش باقی نہ رہی۔ آپؑ نے فرمایا:

دیکھو! تم ایک پرانی اور خراب اینٹ کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہو پھر اسی خاک کو بھگو کر سانچے میں ڈالتے ہو اور اس سے ایک نئی اینٹ بناتے ہو۔ یہ وہی پہلے والی اینٹ ہے اور ایک لحاظ سے اس کی غیر بھی ہے[1]

یہاں ایک نکتے کا ذکر بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ مثال اپنے ان تمام مفید اور مؤثر اثرات کے باوجود اپنا بنیادی تقاضا تبھی پورا کر سکتی ہے جب وہ اس مطلب سے ہم آہنگ ہو جس کے لیے اسے پیش کیا جا رہا ہے ورنہ مثال خود گمراہ کنندہ ہو گی یعنی جیسے ایک صحیح اور ہم آہنگ مثال مفید اور مؤثر ہے اسی طرح ایک انحرافی اور غلط مثال گمراہی اور تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

اسی بنا پر منافقین اور بداندیش افراد ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرنے اور سادہ لوح افراد کو غافل کرنے کے لیے انحرافی اور غلط مثالوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے جھوٹ کے لیے مثال سے مدد لیتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہم انحرافی اور غلط مثالوں سے فائدہ اٹھانے والے ایسے افراد پر پوری توجہ سے نظر رکھیں۔

---

[1] اس حدیث کی تشریح تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۳۰۸ (اردو ترجمہ) میں ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں یہ حدیث مجالس شیخ اور احتجاج طبرسی کے حوالے سے ذکر کی گئی ہے۔

Marfat.com

۱۸۔ لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ
لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ
أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

ترجمہ

۱۸۔ ان لوگوں کے لیے کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کیا ہے نیک (انجام، جزا اور) نتیجہ ہے اور وہ کہ جنہوں نے اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا (وہ عذاب الٰہی کی وحشت میں اس طرح غرق ہوں گے کہ) اگر وہ سب کچھ جو زمین پر ہے اور اس کی مثل ان کی ملکت ہو اور وہ یہ سب کچھ عذاب سے نجات کے لیے دے دیں (لیکن وہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا) ان کے لیے بُرا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کس قدر بُرا ٹھکانا ہے۔

تفسیر

جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کریا

گزشتہ آیت میں حق و باطل کا چہرہ نمایاں کرنے کے لیے ایک رسا اور فصیح و بلیغ مثال پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد اب اس مقام پر ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا اور اس کے گرویدہ ہو گئے نیز ان افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے جنہوں نے حق سے روگردانی کرتے ہوئے باطل کی طرف رُخ کیا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ان لوگوں کے لیے، جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کر لیا ہے نیک جزا، سود مند نتیجہ اور عاقبتِ محمودہ ہے (للذین استجابوا لربھم الحسنیٰ)۔

"حسنیٰ" (نیکی) کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں ہر خیر و سعادت شامل ہے۔ نیک خصائل اور اخلاقی فضائل سے لے کر پاک و پاکیزہ اجتماعی زندگی، دشمن پر کامیابی اور بہشتِ جاوداں تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور وہ کہ جنہوں نے پروردگار کی یہ دعوت قبول نہیں کی ان کا انجام اس قدر بُرا اور رقت بار ہے کہ اگر تمام روئے زمین اور حتیٰ کہ اس کی مثل بھی ان کی ملکیت میں ہو اور وہ یہ سب کچھ اسے بُرے انجام سے نجات کے لیے دینے پر آمادہ ہوں

Marfat.com

تو بھی "ان سے یہ سب کچھ قبول نہیں کیا جائے گا" (والذین لم یستجیبوا لہ لو ان لھم ما فی الارض جمیعاً ومثلہ معہ لافتدوا بہ)۔

ان کے لیے عذاب اور سزا کے عظیم ہونے کی تصویر کشی کے لیے اس سے بڑھ کر رسا اور عمدہ تعبیر نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان تمام روئے زمین بلکہ اس کے دوگنا کا مالک ہو اور وہ یہ سب کچھ اپنے آپ کو بچانے کے لیے دے دے مگر وہ اس کے لیے فائدہ مند نہ ہو۔

یہ جملہ درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ ایک انسان کی آخری آرزو کہ جس سے برتر کا تصور نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ وہ تمام روئے زمین کا مالک ہو لیکن ستمگروں اور دعوتِ حق کے مخالفوں کو دیے جانے والے عذاب کی شدت اس حد تک ہے کہ وہ اس بات پر تیار ہوں کہ یہ آخری دنیاوی ہدف بلکہ اس سے بھی برتر و بالاتر کو فدیہ کے طور پر دے کہ آزاد ہو جائیں اور بالفرض اگر ان سے یہ قبول کر بھی لیا جاتا تو یہ صرف عذاب سے نجات ہوتی۔ لیکن دعوتِ حق قبول کرنے والوں کے لیے جو انتہائی عظیم اجر ہیں ان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "مثلہ معہ" صرف اسی معنی میں نہیں کہ پورے کرۂ زمین کی مانند ان کے پاس مزید ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس سے بڑھ کر جتنی زیادہ دولت و سلطنت کے مالک ہو جائیں وہ اپنی نجات کے لیے سب کچھ دینے پر تیار ہوں گے۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ انسان چونکہ ہر چیز اپنے لیے چاہتا ہے اور جب وہ خود عذاب میں غرق ہو تو پھر تمام دنیا کی مالکیت کا اسے کیا فائدہ۔

اس بدبختی (ساری دنیا دے کر بھی نجات حاصل نہ ہونا) کے بعد ایک اور بدبختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کا حساب کتاب سخت اور برا ہوگا (اولٰئک لھم سوء الحساب)۔

"سوء الحساب" سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف نظریات ہیں۔

بعض کا نظریہ ہے اس سے مراد ایسا حساب ہے جو بہت دقیق اور باریک بین ہو اور جس میں کوئی درگزر نہ ہو کیونکہ "سوء الحساب" ظلم و ستم کے معنی میں خدائے عادل کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ امامؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

فلاں شخص کو تجھ سے کیوں شکایت ہے۔

اس نے عرض کیا:

اسے یہ شکایت ہے کہ میں نے اپنا حق اس سے آخر تک لیا ہے۔

جب امامؑ نے یہ بات سنی تو غضب ناک ہو کر بیٹھ گئے، پھر فرمایا:

کانک اذا استقضیت حقک لم تسیٔ ارایت ما حکی اللہ عز وجل: و یخافون سوء الحساب، اتراھم یخافون اللہ ان یجور علیھم لا و اللہ ما خافوا الا الاستقصاء فسماہ اللہ عز وجل سوء الحساب فمن استقصی فقد اساء

گویا تیرا گمان ہے کہ اگر تو آخری مرحلے تک اپنا حق لے لے تو تُو نے کوئی برا نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے۔ کیا تو نے خدا کا یہ ارشاد نہیں دیکھا کہ جس میں اس نے فرمایا ہے:

و یخافون سوء الحساب

(اور بدکار برے حساب سے ڈرتے ہیں)۔

Marfat.com

کیا تیرا خیال ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ خدا ان پر ظلم کرے گا؟ ہرگز ایسا نہیں وہ تو اس سے ڈرتے ہیں کہ خدا ان کا حساب دقیق طور پر لے اور آخری مرحلے تک پہنچائے۔ خدا نے اس کا نام "سوء الحساب" رکھا ہے لہٰذا جس شخص نے حساب کرنے میں سخت گیری کی اُس نے بُرا حساب کیا ہے[1]

بعض دوسرے مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد یہ ہے کہ اُن کا محاسبہ سرزنش کے ساتھ ہوگا۔ اس سے ایک تو اصل حساب کی وحشت ہوگی اور اس کے علاوہ بھی وہ سرزنش کی تکلیف سے گزریں گے۔

بعض دیگر مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد "سوء الجزا" (بُرا بدلہ) ہے یعنی ان کے لیے بُری سزا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے ہم کہیں کہ فلاں شخص کا حساب پاک ہے یا فلاں شخص کا حساب تاریک ہے یعنی ان کے حساب کا نتیجہ اچھا یا بُرا ہے یا یہ کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص کا حساب اُس کے ہاتھ میں دے دو یعنی اُس کے کام کے مطابق اسے سزا یا بدلہ دو۔

یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب کی سب آیت کی مراد ہوں یعنی ایسے افراد کو سخت حساب سے گزرنا ہوگا اور محاسبے کے ساتھ ساتھ انہیں سرزنش بھی ہوگی اور حساب کے بعد انہیں بے کم و کاست سزا بھی دی جائے گی۔

آیت کے آخر میں ان کے لیے تیسرے عذاب یا سزا کے آخری نتیجے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ کیسا بُرا ٹھکانا ہے (وماْوٰھم جھنم و بئس المھاد)۔

"مھاد" اصل میں "مھد" کے مادہ سے تیار اور مہیا کرنے کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ بستر کے معنی میں بھی آیا ہے کہ جس سے انسان آرام اور استراحت کے موقع پر استفادہ کرتا ہے کیونکہ وہ اسے استراحت کرنے کے لیے تیار اور آمادہ کرتا ہے۔

یہ لفظ اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے سرکش افراد بجائے بسترِ استراحت پر آرام کرنے کے آگ کے جلا دینے والے شعلوں پر رہیں گے۔

ایک نکتہ

آیاتِ الٰہی سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ گروہ ہے خدا کی بارگاہ میں جن کا حساب آسانی اور سہولت سے ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کسی قسم کی سخت گیری نہیں کرے گا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

فامامن اوتی کتابہ بیمینہ فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا ۙ

اس دن جسے نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اُس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ (انشقاق — ۸-۷)

اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ ہیں جن سے "شدت" کے ساتھ حساب لیا جائے گا۔ ان سے ذرہ ذرہ اور مثقال بھر کا حساب نہایت باریک بینی سے لیا جائے گا۔ جیسا کہ بعض شہر جن کے لوگ سرکش اور گنہگار تھے، ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

فحاسبنٰھا حسابًا شدیدًا وعذبنٰھا عذابًا نکرًا

پس ہم نے ان کا بڑی سختی سے حساب لیا اور انہیں بُرے عذاب کی سزا دی۔ (طلاق — ۸)

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۹۰ (یہ حدیث اگرچہ اس سورہ کی آیہ ۲۱ کی تفسیر کے ضمن میں آئی ہے لیکن واضح ہے کہ یہ لفظ "سوء الحساب" کا عمومی مفہوم بیان کر رہی ہے)

Marfat.com

اسی طرح زیرِ بحث آیت ہے جس میں " سوء الحساب " کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

یہ اس بناء پر ہے کہ کچھ لوگ دنیاوی زندگی میں دوسروں سے حساب لینے میں بہت زیادہ سختی کرتے ہیں یعنی بال کی کھال اتارنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنے حق کا آخری پیسہ تک وصول کرلیں اور جب دوسرے سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی ہے تو آخری حد امکان تک اُسے سزا دیتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی بیوی، اولاد، بھائیوں اور دوستوں تک سے ذرّہ بھر درگزر نہیں کرتے اور چونکہ دوسرے جہان کی زندگی اس جہان کا ردّعمل ہے لہٰذا خدا بھی ان کے حساب کتاب میں ایسی سخت گیری کرے گا تاکہ انہوں نے جو کام بھی کیا ہے اس کے جواب دہ ہوں اور ان کے بارے میں کچھ بھی درگزر اور چشم پوشی نہیں کی جائے گی۔ اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو آسان گیر ہیں بہت زیادہ درگزر کرنے والے ہیں اور نہایت شفیق و مہربان ہیں۔ خصوصاً دوستوں اور جان پہچان والے افراد یا جن پر ان کا کوئی حق ہے یا جو افراد ضعیف اور کمزور ہیں ان کے لیے ایسے مہربان اور بزرگوار ہیں کہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے بہت سے مواقع پر اپنے آپ کو غافل ظاہر کریں اور بعض کی غلطیوں اور گناہوں سے چشم پوشی کرلیتے ہیں البتہ یہاں گناہوں سے مراد ایسے گناہ ہیں جو شخصی اور انفرادی پہلو رکھتے ہیں۔ خدا ایسے افراد کے لیے آسانی فراہم کرتا ہے۔ انہیں اپنی عفوِ بے پایاں اور رحمتِ وسیع سے نوازتا ہے اور انہیں آسانی سے حساب کی منزل سے گزار دیتا ہے۔

یہ بات تمام انسانوں کے لیے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو کسی امر کے سربراہ یا نگران ہوتے ہیں اور لوگوں سے ان کا رابطہ اور تعلق ہوتا ہے ان کے لیے ایک عظیم درس ہے۔

Marfat.com

۱۹۔ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰىؕ
اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِۙ ○
۲۰۔ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَۙ ○
۲۱۔ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِؕ ○
۲۲۔ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِۙ ○
۲۳۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ
وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ
بَابٍۚ ○
۲۴۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِؕ ○

ترجمہ

۱۹۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے، اُس شخص کی طرح
ہے جو نابینا ہے بس سمجھ دار لوگ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔
۲۰۔ وہی کہ جو عہدِ الٰہی کو وفا کرتے ہیں اور پیمان شکنی نہیں کرتے۔
۲۱۔ وہی کہ جو وہ پیوند برقرار رکھتے ہیں کہ جن کے بارے میں خدا نے حکم دیا ہے اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں
اور (روزِ قیامت کے) حساب کی برائی سے ڈرتے ہیں۔

Marfat.com

۲۲۔ اور وہ کہ جو اپنے پروردگار کی (پاک) ذات کے لیے صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انہیں جو روزی دی ہے اس میں سے پنہاں اور آشکار خرچ کرتے ہیں اور حسنات کے ذریعے سیئات کو ختم کرتے ہیں۔ ان کے لیے آخرت میں اچھا گھر ہے۔

۲۳۔ وہ جنت کے سدا بہار باغوں میں داخل ہوں گے اسی طرح ان کے آباء، ازواج اور اولاد میں سے صالح افراد بھی (داخلِ بہشت ہوں گے) اور ہر دروازے سے ان کے لیے فرشتے داخل ہوں گے۔

۲۴۔ (اور ان سے کہیں گے) سلام ہو تم پر، صبر و استقامت کی بناء پر۔ تمہیں یہ آخری گھر کیسا اچھا نصیب ہوا ہے۔

تفسیر

اہلِ شعور کا طرزِ عمل ـــ جنت کے آٹھ دروازے

زیرِ نظر آیات میں حق کے طرفداروں کے اصلاحی طرزِ عمل کے جزئیات کی تصویرکشی کی گئی ہے۔ یہ آیات گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہیں۔
زیرِ نظر پہلی آیت میں استفہامِ انکاری کی صورت میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے، اس شخص جیسا ہے جو نابینا ہے؟ (افمن یعلم انما انزل الیک من ربک الحق کمن ھو اعمٰی)۔

یہ کیسی عمدہ تعبیر ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص جانتا ہے کہ یہ قرآن برحق ہے کیا وہ اس کی مانند ہے کہ جو نہیں جانتا بلکہ فرمایا کیا جو جانتا ہے وہ اندھے کی طرح ہے؟ یہ تعبیر ایک اس امر کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ اس حقیقت کو نہ جاننا کسی طرح بھی ممکن نہیں سوائے اس کے کہ انسان کے دل کی آنکھ بالکل بے کار ہو چکی ہو ورنہ کیسے ممکن ہے کہ چشمِ بینا رکھنے والا رخِ آفتاب نہ دیکھ سکے اور اس قرآن کی عظمت بالکل نورِ آفتاب کی مانند ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: صرف وہ لوگ نصیحت پاتے ہیں جو اولوا الالباب ہیں اور صاحبانِ فکر و نظر ہیں (انما یتذکر اولوا الالباب)۔

"الباب" جمع ہے "لب" کی جو ہر چیز کے "مغز" کے معنی میں ہے۔ اسی بناء پر "اولوا الالباب" کا متضاد بے مغز، کھوکھلے اور وہ افراد ہیں جن کے اندر کچھ نہ ہو۔

بعض عظیم مفسرین کے بقول یہ آیت لوگوں کو حصولِ علم اور جہالت کا زیادہ سے زیادہ مقابلہ کرنے کی تاکید کرتی ہے کیونکہ اس میں بے علم اور دانش سے محروم افراد کو نابینا قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد "اولوا الالباب" کی تفسیر کے طور پر صاحبانِ حق کے طرزِ عمل کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے ایفائے عہدِ الٰہی اور پیمان شکنی

Marfat.com

نہیں کرتے (الذین یوفون بعہد اللہ و لا ینقضون المیثاق)۔

اس میں شک نہیں کہ "عہد اللہ" (عہد الٰہی) کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ اس میں فطری عہد و پیمان کہ جو خدا نے تقاضائے فطرت کے مطابق انسان سے لیے ہیں وہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً توحید اور حق و عدالت سے انسان کی فطری محبت کا عہد۔ اسی طرح عقلی عہد و پیمان یعنی وہ عہد کہ جو غور و فکر، سوچ بچار اور قوتِ عقل کے نتیجے میں ناگزیر ہو جاتے ہیں جیسے عالم ہستی اور مبداء و معاد کے حقائق کا ادراک انہیں غور و فکر کے نتیجے میں کرلیتا ہے۔ اسی طرح اس میں شرعی پیمان بھی شامل ہیں یعنی وہ پیمان جو پیغمبر نے مومنین سے لیا ہے کہ وہ احکام خداوندی کی اطاعت کریں گے اور اس کی نافرمانی اور گناہ ترک کردیں گے۔

یونہی وہ پیمان کہ جو انسان دوسرے انسانوں سے باندھتا ہے عہد الٰہی کے مفہوم میں شامل ہیں کیونکہ خدا ہی کا حکم ہے کہ یہ پیمان بھی پورے کیے جائیں بلکہ ایسے پیمان تشریعی بھی ہیں اور عقلی بھی۔

اہل شعور کے لائحہ عمل کا دوسرا حصہ رشتے ناتوں کی حفاظت اور پاسداری ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے: یہ وہی لوگ ہیں جو ان رشتوں اور رابطوں کو قائم رکھتے ہیں جن کی حفاظت کا خدا نے حکم دیا ہے (والذین یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل)۔

اس سلسلے میں اس سے زیادہ وسیع تعبیر نہیں مل سکتی کیونکہ انسان کا تعلق خدا سے بھی ہے، انبیاء سے بھی ہے اور رہبروں سے بھی ہے۔ انسان کا رابطہ باقی تمام انسانوں کے ساتھ بھی ہے چاہے وہ دوست ہوں، ہمسائے ہیں، رشتہ دار ہوں، دینی بھائی ہوں یا ہم نوع ہوں۔ اس کا تعلق خود اپنے ساتھ ہے۔ مندرجہ بالا حکم میں تمام رشتے ناتوں کو محترم شمار کیا گیا ہے۔ سب کا حق ادا کرنا چاہیے اور ایسا کام انجام نہیں دینا چاہیے جس سے ان میں سے کسی ایک سے تعلق منقطع ہونے تک جا پہنچے۔

درحقیقت انسان ایک ایسا موجود نہیں جو دوسرے سے کٹ کر اور جدا ہو کر رہ سکے بلکہ اس کا وجود سرتاپا رشتے ناتوں، تعلق اور رابطوں سے تشکیل پاتا ہے۔

ایک طرف سے اس کا تعلق پیدا کرنے والے کی بارگاہ سے ایسا ہے کہ اگر یہ اسے منقطع کرے تو نابود ہو جائے۔ جیسے ایک بلب کا رابطہ اگر بجلی پیدا کرنے والے مبداء سے کٹ جائے۔ لہٰذا جیسے تکوینی لحاظ سے انسان اس عظیم مبداء سے تعلق رکھتا ہے چاہیے کہ تشریعی اعتبار سے بھی اُس کے ساتھ اطاعت کا رشتہ برقرار رکھے۔

دوسری طرف اس کا رشتہ پیغمبر اور امام سے رہبر، راہنما اور پیشوا کے حوالے سے ہے اور اگر یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو انسان بے راہ رو اور سرگرداں ہو جائے گا۔

تیسری طرف انسان کا ایک رشتہ پورے انسانی معاشرے سے بھی ہے خصوصاً ان افراد سے جو اس پر زیادہ حق رکھتے ہیں جیسے ماں باپ، رشتہ دار، دوست اور مربی۔

چوتھی طرف اپنی ذات سے بھی اس کا ایک تعلق ہے اس لحاظ سے وہ اپنے مصالح کی حفاظت اور اپنی ترقی اور کمال تک پہنچنے کا ذمہ دار ہے۔

درحقیقت ان تمام رشتوں اور رابطوں کو برقرار رکھنا "یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل" کا مصداق ہے اور ان میں سے کسی کو منقطع کرنا "ما امر اللہ بہ ان یوصل" کو منقطع کرنا ہے کیونکہ خدا نے ان تمام کے "وصل" کا حکم دیا ہے۔

Marfat.com

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ان احادیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو آیت کی تفسیر میں کبھی خاندان اور رشتہ داروں سے تعلق کو قائم رکھنے کا کہتی ہیں، کبھی امام اور پیشوائے دین سے مربوط رہنے کا کہتی ہیں، کبھی آل محمدؐ سے رابطے کا حکم دیتی ہیں اور کبھی تمام اہل ایمان سے تعلق کا کہتی ہیں۔

مثلاً ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ سے "الذین یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل" کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو ـــــ

فقال قرابتك

فرمایا: تیرے اپنے قریبی مراد ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام ہی سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

نزلت فی رحم آل محمد و قد یکون فی قرابتك

یہ جملہ آل محمدؐ کے رشتے کے بارے میں ہے نیز تیرے اپنے قریبیوں کے بارے میں بھی ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ امامؑ نے فرمایا:

فلا تکونن ممن یقول للشیء انه فی شیء واحد

تو ایسا شخص نہ ہو جا کہ جو آیت کے معنی کو ایک ہی مصداق میں منحصر کر دے۔[2]

یہ جملہ آیات قرآنی کے معانی کی وسعت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے جس کی ہم نے بار ہا نشاندہی کی ہے۔

نیز ایک تیسری حدیث بھی اسی عظیم راہنما سے مروی ہے جس میں آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

هو صلة الامام فی کل سنة بما قل او کثر ثم قال و ما ارید بذلك الا تزکیتکم

اس سے مراد مسلمانوں کے امام اور پیشوا سے ہر سال مالی امداد کے ذریعے رشتہ برقرار رکھنا ہے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

اس کام سے میری مراد صرف یہ ہے کہ تمہیں پاک و پاکیزہ کروں۔[3]

حامیان حق کا تیسرا اور چوتھا طرز عمل یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور قیامت کی عدالت کے حساب کی برائی سے خوف کھاتے ہیں (ویخشون ربھم و یخافون سوء الحساب)۔

اس سلسلے میں کہ "خشیت" اور "خوف" میں کیا فرق ہے جب کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں، بعض نے کہا ہے کہ "خشیت" وہ خوف ہے جو دوسرے کے احترام اور علم و یقین کی بنیاد پر ہو۔ لہٰذا قرآن میں یہ حالت علماء سے مخصوص شمار کی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء

---

[1] نورالثقلین جلد ۲ ص۴۹۴۔

[2] نورالثقلین جلد ۲ ص۴۹۴۔

[3] نورالثقلین جلد ۲ ص۴۹۵۔

Marfat.com

بندگانِ خدا میں سے صرف علماء اُس سے خشیت رکھتے ہیں ۔ (فاطر ۔ ۲۸)

لیکن قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں استعمال ہوا ہے ان بہت سے مواقع کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ بالکل "خوف" کے مترادف کے طور پر آیا ہے اور اس کا ہم معنی ہے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا پروردگار سے ڈرنا اس کے حساب کتاب اور عذاب و سزا سے ڈرنے کے علاوہ کوئی اور خوف ہے ۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر "یخشون ربھم" اور "یخافون سوء الحساب" کے درمیان کیا فرق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا سے ڈرنا ہمیشہ اور لازماً اس کے عذاب اور حساب کتاب سے ڈرنے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ خوف اس کے مقام کی عظمت کا احساس ہے اور بندگی کی ذمہ داری کے سنگین ہونے کے خیال سے ہے (یہاں تک کہ سزا اور عذاب کی طرف توجہ کے بغیر بھی یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے) ۔ اہلِ ایمان کے دلوں میں یہ احساس خود بخود ایک خوف اور وحشت کی حالت پیدا کر دیتا ہے ۔ وہ خوف جو ایمان کی پیداوار ہے ، عظمتِ الٰہی سے آگہی کا نتیجہ ہے اور اس کی بارگاہ میں احساسِ مسئولیت کی بدولت ہے (سورہ فاطر کی آیہ ۲۸ ممکن ہے اسی معنی کی طرف اشارہ ہو) ۔

ایک اور سوال یہاں "سوء الحساب" کے حوالے سے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا قیامت میں واقعاً محاسبہ اعمال کے موقع پر بعض افراد کو "بدحسابی" کا سامنا کرنا پڑے گا ۔

گزشتہ چند آیات کے ذیل میں ہم اس سوال کا جواب ذکر کر چکے ہیں ۔ وہاں بھی بالکل یہی لفظ استعمال ہوا ہے ۔ وہاں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کسی درگزر کے بغیر تمام جزئیات کا باریک بینی سے حساب لیا جانا ہے ۔ اصطلاحاً جیسے بال کی کھال اتارنا کہتے ہیں ۔ اس سلسلے میں ایک جاذبِ نظر حدیث بھی وارد ہوئی ہے جو وہاں بیان کی جا چکی ہے ۔

نیز جیسا کہ ہم نے وہاں کہا ہے یہ احتمال بھی ہے کہ "سوء الحساب" سے مراد ایسا محاسبہ ہو کہ جس میں سرزنش بھی شامل ہو ۔ بعض نے "سوء الحساب" کی تفسیر "سوء الجزا" یعنی بری سزا کے طور پر کی ہے ۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں کا حساب چکا دو یعنی اسے سزا دو ۔

ہم نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "سوء الحساب" کا ایک جامع مفہوم ہے اور اس میں یہ تمام معانی شامل ہیں ۔

ان کا پانچواں طرزِ عمل تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت ہے ، وہ مشکلات کہ جو اطاعت ، ترکِ گناہ ، دشمن کے خلاف جہاد اور ظلم و سرکشی کے مقابلے کے راستے میں پیش آتی ہیں[1] وہ صبر و استقامت بھی پروردگار کی رضا اور خوشنودی کی خاطر ہو ۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے : وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں (والذین صبروا ابتغاء وجہ ربھم) ۔

ہم بارہا صبر کے معنی کہ جو استقامت کے وسیع مفہوم کا حامل ہے ، کے بارے میں وضاحت کر چکے ہیں ۔ رہا "وجہ ربھم" تو اس کے دو میں سے ایک معنی ہیں ۔

پہلا یہ کہ "وجہ" ایسا مواقع پر "عظمت" کے معنی میں ہے جیسے کسی اہم نظریے اور رائے کے بارے میں کہا جاتا ہے :

---

[1] صبر صرف اطاعت ، معصیت سے بچنے اور مصیبت کے موقع پر منحصر نہیں ہے بلکہ نعمت کے موقع پر بھی صبر کرنا چاہیے یعنی وہ انسان کو مغرور اور بے لگام نہ بنا دے

Marfat.com

هذا وجه الرأی

یعنی — یہ اہم رائے ہے۔

اور یہ شاید اس بناء پر ہے کہ اصل میں "وجہ" کا معنی ہے "چہرہ" اور انسان کا چہرہ ظاہری بدن کا اہم ترین حصہ ہے کیونکہ بینائی، شنوائی اور گویائی جیسے اہم اعضاء اس میں موجود ہیں۔

دوسرا یہ کہ "وجہ رب" یہاں "پروردگار کی رضا" کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ لوگ حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں۔ اس معنی میں "وجہ" کا استعمال اس بناء پر ہے کہ جب انسان کسی کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے چہرے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے (اس بناء پر "وجہ" یہاں کنایۃً آیا ہے)۔

بہرصورت یہ جملہ اس امر کے لیے ایک واضح دلیل ہے کہ صبر و شکیبائی بلکہ کلیۃً ہر عمل خیر اسی صورت میں قدر و قیمت رکھتا ہے جب "ابتغاء وجه الله" اور خدا کے لیے ہو اور اگر اس کے کوئی اور اسباب ہوں مثلاً ریاکاری اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنا کہ وہ سمجھیں کہ یہ بڑا صابر اور نیکوکار شخص ہے یا حتیٰ اپنے غرور کے پیش نظر کوئی کام انجام دے تو پھر اس کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں ہے۔

بعض مفسرین کے بقول کبھی انسان ناگوار حوادث پر صبر کرتا ہے تاکہ لوگ کہیں کہ یہ کس قدر صابر اور صاحبِ استقامت ہے، کبھی اس خوف سے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ کیسا کم ظرف آدمی ہے، کبھی اس لیے کہ دشمن اسے طعنہ نہ دیں، کبھی اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ بے تابی اور داد و فریاد یہاں فضول ہے اور کبھی اس لیے کہ لوگوں کے سامنے اپنی مظلومیت پیش کرے تاکہ لوگ اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، ان امور میں سے کوئی بھی نفس انسانی کے کمال کی دلیل نہیں ہے۔ لیکن جس وقت حکم خدا کی اطاعت کی بناء پر اور اس لیے کہ زندگی میں رونما ہونے والے ہر حادثے کی کوئی وجہ، حکمت اور مصلحت ہوتی ہے کوئی شخص صبر و استقامت سے کام لیتا ہے اور اس طرح وہ اس حادثے کی عظمت کو ختم کر دیتا ہے، کفران میں زبان نہیں کھولتا اور ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو جزع و فزع کی دلیل بنے تو یہی وہ صبر ہے کہ جس کی طرف آیت بالا میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہی صبر "ابتغاء وجه الله" شمار ہوتا ہے۔

ان کا چھٹا طرزِ عمل یہ ہے کہ "وہ نماز قائم کرتے ہیں" (واقاموا الصلوٰة)۔

نماز قائم کرنا اگرچہ عہدِ الٰہی کو وفا کرنے کے مصادیق میں سے ہے بلکہ خدائی رشتوں کی حفاظت کا ایک زندہ مصداق ہے اور ایک لحاظ سے صبر و استقامت کے مصادیق میں سے ہے لیکن ان کلی مفاہیم کے بعض مصادیق بہت اہم ہیں جو انسانی سرنوشت میں بہت زیادہ مؤثر ہیں لہٰذا ان کی خصوصی طور پر نشاندہی کی گئی ہے۔

اس سے بڑھ کر اہم کیا بات ہوگی کہ انسان ہر صبح و شام خدا سے اپنے رابطے اور تعلق کی تجدید کرے، اس کے ساتھ راز و نیاز کے لیے کھڑا ہو، اس کی عظمت اور اپنی ذمہ داریوں کو یاد رکھے اور اس عمل کے ذریعے اپنے قلب و روح سے گناہ کا گرد و غبار اور زنگ دھو ڈالے اور اپنے قطرۂ وجود کے ہستیِ حق کے بیکراں سمندر سے ملحق ہونے کا شرف حاصل کرے — جی ہاں! نماز میں یہ تمام برکات و اثرات موجود ہیں۔

اس کے بعد حق جُو افراد کا ساتواں طرزِ عمل اس طرح سے بیان کیا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ ہمارے عطا کردہ رزق سے پنہاں و آشکار خرچ کرتے ہیں (وانفقوا مما رزقناهم سرًّا وعلانية)۔

انفاق اور زکوٰۃ کا مسئلہ فقط اسی آیت میں نماز کے بعد بیان نہیں ہوا بلکہ بہت سی آیاتِ قرآن میں زکوٰۃ کو نماز کے پہلو میں رکھا گیا ہے

Marfat.com

کیونکہ ان میں سے ایک چیز انسان کے رشتے کو "خدا" سے مستحکم کرتی ہے اور دوسری مخلوق سے تعلق کو۔

یہاں اگر ہم "مما رزقناھم" کی طرف توجہ دیں تو وہ ہر قسم کی عنایت وبخشش کے بارے میں ہے چاہے مال ہو یا علم، طاقت وحیثیت ہو یا اجتماعی اثر ورسوخ ایسا ہونا ضروری بھی ہے کیونکہ انفاق اور خرچ کرنے کا ایک پہلو نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ خرچ تمام پہلوؤں سے اور تمام نعمات سے ہونا چاہیے۔

"سرا وعلانیۃ" (پنہاں اور آشکار) — یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک اور اشارہ ہے کہ وہ اپنے معارف میں اس حقیقت کی طرف بھی نظر رکھتے ہیں کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر انفاق مخفی طور پر ہو تو وہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر دوسرے کی حیثیت کا تقاضا ہو کہ اسے مخفی رکھا جائے یا انفاق کرنے والا ریا اور دکھاوے سے بچنا چاہتا ہو اور کبھی انفاق آشکار طور پر کیا جائے تو اس کا اثر زیادہ وسیع ہوتا ہے مثلاً ایسے مواقع پر جب کہ ایسا کرنا دوسروں کی تشویق کا باعث بنے اور انہیں اس عمل کی اقتداء کی ترغیب دے اور انفاق کرنے والے کا ایک عمل ایسے سینکڑوں اور ہزاروں کاموں کا سبب بنے۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مثبت عمل کی انجام دہی کے لیے قرآن کس قدر باریک بینی سے کام لیتا ہے وہ صرف اصل کام کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ تاکید کرتا ہے کہ اصل عمل بھی خیر ہو اور اس کے انجام پانے کی کیفیت بھی اچھی ہو (ایسے مواقع پر جہاں ایک کام کی انجام دہی مختلف کیفیات سے ممکن ہو)۔

آخر میں اُس کا آٹھواں اور آخری طرزِ عمل بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ "حسنات" (نیکیوں) کے ذریعے اپنی "سیئات" (برائیوں) کو ختم کردیتے ہیں (ویدرءون بالحسنۃ السیئۃ)۔

اس معنی میں کہ وہ ایک گناہ اور لغزش کے ارتکاب پر صرف پشیمان ہونے اور ندامت واستغفار پر قناعت نہیں کرتے بلکہ عملی طور پر تلافی کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور جس قدر ان کا گناہ اور لغزش زیادہ ہو اسی قدر حسنات اور نیکیاں بھی زیادہ سے زیادہ انجام دیتے ہیں تاکہ اپنے اور معاشرے کے وجود سے گناہ کی آلودگی کو حسنات کے پانی سے دھو ڈالیں۔

"یدرءون" "درء" (بروزن "زرع") کے مادہ سے دفع کرنے کے معنی میں ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ برائی کی تلافی برائی کے ذریعے نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص کی طرف سے انہیں برائی پہنچے تو اس کے حق میں نیکی انجام دے کر اسے شرمندہ ہونے اور تجدید نظر پر آمادہ کریں۔ جیسا کہ سورہ فصلت کی آیہ ۳۵ میں ہے:

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم

بدی کو اس طریقے سے اپنے سے دور کر جو زیادہ اچھا ہے کیونکہ اس موقع پر وہ شخص جس کے اور تیرے درمیان عداوت ہے اپنا چہرہ یوں بدل لیتا ہے گویا وہ تیرا مخلص اور پکا دوست ہے۔

بہر حال اس میں کوئی مانع نہیں کہ زیر بحث آیت دونوں مفاہیم لیے ہوئے ہو۔ احادیث اسلامی میں بھی کچھ احادیث دونوں تفاسیر بیان کرتی ہیں۔

ایک حدیث پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپ معاذ بن جبل سے فرماتے ہیں:

اذا عملت سیئۃ فاعمل بجنبھا حسنۃ تمحھا

Marfat.com

جب کوئی بُرا کام کر بیٹھو تو اس کے ساتھ ہی کوئی ایسا نیک کام انجام دو جو اُسے محو کر دے [1]

نہج البلاغہ میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عاتب اخاك بالاحسان الیہ وارد دو شرہ بالانعام علیہ۔

اپنے بھائی کو غلط کام انجام دینے پر نیکی کے ذریعے سرزنش کرو اور اس کے شر کو انعام واحسان کے ذریعے اس کی طرف پلٹا دو [2]

البتہ اس طرف توجہ رہے کہ یہ ایک اخلاقی حکم ہے جو بعض مواقع سے مخصوص ہے کہ جہاں اس قسم کا طرزِ عمل موثر ہوتا ہے ورنہ حدود جاری کرنا اور بدکاروں کو سزا دینا اسلام کے قوانین میں سے ہے اور ان تمام افراد کے لیے یکساں طور پر ہے کہ جو اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

مختلف طرزِ عمل کے ذکر کے بعد "اولوا الالباب"، صاحبانِ فکر ونظر، طرفداران حق اور ایسے طریقوں پر عمل کرنے والوں کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: دوسرا گھر جو نیک اور اچھی عاقبت کا حامل ہے، ان کے لیے ہے (اولئك لھم عقبی الدار)[3]

بعد والی آیت میں اس نیک انجام اور عاقبتِ خیر کی توضیح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کا انجام کار جنت کے دائمی باغات ہیں کہ جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے صالح اور نیک آباؤ اجداد، ازواج اور اولاد بھی (جنات عدن یدخلونھا ومن صلح من اٰبائھم وازواجھم وذریاتھم)۔ اور جو چیز ان عظیم اور بے پایاں نعمتوں کی تکمیل کرتی ہے یہ ہے کہ "ہر دروازے سے ان کے لیے فرشتے داخل ہوں گے" (والملائکۃ یدخلون علیھم من کل باب)۔ اور انہیں کہیں گے "تم پر سلام ہو تمہارے صبر واستقامت کی بناء پر" (سلام علیکم بما صبرتم)۔ ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اور شدائد ومصائب برداشت کرنے میں تمہارا صبر واستقامت ہے جو اس سلامتی کا باعث ہوا ہے۔ یہاں انتہائی امن، آرام اور چین سے رہو گے —— یہاں نہ جنگ وجدل ہے، نہ نزاع ہے، نہ سختی ہے، نہ مخالفت ہے اور نہ جھگڑا، ہر جگہ امن ہی امن ہے اور تمام چیزیں تمہارے سامنے تبسم کناں ہیں اور ایسا آرام وسکون جس میں اضطرابِ قلب کا شائبہ تک نہیں وہ یہیں پر ہے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے: یہ کیسا اچھا انجام اور کیسی اچھی عاقبت ہے (فنعم عقبی الدار)۔

چند اہم نکات

۱۔ صرف "صبر" کا ذکر کیوں ہوا ہے؟ "سلام علیکم بما صبرتم" کے جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتے اہلِ جنت سے یوں کہیں گے: "تم پر تمہارے صبر واستقامت کی وجہ سے سلام ہو"، حالانکہ مندرجہ بالا آیت میں ان کے آٹھ قسم کے اچھے کاموں اور اہم طرز ہائے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس جملے میں آٹھ امور میں سے صرف "صبر" کی نشاندہی کی گئی ہے۔

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نہج البلاغۃ، کلمات قصار جملہ ۵۸۔

[3] "عقبیٰ"، عاقبت اور انجام کار کے معنی میں ہے چاہے اچھا ہو یا بُرا لیکن قرینہ حالیہ ومقالیہ کی طرف توجہ کی جائے تو مذکورہ آیت میں اس سے مراد عاقبت خیر ہے۔

Marfat.com

اس امر کی وجہ حضرت علیؑ کے ایک زندہ اور پُرمغز بیان سے بھی جا سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ان الصبر من الایمان کالرأس من الجسد ولا خیر فی جسد لا رأس معه ولا فی ایمان لا صبر معه۔

صبر کی ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کی جسم سے ہے۔ بدن سر کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا اور ایمان بھی صبر کے بغیر کوئی وقعت نہیں رکھتا۔[1]

درحقیقت تمام انفرادی اور اجتماعی اصلاحی پروگراموں کا سہارا صبر و شکیبائی اور استقامت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ان میں سے کچھ بھی انجام نہیں پا سکتا کیونکہ ہر مثبت کام کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں ہوتی ہیں کہ جن پر صبر و استقامت کی قوت کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی نہ ایفائے عہد صبر و استقامت کے بغیر ممکن ہے، نہ خدائی رشتوں کی حفاظت اس کے بغیر ہو سکتی ہے، نہ اس کے بغیر خدا اور عدالت قیامت کا خوف ہوتا ہے، نہ اس کے بنا قیام نماز ممکن ہے، نہ خدائی نعمتوں میں سے اس کے بغیر خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے بغیر حسنات کے ذریعہ خطاؤں کی تلافی ہو سکتی ہے۔

۲۔ جنت کے دروازے: آیات قرآن سے بھی اور روایات سے بھی یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جنت کے دروازے ہیں لیکن یہ متعدد دروازے اس بنا پر نہیں ہیں کہ جنت میں داخل ہونے والوں کی تعداد اس قدر ہے کہ اگر وہ ایک ہی دروازے سے داخل ہونا چاہیں تو زحمت ہوگی، نہ ہی اس کی وجہ یہ ہے کہ طبقات میں اختلاف ہے اور جس کی بنا پر ہر گروہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دروازے سے آئے، نہ ہی اس کی وجہ راستے کی نزدیکی یا دوری ہے اور نہ ہی دروازوں کی کثرت خوبصورتی زیبائی اور تنوع کا باعث ہے۔ اصولی طور پر جنت کے دروازے دنیا کے دروازوں کی طرح نہیں ہیں کہ جو باغات، محلات اور مکانات میں داخل ہونے کے لیے ہوتے ہیں بلکہ یہ دروازے اعمال و کردار کی طرف اشارہ ہیں کہ جو جنت میں داخل ہونے کا سبب ہوں گے۔ اسی لیے چند ایک احادیث میں ہے کہ جنت کے دروازوں کے مختلف نام ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام "باب المجاهدین" (مجاہدین کا دروازہ) ہے اور مجاہدین اسی اسلحہ سے مسلح ہو کر اس دروازے سے جنت میں داخل ہوں گے کہ جس کے ساتھ وہ جہاد کرتے تھے اور فرشتے انہیں "خوش آمدید" کہیں گے۔[2]

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: (واعلموا ان للجنة ثمانية ابواب عرض كل باب منها مسيرة اربعين سنة)۔

جان لو کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں کہ جن میں سے ہر دروازے کا عرض چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے۔[3]

یہ حدیث نشاندہی کرتی ہے کہ ایسے مواقع پر دروازے کا مفہوم ہماری روزمرہ کی گفتگو سے وسیع تر ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قرآن حکیم میں ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں:

---

[1] نہج البلاغہ۔ کلمات قصار جملہ ۸۲۔

[2] منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغہ جلد ۳ ص۹۹۵۔

[3] خصال صدوق ابواب الثمانیۃ۔

Marfat.com

(لها سبعة ابواب)　　　　(حجر - ۴۴)

اور روایات کے مطابق جنت کے آٹھ دروازے ہیں ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جہنم میں پہنچنے کے راستوں کی نسبت سعادت اور بہشتِ جاوداں تک پہنچنے کے راستے زیادہ ہیں اور خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے ۔ جیسا کہ دعائے جوشن کبیر کے الفاظ ہیں:

یامن سبقت رحمته غضبه

اس سے بھی زیادہ جاذبِ نظر امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں بھی "اولوا الالباب" کے طرز ہائے عمل کے بارے میں آٹھ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک دراصل جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور سعادتِ جاوداں تک پہنچنے کا راستہ ہے ۔

۳ - اہلِ جنت سے وابستگی رکھنے والے ان سے جاملیں گے : نہ صرف مندرجہ بالا آیت بلکہ قرآن کی دوسری آیات بھی یہ بات صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ جنت میں اہل بہشت اور ان کے ماں باپ ، بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک اور صالح ہوں گے داخل ہوں گے ۔ یہ درحقیقت ان پر خدائی نعمات کی تکمیل ہے تاکہ وہ وہاں کسی قسم کی کمی محسوس نہ کریں یہاں تک کہ جن افراد سے ان کا لگاؤ ہے ان کی جدائی بھی نہ ہو ۔ نیز چونکہ اس دارِ آخرت میں کہ جو نیا اور کامل گھر ہے ہر چیز تازہ اور نئی ہو جاتی ہے لہٰذا وہ لوگ بھی تازہ اور نئے چہروں کے ساتھ اور زیادہ خلوص و محبت کے ساتھ وہاں داخل ہوں گے ، ایسی مہر و محبت کہ جو نعماتِ بہشت کی قدر و قیمت کئی گنا کر دے گی ۔

مندرجہ بالا آیت میں اگرچہ صرف ماں باپ ، اولاد اور ازواج کا ذکر ہے لیکن درحقیقت وہاں تمام وابستگان اکٹھے ہوں گے کیونکہ اولاد اور ماں باپ (یا باپ دادا) کی موجودگی بہن بھائیوں کے بغیر بلکہ دیگر وابستگان کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ تھوڑا سا غور و خوض کیا جائے تو یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص جنتی ہوگا تو اس کا نیک اور صالح باپ بھی اس سے جا ملے گا اور چونکہ نیک باپ جنتی ہے لہٰذا اس کے تمام بیٹے اس سے آملیں گے ۔ اس طرح بھائی آپس میں مل جائیں گے اور اسی طرح دیگر وابستگان اور عزیز و اقارب اکٹھے ہو جائیں گے (غور کیجیئے گا) ۔

۴ - جناتِ عدن کیا ہے ؟ "جنات" کا معنی ہے "باغات" اور "عدن" کا معنی ہے "طولانی توقف" اور یہاں ابدیت اور ہمیشگی کے معنی میں ہے اور یہ جو "معدن" (کان) کو "معدن" کہتے ہیں وہ بھی اس جگہ کسی مواد کے طولانی توقف کی بنا پر ہے ۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اہلِ بہشت کے لیے ابدی اور جاودانی گھر ہے لیکن جیسا کہ ہم نے سورہ توبہ کی آیہ ۷۲ کے ذیل میں کہا ہے ، قرآن کی چند ایک آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جناتِ عدن جنت میں ایک مخصوص مقام ہے جو جنت کے دیگر باغات سے امتیاز رکھتا ہے اور اس میں صرف تین طرح کے لوگ رہیں گے انبیاء و مرسلین ، صدیقین (یعنی انبیاء کے خاص دوست احباب) اور شہداء[1]

۵ - گناہ کے آثار دُھلنا : اجمالی طور پر "حسنات" اور "سیئات" ایک دوسرے پر متقابل اثر رکھتے ہیں اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے ۔ حتیٰ کہ ہم اس چیز کے نمونے اپنی روزمرہ زندگی میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان سالہا سال زحمت اٹھاتا ہے اور بہت زیادہ محنت و مشقت کر کے سرمایہ جمع کرتا ہے لیکن ایک ناسمجھی ، ہوا و ہوس کی پیروی یا بے پرواہی سے اسے گنوا بیٹھتا ہے یہ

---

[1] مزید وضاحت کے لیے جلد ۸ ص۳ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں ۔

بالکل مادی حسنات کو گنوا بیٹھنے کے اور کچھ نہیں ہے جسے قرآن میں "حبط" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس کبھی انسان بہت سی غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے اور ان کے باعث سنگین خسارے کے بوجھ تلے دب جاتا ہے لیکن ایک عقلمندانہ عمل سے یا عاشقانہ جہاد کے ذریعے ان سب نقصانات کی تلافی کر دیتا ہے۔ مثلاً ہمارے زمانے کے اسی اسلامی انقلاب میں ہم نے بہت سے افراد دیکھے ہیں کہ وہ سابق ظالم و جابر نظام میں بہت سے گناہوں کے مرتکب ہوئے تھے اور اسی وجہ سے وہ جیل میں تھے لیکن جب ملک کے دشمنوں کے خلاف جہاد شروع ہوا تو اس وقت ان کی فوجی مہارت کی بناء پر انہیں میدان جنگ میں آنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے بھی بے نظیر شجاعت و فداکاری سے بیکر دشمن پر مہلک ضرب لگائی۔ اس دوران ان میں سے بعض شہید ہو گئے اور بعض زندہ ہیں۔ دونوں صورتوں میں انہوں نے اپنی گزشتہ غلطیوں کی تلافی کر لی۔

زیر بحث آیات کہ جن میں فرمایا گیا ہے:

ویدرءون بالحسنة السیئة

اہل ایمان عقلاء اور ارباب فکر و نظر اپنی برائیوں کو نیکیوں کے ذریعے دور کرتے ہیں۔

یہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کیونکہ غیر معصوم انسان کبھی کبھی غلطیوں اور لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس کے بعد وہ ان کی تلافی کی فکر میں رہے نہ صرف گناہ کے اجتماعی آثار کو اپنے اعمال خیر کے ساتھ دھو ڈالے بلکہ وہ ظلمت گناہ جو انسان کے قلب و روح پر جا پڑتی ہے اسے بھی "حسنات" کے ذریعے دور کرے اور اسے فطری نورانیت اور شفافیت کی طرف پلٹائے۔ قرآن کی زبان میں اس کام کو "تکفیر" (ڈھانپنا) اور پاک کرنا کہتے ہیں (اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۲۶ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں)۔

البتہ جیسا کہ ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں ہو سکتا ہے "ویدرءون بالحسنة" ایک اور اہم اخلاقی فضیلت کی طرف اشارہ ہو اور وہ یہ کہ "اولوا الالباب" دوسروں کی برائی کا برائی سے جواب نہیں دیتے اور انتقام لینے کی بجائے نیکی اور اچھائی کرتے ہیں تاکہ دوسرا خود شرمندہ ہو جائے، پاکیزگی کی طرف پلٹ آئے اور اپنی اصلاح کرے۔

Marfat.com

۲۵۔ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ○

۲۶۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ○ ع

ترجمہ

۲۵۔ اور وہ کہ جو عہد الٰہی کو مستحکم ہونے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان رشتوں کو قطع کر دیتے ہیں جنہیں قائم رکھنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور روئے زمین میں فساد کرتے ہیں ان کے لیے لعنت اور آخرت کے گھر کی بدی (اور سزا) ہے۔

۲۶۔ خدا جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) وسیع رزق دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) تنگ کر دیتا ہے لیکن وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہیں جب کہ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی متاع ناچیز ہے۔

تفسیر

دنیا پرست تباہ کار

چونکہ نیک و بد ہمیشہ ایک دوسرے سے موازنہ کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں لہٰذا "اولوا الالباب" اور حق پرست افراد کہ جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ آیات میں آیا ہے کی صفات بیان کرنے کے بعد محل بحث آیات کے کچھ حصے میں مفسدین اور وہ کہ جو واقعی اپنی عقل و فکر گنوا بیٹھے ہیں کی چند بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: اور وہ کہ جو عہدِ خداوندی کو محکم کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان رشتوں کو منقطع کر دیتے ہیں جنہیں قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور روئے زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان پر لعنت ہے اور دار آخرت کا عذاب ان کے لیے مخصوص ہے (والذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون

Marfat.com

فی الارض او لٓئک لهم اللعنة و لهم سوء الدار)۔

درحقیقت ان کے تمام اعتقادی و عملی مفاسد کا خلاصہ مذکورہ تین جملوں میں بیان کر دیا گیا ہے:

(۱) خدائی عہد و پیمان کو توڑنا جس میں فطری، عقلی اور شرعی عہد و پیمان شامل ہیں۔

(۲) روابط اور رشتوں کو منقطع کرنا ـــ خدا سے رابطہ، خدائی رہبروں سے رابطہ، مخلوق سے رابطہ اور اپنے آپ سے رابطہ۔

(۳) آخری حصہ کہ جو پہلے دو حصوں کا نتیجہ ہے ـــ روئے زمین میں فساد کرنا۔

جو شخص پیمانِ الٰہی توڑتا ہے اور ہر طرف کے رشتوں کو منقطع کر دیتا ہے کیا وہ فتنہ و فساد کے علاوہ کوئی کام انجام دے سکتا ہے۔ یہ کاوشیں ان لوگوں کی جانب سے مادی مفاسد کے لیے حتیٰ کہ خیالی مقاصد کے لیے کی جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں وہ کسی بلند مقصد کے قریب ہونے کی بجائے دور ہو جاتے ہیں کیونکہ "لعنت" رحمتِ خدا سے دوری کے معنی میں ہے[1]

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں "دار" (گھر اور سرائے) بصورتِ مطلق آیا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقی گھر آخرت والا گھر ہی ہے کیونکہ دوسرا ہر گھر آخر کار خلل پذیر ہو گا اور ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

بعد والی آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ روزی اور اس کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے: خدا جسے چاہتا ہے وسیع رزق دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے (الله یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ زیادہ سے زیادہ دنیا سمیٹنے کے لیے روئے زمین پر فساد کرتے ہیں وہ خدائی رشتوں کو توڑتے ہیں اور خدا کے ساتھ عہد شکنی کرتے ہیں تاکہ مادی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کر سکیں لیکن وہ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ رزق اور اس میں کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

علاوہ ازیں یہ جملہ ایک سوال کا جواب بھی ہو سکتا ہے جو آیت میں صراحت سے نہیں آیا اور وہ یہ کہ گزشتہ آیات میں حق و باطل کے طرفدار دو گروہوں کے ذکر کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا اپنے رزق اور نعمات سے کس طرح نوازتا ہے تو آیت اس سوال کے جواب میں کہتی ہے کہ روزی اور اس کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بہرصورت یہ روزی جلد گزر جانے والی متاع ہے جب کہ وہ چیز جسے اہمیت دی جانا چاہیے وہ آخرت کا گھر اور ابدی سعادت ہے۔

تاہم اس کے بارے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ رزق کے لیے "مشیتِ الٰہی" یہ نہیں کہ خدا انہیں بغیر حساب کے اور اسباب سے فائدہ اٹھائے بغیر کسی کو رزقِ فراواں دے دے یا اس کی روزی کم کر دے بلکہ اس کی مشیت کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اسے اس عالم کے اسباب کے اندر تلاش کرے کیونکہ: "ابی الله ان یجری الامور الا باسبابها" یعنی ـــ خدا چاہتا ہے کہ تمام امور اسباب کے ساتھ ہی رو پذیر ہوں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: عہد شکن اور فساد فی الارض کرنے والے دنیاوی زندگی پر بڑے خوش ہیں حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دنیاکی زندگی متاعِ ناچیز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی (و فرحوا بالحیٰوة الدنیا و ما الحیٰوة الدنیا فی الاٰخرة الا متاع)۔

---

[1] راغب نے کتاب مفردات میں کہا ہے: "لعن" اس طرح سے دور کرنے کے معنی میں ہے جس میں غصہ ملا ہوا ہو۔ جب آخرت میں خدا کی طرف اس لفظ کی اضافت ہو تو سزا کے معنی میں ہے اور دنیا میں رحمت منقطع ہونے کے معنی میں ہے اور اگر لوگوں کی طرف سے ہو تو پھر نفرین کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

نکرہ کی صورت میں "متاع" کا ذکر اس کا حقیر ہونا ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں:

فلاں موضوع "متاعی" بیش نیست

فلاں چیز "ایک متاع" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

یعنی ایک بے وقعت متاع ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ "مفسد فی الارض" کون ہے؟ "فساد" کہ جو "صلاح" (درستی) کا متضاد ہے ہر قسم کی تخریب کاری اور تباہ کاری کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ راغب نے مفردات میں کہا ہے:

الفساد خروج الشئ عن الاعتدال قلیلا کان او کثیرا ویضاده الصلاح، ویستعمل ذلك فی النفس والبدن والاشیاء الخارجة عن الاستقامة

چیزیں حالتِ اعتدال سے کسی طرح بھی خارج ہو جائیں، کم یا زیادہ، اسے فساد کہتے ہیں۔ اس کا متضاد "صلاح" ہے۔ یہ جان و بدن اور ان تمام اشیاء میں کہ جو حدِ اعتدال سے نکل جاتی ہیں متصور ہوتا ہے۔

اس بناء پر تمام خرابیاں جو مختلف کاموں میں پیدا ہوتی ہیں اور تمام انفرادی یا اجتماعی مسائل میں ہر قسم کا افراط و تفریط "فساد" کا مصداق ہیں۔

قرآن مجید میں بھی بہت سے مواقع پر "فساد" اور "صلاح" ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے ہیں۔ سورہ شعراء کی آیت ۱۵۲ میں ہے:

الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون

وہ لوگ کہ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں ہے:

واللہ یعلم المفسد من المصلح

خدا مفسدین کو مصلحین میں سے پہچانتا ہے۔

سورہ اعراف کی آیت ۱۴۲ میں ہے:

واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین

اصلاح کرو اور مفسدین کی راہ کی پیروی نہ کرو۔

بعض مواقع پر ایمان اور عمل صالح کو فساد کے مقابلے میں قرار دیا گیا ہے:

ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض

کیا ہم ایمان لانے والوں اور عمل صالح بجالانے والوں کو مفسدین فی الارض کی طرح قرار دیں۔ (ص - ۲۸)

دوسری طرف بہت سی آیاتِ قرآن میں لفظ "فساد" کو "فی الارض" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جو نشاندہی کرتا ہے کہ مسئلے کے اجتماعی پہلوؤں پر نگاہ ہے۔ یہ تعبیر قرآن میں بیس سے زیادہ مواقع پر دکھائی دیتی ہے۔

تیسری طرف قرآن مجید کی مختلف آیات میں "فساد" اور "افساد" ایسے گناہوں کے ساتھ آیا ہے جو شاید زیادہ تر مصداق کی حیثیت

Marfat.com

رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض گن و بہت بڑے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں۔ کبھی تو خدا اور رسول سے جنگ کے ہم پلہ ہو کر آیا ہے، مثلاً:

انما جزاؤا الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فسادًا

ان لوگوں کی جزا کہ جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کے درپے ہیں ..... (مائدہ۔۳۳)

کبھی نسل اور زراعت کو تباہ کرنے کے ہم پلہ قرار پایا ہے، مثلاً

و اذا تولّٰی سعٰی فی الارض لیفسد فیھا و یھلک الحرث و النسل

اور جہاں منہ پھیرا تو ادھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے لگا تاکہ زمین میں فساد پھیلائے اور زراعت اور نسل کا ستیاناس کر دے

(بقرہ۔ ۲۰۵)

کبھی اس کا ذکر ان رشتوں کو منقطع کرنے کے ساتھ آیا ہے جنہیں قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے، مثلاً:

الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون فی الارض

وہ لوگ کہ جو اس سے میثاق باندھنے کے بعد عہد الٰہی کو توڑ دیتے ہیں اور جن رشتوں کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں قطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ (بقرہ۔ ۲۷)

کبھی اسے بڑا بننے کی خواہش اور سرکشی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثلاً:

تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوًا فی الارض ولا فسادًا

یہ آخرت کا گھر ہے جو ہم نے ان لوگوں کے لیے قرار دیا ہے جو زمین پر بڑا ہونے کی خواہش اور فساد برپا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ (قصص۔ ۸۳)

کبھی قرآن "فرعون" کو مفسد گردانتا ہے اور دریائے نیل میں غرق ہوتے وقت اس کے توبہ کرنے کے متعلق کہتا ہے:

اٰلاٰن وقد عصیت قبل و کنت من المفسدین

اب ایمان لاتا ہے حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا۔ (یونس۔ ۹۱)

کبھی یہی لفظ "فساد فی الارض" چوری کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق ہے کہ انہوں نے چوری کی تہمت لگنے کے بعد کہا:

تاللہ لقد علمتم ما جئنا لنفسد فی الارض و ما کنا سارقین

بخدا تم جانتے ہو کہ ہم سرزمین مصر میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم کبھی بھی چور نہ تھے۔ (یوسف۔ ۷۳)

کبھی یہ لفظ کم فروشی کے ہم پلہ ہو کر آیا ہے، جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعے میں ہے کہ وہ اپنی قوم سے کہتے ہیں:

ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین

کم فروشی نہ کرو اور لوگوں کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین پر فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ (ہود۔ ۸۵)

اور کبھی نظامِ عالم ہستی اور جہانِ خلقت کو خراب اور تباہ کرنے کے معنی میں آیا ہے:

Marfat.com

لو کان فیهما آلهة الا الله لفسدتا

اگر زمین و آسمان میں اللہ کہ جو خدائے یگانہ ہے کے علاوہ اور خدا ہوتے تو یہ فاسد، خراب اور برباد ہو جاتے۔ (انبیاء - ۲۲)

ان تمام آیات سے کہ جو قرآن کی مختلف سورتوں میں آئی ہیں اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ "فساد" بطور کلی یا "فساد فی الارض" ایک بہت ہی وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس کے مفہوم میں بڑے بڑے جرائم مثلاً فرعون اور دوسرے آمروں کے جرائم اور ان سے کم تر کام یہاں تک کہ کم فروشی اور لین دین میں دھوکا بازی جیسے گناہ بھی شامل ہیں۔ فساد کے وسیع مفہوم یعنی حد اعتدال سے ہر قسم کا اخراج کی طرف توجہ رکھی جائے تو یہ وسعت پوری طرح قابلِ فہم ہے۔

نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ عذاب اور سزاؤں کو میزانِ جرم کے مطابق ہونا چاہیے، واضح ہوتا ہے کہ ان "مفسدین" میں سے ہر گروہ کو ایک الگ سزا ملنا چاہیے اور سب کے لیے ایک جیسی سزا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سورہ مائدہ کی آیہ ۳۳ کہ جس میں "مفسد فی الارض" کا ذکر "خدا اور رسول کے محارب" کے ساتھ آیا ہے، ان کے لیے چار قسم کی سزائیں ہیں۔ یقیناً حاکم شرع کے ذمہ ہے کہ وہ ان چار سزاؤں (قتل کرنا، سولی پر لٹکانا، ہاتھ پاؤں کاٹنا اور جلاوطن کرنا) میں سے جرم کی مقدار کے مطابق ایک سزا منتخب کرے، ہمارے فقہاء نے فقہی کتب میں محارب اور مفسد فی الارض کی بحث میں ان سزاؤں کی شرائط اور حدود تفصیل سے بیان کی ہیں۔[1]

ایسے مفاسد کی بیخ کنی کے لیے ہر موقع پر کسی ذریعے سے متمسک ہونا پڑے گا۔ کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پہلا مرحلہ یعنی پند و نصیحت اور تذکر ہی کافی ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا وقت آجاتا ہے کہ شدتِ عمل کے آخری درجہ یعنی جنگ کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

ضمناً فساد فی الارض کی تعبیر ہمیں انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ایک حقیقت کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور وہ یہ کہ اجتماعی مفاسد عام طور پر کسی خاص مقام سے تعلق نہیں رکھتے اور انہیں کسی ایک علاقے میں محصور نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کی وسعت پورے معاشرے اور پوری زمین تک ہوتی ہے اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ کی طرف سرایت کرتے ہیں۔

آیاتِ قرآنی سے یہ نکتہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بعثتِ انبیاء کے عظیم مقاصد میں سے ایک (وسیع مفہوم میں) زمین سے فساد ختم کرنا ہے۔ جیسا کہ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے کہ وہ اپنی سرکش قوم کے فساد کے مقابلے میں کہتے ہیں:

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت

میرا ہدف صرف یہ ہے کہ جتنا میری استطاعت میں ہے فساد کے خلاف جنگ کروں اور اصلاح کروں۔ (ہود - ۸۸)

۲۔ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن ...... : مندرجہ بالا آیات ہی نہیں جو کہتی ہیں کہ روزی کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے بلکہ قرآن کی مختلف آیات سے واضح طور پر یہی مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ خدا جس شخص کی چاہتا ہے روزی وسیع کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے کم کر دیتا ہے لیکن اس کا وہ مطلب نہیں جو بعض جاہل لوگ خیال کرتے ہیں کہ کوشش و کارکردگی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے اور گوشہ نشین ہو جانا چاہیے تاکہ جو کچھ مقدر میں ہے خدا دے دے۔ ان لوگوں کی منفی سوچ مذہب کو افیون قرار دینے والوں کے لیے بڑی اہم سند ہے۔

---

[1] ہم نے بھی سورہ مائدہ کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں (جلد ۴ صفحہ ۲۴۳ پر) اس سلسلے میں ضروری وضاحت کی ہے (اردو ترجمہ دیکھیے)۔

Marfat.com

یہ لوگ دو بنیادی نکتوں سے غافل ہیں:

پہلا یہ کہ خدا کا چاہنا اور اس کی مشیت وارادہ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہوا ہے وہ کوئی من پسند اور بغیر کسی کلیہ قاعدہ والا معاملہ نہیں بلکہ اسی طرح ہے جس طرح ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ خدا کی مشیت وارادہ اس کی حکمت سے جدا نہیں ہے بلکہ ہمیشہ لیاقت اور اہلیت پر موقوف ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ مسئلہ عالم اسباب کی نفی کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ عالم اسباب یعنی جہانِ تکوین بھی اس کی مشیتِ تکوینی ہے اور وہ کبھی بھی اس کی مشیت تشریعی سے جدا نہیں ہوتی۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رزق کی وسعت وتنگی کے بارے میں خدا کا ارادہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے کہ جو انسان کی زندگی پر حکم فرما ہیں۔ کوشش، ہمت اور اخلاص اور اس کے برعکس سستی، تن آسانی، بخل اور نیتوں کی آلودگی اس میں نتیجہ خیز اثر رکھتی ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید نے بار ہا انسان کو اس کی سعی وکوشش اور جہد وفعالیت کا مرہونِ منت شمار کیا ہے اور زندگی میں اس کے حصہ کو سعی وکوشش کی میزان پر تولا ہے۔ اسی لیے وسائل الشیعہ کی کتاب تجارت میں ایک باب حصولِ رزق کے لیے کوشش سے متعلق ہے نیز کچھ ابواب بیکاری، زیادہ سونے اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں سستی کی مذمت کے بارے میں بھی ہیں۔

ان ابواب میں منقول احادیث میں سے ایک حدیث جو امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے، یہ ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ان الاشیاء لما ازدوجت ازدوج الکسل والعجز فنتجا بینھما الفقر

جب شروع شروع میں موجودات نے ایک دوسرے سے ازدواج کیا تو سستی اور عجز وناتوانی نے آپس میں شادی رچائی اور ان سے جو بچہ پیدا ہوا وہ "فقر" تھا[1]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا تکسلوا فی طلب معایشکم فان اٰبائنا کانوا یرکضون فیھا ویطلبونھا

حصولِ رزق میں ضرورتِ زندگی مہیا کرنے میں سستی سے کام نہ لو کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد ان کے حصول میں دوڑا کرتے تھے اور ان کے لیے تلاش وجستجو کرتے تھے[2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

انی لا بغض الرجل ان یکون کسلانًا عن امر دنیاہ، وَمن کسل عن امر دنیاہ فھو عن امر اٰخرتہ اکسل۔

میں ایسے شخص سے ناراض ہوں جو اپنے کارِ دنیا میں سست ہو کیونکہ جو کارِ دنیا میں سست ہے (اگرچہ وہ اس کا نتیجہ جلد بھگتے گا تاہم) وہ آخرت کے معاملے میں زیادہ سست ہوگا[3]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صـ۳۷

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صـ۳۸

[3] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صـ۳۷

نیز امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ان اللہ تعالیٰ لیبغض العبد النوّام، ان اللہ لیبغض العبد الفارغ

یقیناً خدا تعالیٰ زیادہ سونے والے اور بیکار شخص سے ناراض ہے[1]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۳۷۔

Marfat.com

۲۷۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ ۝

۲۸۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۝

۲۹۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ ۝

ترجمہ

۲۷۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے آیت (اور معجزہ) کیوں نازل نہیں ہوتا۔ کہہ دو: خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو شخص اس کی طرف پلٹ آتا ہے اُسے ہدایت کرتا ہے (معجزے کی کمی نہیں ان کی ہٹ دھرمی رکاوٹ کا باعث ہے)۔

۲۸۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل یادِ خدا سے مطمئن (اور پُرسکون) ہیں یاد رکھو کہ یادِ خدا سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

۲۹۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیے پاکیزہ ترین (زندگی) اور بہترین انجام ان کا نصیب ہے۔

تفسیر

یادِ الٰہی باعثِ تسکینِ دل ہے

اس سورت میں چونکہ توحید، معاد اور رسالتِ پیغمبر کے بارے میں بہت سی مباحث ہیں لہٰذا زیر بحث پہلی آیت دوبارہ پیغمبر اسلام کی دعوت کے مسئلے کی طرف لے جاتی ہے۔ اس میں ہٹ دھرم منکرین کا ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، کافرین کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر معجزہ نازل کیوں نہیں ہوتا (ویقول الذین کفروا لولا انزل علیه اٰیة من ربه)۔

Marfat.com

لفظ "یقول" فعل مضارع ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بار بار اعتراض کرتے تھے اور باوجودیکہ انہوں نے رسول اللہؐ سے بارہا معجزات دیکھے تھے (اور ہر پیغمبر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حقانیت کے ثبوت میں کچھ معجزات پیش کرے) پھر بھی وہ بہانے تراشتے تھے اور گزشتہ معجزات کو نظرانداز کردیتے تھے اور اپنی من پسند کے نئے معجزے کا تقاضا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ لوگ اور تمام ہٹ دھرم منکرین ہمیشہ اپنی مرضی کے معجزات ڈھونڈتے رہتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ پیغمبر ایک جادوگر کی طرح کہیں بیٹھ جائیں اور ان میں سے ہر کوئی جائے اور جو معجزہ طلب کرے وہ فوراً پیش کردیں اور اگر پھر بھی یہ نہ چاہیں تو ایمان نہ لائیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ پہلے درجے میں انبیاء کی ذمہ داری ہے کہ تبلیغ، تعلیم اور تنبیہ کا ذریعہ اختیار کریں۔ معجزات تو استثنائی امور ہیں کہ جو حسبِ ضرورت وہ بھی حکم خدا سے (نہ کہ پیغمبر کی خواہش کے مطابق) انجام پاتے ہیں لیکن ہم بارہا آیاتِ قرآنی میں پڑھتے ہیں کہ دشمنوں کے کئی گروہ اس حقیقت کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ انبیاء کے خلاف مزاحمت کرتے رہے ہیں اور اس قسم کی فرمائشیں کرتے رہے ہیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: اے پیغمبر! ان سے کہہ دو خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو شخص اس کی طرف لوٹے اسے ہدایت کرتا ہے (قل ان اللہ یضل من یشاء و یھدی الیہ من اناب)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے لیے معجزے کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں کیونکہ پیغمبر نے کافی مقدار میں معجزات دکھائے ہیں کمی خود تمہارے وجود کے اندر ہے۔ ہٹ دھرمیاں، تعصبات، جہالتیں اور روہ گناہ کہ جو توفیق کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں تمہارے ایمان لانے میں حائل ہیں۔ لہٰذا خدا کی طرف لوٹ آؤ، توبہ کرو، جہالت وغرور اور خودخواہی کے پردے اپنی نگاہِ فکر سے ہٹاؤ تاکہ واضح طور پر جمالِ حق کا مشاہدہ کرسکو کیونکہ

جمالِ یار ندارد نقاب و پردہ ولی
غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد

جمالِ دوست پر تو کوئی نقاب نہیں ہے لیکن راستے کا گردوغبار بٹھا دو تاکہ میں اسے دیکھ سکوں۔

بعد والی آیت میں "من اناب" (جو خدا کی طرف پلٹ آئے ہیں) کی بہت عمدہ تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل ذکر الٰہی سے مطمئن اور پرسکون ہیں (الذین اٰمنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ)۔

اس کے بعد ایک دائمی اور وسیع اصول کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے: آگاہ رہو کہ یاد الٰہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں اور قرار پاتے ہیں (الا بذکر اللہ تطمئن القلوب)۔

زیر بحث آخری آیت میں اہل ایمان کا انجام کار بیان کرکے گزشتہ آیت کا مضمون یوں مکمل کیا گیا ہے، وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے صالح اعمال انجام دیے ان کے لیے بہترین زندگی ہے اور ان کا انجام کار بہترین ہوگا (الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت طوبٰی لھم و حسن مآب)۔

بہت سے بزرگ مفسرین نے لفظ "طوبٰی" کو "اطیب" کا مؤنث سمجھا ہے جس کا مفہوم ہے بہتر، پاکیزہ تر یا بہترین اور پاکیزہ ترین۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس کا متعلق محذوف ہے اس لفظ کا مفہوم ہر لحاظ سے وسیع اور غیر محدود ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "طوبٰی لھم" کے ذریعے ان کے لیے تمام سعادتوں اور پاکیزگیوں کی پیش بینی کی گئی ہے۔ ان کے لیے تمام چیزوں میں سے بہترین مہیا ہوں گی۔ بہترین زندگی، بہترین نعمتیں، بہترین آرام و سکون، بہترین دوست احباب اور پروردگار کی بہترین اور خاص مہربانیاں —— یہ سب کی سب

Marfat.com

ایمان و عملِ صالح کی مرہونِ منت ہیں ــــــ اور یہ ان کے لیے اجر ہے جو عقیدے کے لحاظ سے علم اور عمل کے لحاظ سے پاک، فعال، درست کار اور خدمت گزار ہیں۔

نیز اس لفظ کی مختلف مفسرین کی طرف سے جو مختلف تفسیریں ہوئی ہیں وہ سب اس کی مصداق ہیں۔ یہاں تک کہ مجمع البیان میں اس کے دس معانی ذکر ہوئے ہیں جو حقیقت میں اس کے وسیع معنی کے مختلف مصادیق ہیں۔

کئی ایک روایات میں بھی ہے کہ "طوبیٰ" ایک درخت ہے جس کی جڑیں جنت میں رسول اللہؐ یا حضرت علیؑ کے گھر میں ہیں اور اس کی شاخیں ہر جگہ تمام مومنین اور ان کے گھروں پر سایہ فگن ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ روایات ان عظیم پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں کے درمیان ان کے مقامِ رہبری اور نہ ٹوٹنے والے رشتوں کی تصویر کشی کرتی ہوں جن کا نتیجہ ایسی طرح طرح کی نعمات ہیں۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں لفظ "طوبیٰ" مؤنث کے طور پر آیا ہے اور "اطیب" نہیں آیا کہ جو مذکر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حیات یا نعمت کی صفت ہے اور یہ دونوں الفاظ مونث ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **یادِ الٰہی سے دل کو کیسے سکون ملتا ہے؟** انسانوں کی زندگی میں اضطراب اور پریشانی ہمیشہ سے ایک بڑی مصیبت کے طور پر موجود ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اس کے اثرات پوری طرح محسوس ہوتے ہیں۔ سکون و قرار ہمیشہ سے انسان کی زندگی کی ایک قیمتی گمشدہ چیز رہی ہے۔ اس کی تلاش میں انسان ہر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اگر ہم پوری تاریخ بشر میں صحیح یا غلط طریقے سے کی گئی ان کوششوں کا ذکر کریں کہ جو سکون و قرار حاصل کرنے کے لیے کی گئیں تو بہت ہی ضخیم کتاب بن جائے۔

بعض ماہرین اور علماء کہتے ہیں کہ بعض ہمہ گیر بیماریاں جب پھیلتی ہیں اور وباء کی صورت اختیار کر لیتی ہیں تو جو افراد ظاہراً اس وبائی بیماری کی وجہ سے مرتے ہیں ان میں سے اکثر خوف اور پریشانی کی وجہ سے دم توڑ دیتے ہیں تھوڑے ہی افراد ایسے ہوتے ہیں جو حقیقتاً اس وبائی بیماری میں مبتلا ہو کر ختم ہوتے ہیں۔

اصولی طور پر سکون و پریشانی فرد اور معاشرے کی سلامتی و بیماری اور سعادت و بدبختی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہ ایسی چیز نہیں ہے جس سے آسانی سے گزر جایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بہت سی کتابیں پریشانی اور اضطرابِ قلب پر قابو پانے اور آرام و سکون حاصل کرنے کے طریقوں پر لکھی گئی ہیں۔

تاریخ بشر ایسے غم انگیز مناظر سے بھری پڑی ہے کہ انسان نے تلاش سکون میں ہر چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا، وادی وادی پھرا اور طرح طرح کی عادتیں اپنائیں ــــــ

لیکن قرآن نے ایک مختصر اور پُرمغز جملے میں انتہائی اطمینان کے لیے نزدیک ترین راستے کی نشاندہی کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جان لو کہ یادِ خدا دلوں کے لیے آرام بخش اور باعثِ سکون ہے۔

اس قرآنی حقیقت کی وضاحت کے لیے ــــــ مندرجہ ذیل توضیح کی طرف توجہ کیجیے۔

پریشانی اور اضطراب کے عوامل (۱) اضطراب و پریشانی کبھی تاریک اور مبہم مستقبل کی فکر کی بنا پر ہوتی ہے۔ نعمتوں کا زوال، دشمن

Marfat.com

کے چنگل میں گرفتاری، ضعف و کمزوری، بیماری، ناتوانی، درماندگی اور حاجتمندی کا احتمال ـــــ یہ سب چیزیں انسان کو پریشان کر دیتی ہیں لیکن قادر و متعال اور رحیم و مہربان خدا پر ایمان ـــــ وہ خدا کہ جو ہمیشہ سے اپنے بندوں کی کفالت اپنے ذمہ لیے ہوئے ہے، ایسی پریشانیوں کو دُور کر سکتا ہے اور اسے سکون دے سکتا ہے۔ اس کی یاد یہ حوصلہ دے سکتی ہے کہ آنے والے حوادث کے مقابلے میں تو درماندہ اور بے یار و مددگار نہیں ہے تو توانا، قادر اور مہربان خدا رکھتا ہے۔

۲۔ کبھی ماضی کی تاریک زندگی فکرِ انسانی کو اپنی طرف مشغول رکھتی ہے اور ہمیشہ اسے پریشان کیے رہتی ہے ـــــ ان گناہوں پر پریشانی کہ جو اس نے انجام دیے ہیں اور وہ کوتاہیاں اور لغزشیں جو اس سے سرزد ہوئی ہیں اسے ستاتی رہتی ہیں لیکن اس طرف توجہ کہ خدا غفار، توبہ قبول کرنے والا، رحیم اور غفور ہے، اسے سکون دیتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ اس کی بارگاہ میں تقصیر و کوتاہی پر معذرت چاہو، گزشتہ گناہوں پر عذر خواہی کرو اور ان کی تلافی کی کوشش کرو کیونکہ وہ بخشنے والا ہے اور تلافی ممکن ہے۔

۳۔ کبھی طبیعی اور مادی عوامل کے مقابلے میں انسان کی کمزوری و ناتوانی اور کبھی داخلی و خارجی دشمنوں کی کثرت اسے پریشان کر دیتی ہے کہ میں ان طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں میدانِ جہاد میں کیا کروں یا ان سے دیگر مقابلوں میں میں کیا کر سکتا ہوں ـــــ لیکن جب وہ خدا کو یاد کرتا ہے اور اس کی قدرت و رحمت پر بھروسہ کرتا ہے ـــــ وہ قدرت کہ جو تمام طاقتوں سے برتر ہے اور کوئی اس کے مقابلے کی ہمت نہیں رکھتا ـــــ تو اس کے دل کو سکون آجاتا ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے ـــــ : ہاں ! میں اکیلا نہیں ہوں، خدا کے سائے میں میری طاقت لامتناہی ہے۔

جنگوں میں مجاہدین راہِ خدا کا جذبہ ـــــ گزشتہ زمانہ ہو یا موجودہ ـــــ اور ان کی تعجب انگیز اور خیرہ کن جنگیں ـــــ یہاں تک کہ ان مواقع پر بھی جب کہ وہ یک و تنہا ہوتے ہیں ـــــ ان سے وہ سکون و اطمینان واضح ہوتا ہے کہ جو صرف سایۂ ایمان میں پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں یا کان سے سنتے ہیں کہ ایک افسرِ رشید خیرہ کن معرکے میں اپنی بینائی بالکل کھو بیٹھتا ہے اور وہ مجروح بدن کے ساتھ ہسپتال میں چارپائی پر پڑا ہوتا ہے لیکن ایسے سکونِ دل اور اطمینانِ قلب سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے گویا اس کے بدن پر کوئی خراش تک نہیں آئی ـــــ اس سے ہم ذکرِ خدا کے زیرِ سایہ پُر اعجاز سکون کا مشاہدہ کر سکتے ہیں [۱]

۴۔ کبھی انسان کی تکلیف دہ پریشانیوں کی بنیاد زندگی کے بے مقصد ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور زندگی میں تکامل و کمال حاصل کرنے کو ایک عظیم مقصد کے طور پر اپنائے ہوئے ہے اور زندگی کے تمام امور و حوادث کو اسی مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے اسے نہ زندگی کے بے کار ہونے کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی وہ بے ہدف اور ٹھکرائے ہوئے افراد کی طرح مضطرب و سرگرداں ہوتا ہے۔

۵۔ پریشانی کا ایک اور عامل یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایک ہدف تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ زحمت اُٹھاتا ہے لیکن اسے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا جو اس کی زحمت و مشقت کا قدردان ہو۔ یہ ناقدری اسے شدید دکھ دیتی ہے اور اسے ایک عالمِ اضطراب و پریشانی میں غرق کر دیتی ہے لیکن جب وہ احساس کرتا ہے کہ کوئی ہے جو اس کی تمام مساعی اور کاوشوں سے آگاہ ہے، وہ ان سب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا

---

[۱] ایسے واقعات ہم پر دشمنوں کی مسلط کردہ ایران عراق جنگ میں ایک نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ یہ واقعات مجاہدین بدر اور دیگر اسلامی جنگوں کے مجاہدین کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

Marfat.com

ہے اور وہ ان سب پر اجر و ثواب دے گا تو پھر وہ کیوں پریشان اور بے چین ہوگا۔

(۶) بدگمانیاں، توہمات اور بے ہودہ خیالات بھی پریشانی کے عوامل میں سے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی وجہ سے اپنی زندگی میں رنج اٹھاتے ہیں لیکن کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے لطف و کرم کی یاد نیز اس حکم کی طرف توجہ کر ہر صاحب ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ حسن ظن سے کام لے اسے یہ پریشانی جاتی رہتی ہے اور اس کی جگہ سکون و اطمینان لے لیتا ہے۔

(۷) دنیا پرستی اور مادی زندگی کی رنگینیوں پر دلباختگی انسانوں کے اضطراب و پریشانی کا ایک بہت بڑا عامل رہا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات لباس، جوتے، ٹوپی یا ہزاروں چیزوں میں سے کسی ایک کا خاص رنگ نہ مل سکے تو دنیا پرست کئی گھنٹے، کئی دن یا کئی ہفتے پریشان اور بے آرام رہتے ہیں لیکن خدا پر ایمان اور ایسی چیزوں سے مومن کی آزادی ایسی تمام پریشانیوں کو ختم کر دیتی ہے کیونکہ ایک مومن ہمیشہ اسلامی زہد کا حامل ہوتا ہے اور وہ مادی زندگی کی رنگینیوں کا قیدی نہیں ہوتا۔

جس وقت انسانی روح اتنی وسعت حاصل کر لے کہ وہ علی علیہ السلام کی طرح کہے:

دنیا کم ھذہ اھون عندی من ورقة فی فم جرادة تقضمھا

تمہاری دنیا میری نظر میں درخت کے اس پتے سے بھی حقیر ہے جو ایک ٹڈی دل کے منہ میں ہو جسے وہ چبا رہی ہو[۱]

تو پھر ــــ کسی مادی چیز تک اس کا نہ پہنچنا یا اسے کھو بیٹھنا انسانی روح کا سکون کیسے درہم برہم کر سکتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں کیونکر پریشانی پیدا کر سکتا ہے۔

(۸) پریشانی کا ایک اور اہم عامل موت کا خوف بھی ہے یہ خوف ہمیشہ انسانوں کی رُوح کو ستائے رکھتا ہے۔ موت کا امکان چونکہ صرف زیادہ بڑی عمر میں نہیں بلکہ دوسرے سالوں میں بھی ہے، خصوصاً بیماریوں، جنگوں اور بدامنیوں کی حالت میں لہٰذا یہ وحشت اور خوف عمومی ہو سکتا ہے۔

البتہ اگر ہم عالم شناسی کے حوالے سے موت کو فنا اور ہر چیز کے خاتمے کے معنی میں سمجھیں (جیسا کہ مادی نظر یہ رکھنے والوں کا خیال ہے) تو پھر یہ اضطراب بالکل بجا ہے۔ ایسی موت سے واقعاً ڈرنا چاہیے جو انسان کی تمام آرزوؤں اور کامیابیوں کا آخری نقطہ ہو لیکن اگر خدا پر ایمان کی وجہ سے موت کو ایک وسیع تر اور اعلیٰ تر زندگی کا دریچہ سمجھا جائے اور موت سے گزرنے کو زندان کے دالان سے گزر کر ایک آزاد فضا تک پہنچنا شمار کیا جائے تو پھر یہ پریشانی بے معنی ہے بلکہ ایسی موت اگر ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے آئے تو اسے پسند کیا جانا چاہیے اور وہ چاہے جانے کے قابل ہے۔

پریشانی کے عوامل انہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اس کے اور بھی بہت سے عوامل شمار کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ بات قابل قبول ہے کہ زیادہ تر پریشانیوں کی بازگشت مذکورہ عوامل ہی کی طرف ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عوامل خدا پر ایمان کے مقابلے میں پگھل جاتے ہیں اور بے رنگ ہو جاتے ہیں اور نابود ہو جاتے ہیں تو پھر ہمیں اس بات کی تصدیق کرنا پڑے گی کہ خدا کی یاد دلوں کے سکون و قرار کا باعث ہے ــــ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب)[۲]

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴۔

[۲] مزید وضاحت کے لیے کتاب "راہ غلبہ بر نگرانیھا و نا اُمیدیھا" کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

۲۔ کیا خوفِ خدا اور اطمینان باہم مطابقت رکھتے ہیں؟ بعض مفسرین نے یہاں ایک اعتراض اٹھایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم مذکورہ آیت میں پڑھتے ہیں کہ یادِ خدا دلوں کے سکون و اطمینان کا باعث ہے جب کہ دوسری طرف سورہ انفال کی آیہ ۲ میں ہے:

انما المؤمنون الذین اذا ذکر الله وجلت قلوبھم

مومن وہ ہیں کہ جس وقت خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

کیا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آرام و سکون سے مراد مادی عوامل کے مقابلے میں سکون ہے کہ جو عام لوگوں کو پریشان کیے رکھتے ہیں جن کے واضح نمونے ہم نے سطورِ بالا میں پیش کیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اہل ایمان اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں پریشان نہ ہوں دوسرے لفظوں میں جو چیز ان میں نہیں ہوتی وہ ویران گر پریشانیاں ہیں جو دنیا میں عام طور پر ہوتی ہیں باقی رہی اصلاحی پریشانی کہ جو انسان کو خدا اور مخلوق کے بارے میں احساسِ ذمہ داری پر ہوتی ہے اور جو زندگی میں مثبت کردار ادا کرنے پر آمادہ کرتی ہے وہ ان میں موجود ہوتی ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے اور خوفِ خدا سے مراد بھی یہی ہے۔[1]

۳۔ "ذکرِ خدا" کیا ہے اور کس طرح ہے؟ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "ذکر" کبھی مطالب و معارف کے حفظ کے معنی میں آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ لفظ "حفظ" اس کی ابتداء میں بولا جاتا ہے اور لفظ "ذکر" اسے جاری رکھتے ہوئے اور کبھی کسی چیز کو زبان سے یا دل میں یاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ "ذکر" دو قسم کا ہے "ذکرِ قلبی" "ذکرِ زبانی"۔ ان میں سے ہر ایک پھر دو طرح کا ہے یا تو فراموشی کے بعد ذکر یا بغیر فراموش کیے ذکر۔

بہر حال زیرِ بحث آیت میں ذکرِ خدا کہ جو دلوں کے لیے باعثِ سکون ہے اسے مراد یہ نہیں کہ اس کا نام زبان پر لایا جائے اور بار بار تسبیح تہلیل اور تکبیر کہی جائے بلکہ مراد یہ ہے پورے دل کے ساتھ خدا کی طرف اور اس کی عظمت، اس کے علم اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کی طرف متوجہ رہا جائے اور یہ توجہ انسان میں جہاد و کوشش اور نیکیوں کی طرف حرکت کی بنیاد بنے اور اس کے اور گناہ کے درمیان ایک مضبوط بند کا کردار ادا کرے — یہ ہے وہ ذکر جس کے لیے روایات اسلامی میں اس قدر آثار و برکات بیان ہوئی ہیں۔

ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے جو وصیتیں کیں ان میں سے ایک یہ تھی:

یاعلی ثلاث لا تطیقها هذه الامة المواسات للاخ فی ماله وانصاف الناس من نفسه و ذکر الله علی کل حال، ولیس هو سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر ولکن اذا ورد علی ما یحرم علیه خاف الله عز وجل عنده و ترکه۔

یا علی! تین کام ایسے ہیں جن کی اس امت میں طاقت نہیں ہے (اور ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا)، مال میں دینی بھائیوں کے

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۷ صفحہ (اردو ترجمہ) پر بھی ہم نے اس سلسلے میں وضاحت کی ہے۔

Marfat.com

ساتھ مواسات کرنا، اپنی طرف سے لوگوں کا حق ادا کرنا اور ہر حالت میں خدا کو یاد رکھنا لیکن خدا کی یاد (صرف) سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر نہیں ہے بلکہ یادِ خدا یہ ہے کہ جس وقت انسان کسی فعل حرام کا سامنا کرے تو خدا سے ڈرے اور اسے ترک کر دے۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

الذکر ذکران ذکر اللہ عز و جل عند المصیبۃ و افضل من ذٰلک ذکر اللہ عند ما حرم اللہ علیک فیکون حاجزاً۔

ذکر دو قسم کا ہے۔ ایک تو خدا کو مصیبت کے وقت یاد رکھنا (اور صبر و استقامت سے کام لینا) اور اس سے افضل و برتر یہ ہے کہ محرمات کے مقابلے میں خدا کو یاد رکھا جائے اور اس کے اور حرام کام کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے۔[2]

یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ذکرِ خدا کا تعارف ایک سپر اور دفاعی ہتھیار کے طور پر کروایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرمؐ نے اپنے اصحاب کی طرف رُخ کر کے ارشاد فرمایا:

اتخذوا جنتا

فقالوا: یا رسول اللہ امن عدو قد اظلنا؟

قال: لا، ولکن من النار قولوا سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر۔

اپنے لیے سپر مہیا کرو۔

اصحاب نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا دشمنوں کے مقابلے میں کہ جنہوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے اور ہم پر سایہ کیے ہوئے ہیں؟

فرمایا: نہیں بلکہ جہنم (کی آگ) سے کہو، سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر (خدا کی پاکیزگی بیان کرو، اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرو، اس کے علاوہ کسی کو معبود نہ بناؤ اور اسے ہر چیز سے برتر سمجھو)۔[3]

جو ہم دیکھتے ہیں کہ چند ایک احادیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف "ذکر اللہ" کے طور پر ہوا ہے تو وہ بھی اس بنا پر ہے کہ وہ لوگوں کو خدا یاد دلاتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام سے "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" کی تفسیر کے ضمن میں نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

بمحمد تطمئن القلوب و هو ذکر اللہ وحجابہ

محمد کے ذریعے دلوں کو سکون ہوتا ہے، وہ ہیں خدا کا ذکر اور اس کا حجاب۔

---

[1] و [2] و [3] سفینۃ البحار جلد ۱ صـ ۴۸۴۔

Marfat.com

۳۰۔ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ
الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ○

۳۱۔ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ
الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ
اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا
صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○ ۴

۳۲۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ
اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ○

ترجمہ

۳۰۔ جیسا کہ (ہم نے گزشتہ انبیاء کو بھیجا) تجھے بھی ایک امت کے درمیان بھیجا کہ جس سے پہلے دوسری امتیں آئیں اور چلی گئیں، تاکہ ہم نے جو کچھ تجھ پر وحی کی ہے ان کے سامنے پڑھو حالانکہ وہ رحمان (وہ خدا کہ جس کی رحمت سب پر محیط ہے) سے کفر کرتے ہیں۔ کہہ دو وہ میرا پروردگار ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، میں نے اس پر توکل کیا ہے اور میری بازگشت اس کی طرف ہے۔

۳۱۔ اگر قرآن کی وجہ سے پہاڑ چلنے لگ جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کے ذریعے مُردوں کے ساتھ گفتگو کی جائے (وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے) لیکن یہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ کیا وہ

Marfat.com

لوگ جو ایمان لائے ہیں نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو تمام لوگوں کو (جبراً) ہدایت کردے (لیکن جبری ہدایت کا کوئی فائدہ نہیں) اور کافروں پر ان کے اعمال کی وجہ سے مسلسل سرکوبی کرنے والی مصیبتیں ٹوٹتی رہیں گی یا ان کے گھروں کے اردگرد نازل ہوں گی یہاں تک کہ خدا کا آخری وعدہ پورا ہو، خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

٣٢۔ (انہوں نے صرف تیرا مذاق نہیں اڑایا بلکہ) تجھ سے پہلے انبیاء سے بھی انہوں نے استہزاء کیا۔ میں نے کافروں کو مہلت دی اور پھر ان کی گرفت کی، تو نے دیکھا (میری) سزا کیسی تھی؟

شانِ نزول

مفسرین کا کہنا ہے کہ پہلی آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں ہجرت کے چھٹے سال نازل ہوئی۔ جب صلح نامہ لکھا جانے لگا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا:

لکھو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس پر سہیل بن عمرو اور دیگر مشرکین کہنے لگے: ہم رحمان کو نہیں پہچانتے "رحمٰن" تو صرف ایک ہی ہے اور وہ یمامہ میں ہے (ان کی مراد مسیلمہ کذاب سے تھی کہ جو نبوت کا دعویدار تھا)۔ بلکہ لکھو: باسمک اللّٰھم

زمانہ جاہلیت میں اسی طرح لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے کہا:

لکھو: یہ صلح نامہ ہے جو محمد رسول اللہ ......

ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ مشرکین قریش کہنے لگے: اگر تم خدا کے رسول ہوتے اور ہم تم سے جنگ کرتے اور خانہ خدا کا راستہ تم پر بند کرتے تو ہم بڑے ظالم ہوتے (جھگڑا تو تمہاری اس رسالت کا ہی ہے) بلکہ لکھو "یہ صلح نامہ محمد بن عبداللہ کا ہے"۔

اس وقت اصحابِ پیغمبرؐ بھڑک اٹھے۔ کہنے لگے: ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ان سے جنگ کریں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: نہیں، جس طرح یہ کہتے ہیں ویسے لکھو۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور خدا کے نام "رحمٰن" کے سلسلے میں ان کی بہانہ جوئی، ہٹ دھرمی اور مخالفت پر ان کی شدید سرزنش کی گئی کیونکہ یہ تو خدا کی قطعی صفات میں سے ہے۔

یہ شانِ نزول اس صورت میں صحیح ہے جب ہم اس سورہ کو مدنی سمجھیں تاکہ یہ صلح حدیبیہ کے واقعے سے مطابقت اختیار کر سکے لیکن اگر جیسا کہ مشہور ہے اسے مکی سمجھیں تو پھر اس بحث کی نوبت نہیں آئے گی مگر یہ کہ اس آیہ کی شانِ نزول کو مشرکین کی اس گفتگو کا جواب سمجھا جائے جو سورہ فرقان میں آئی ہے۔ انہوں نے "رحمٰن" کو سجدہ کرنے کی دعوتِ پیغمبرؐ کے جواب میں کہا ہے کہ ہم رحمٰن کو نہیں پہچانتے:

Marfat.com

اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن

(جب ان سے کہا گیا کہ) رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہنے لگے رحمٰن کون ہے؟ (فرقان ۔ ۶۰)

بہرحال مندرجہ بالا آیت شانِ نزول سے قطع نظر بھی ایک واضح مفہوم رکھتی ہے کہ جو اس کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا۔ دوسری آیت کی شانِ نزول کے بارے میں بھی بعض عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مشرکین مکہ کی ایک جماعت کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کی پشت کی طرف بیٹھے تھے۔ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی طرف کسی کو یہ پیغام دے کر بھیجا:

اگر تو چاہتا ہے کہ ہم تیری پیروی کریں تو مکہ کے ان پہاڑوں کو اپنے قرآن کے ذریعے پیچھے ہٹا دے تاکہ ہماری یہ تنگ زمین کسی حد تک وسیع ہو جائے۔ نیز زمین میں شگاف کر کے اس میں چشمے اور نہریں جاری کر دے تاکہ ہم درخت لگائیں اور زراعت کریں تو اپنے گمان میں داؤد سے کم نہیں ہے کہ جس کے لیے خدا نے پہاڑوں کو مسخر کر رکھا تھا کہ جو اس سے ہم آواز ہو کر خدا کی تسبیح کرتے تھے یا یہ کہ ہمارے لیے ہوا کو مسخر کر دے تاکہ ہم اس کے دوش پر سوار ہو کر شام کی طرف جائیں اور اپنی مشکلات حل کریں اپنی ضروریات پوری کریں اور اسی دن واپس لوٹ آئیں جیسا کہ سلیمان کے لیے مسخر تھی اور تو اپنے گمان میں سلیمان سے کم نہیں ہے نیز اپنے دادا "قصی" (قبیلۂ قریش کے جدِ اعلیٰ) یا ہمارے مُردوں میں سے کسی اور شخص کو جسے چاہے زندہ کر دے تاکہ ہم اس سے سوال کریں کہ کیا جو کچھ تو کہتا ہے حق ہے یا باطل ـــ کیونکہ عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتا تھا اور تو عیسیٰ سے کم تر نہیں ہے۔

اس پر دوسری زیرِ بحث آیت نازل ہوئی اور ان سے کہا گیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے نہ کہ ایمان لانے کے لیے کیونکہ ایمان لانے کے لیے درکار کافی معجزات پیش کیے جا چکے ہیں۔

تفسیر

ہٹ دھرم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے

ان آیات میں ہم پھر نبوت کی بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔ ان میں مشرکین کی گفتگو کا ایک اور حصہ پیش کیا گیا ہے نیز نبوت کے بارے میں ان کی گفتگو کا واضح جواب دیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جیسے ہم نے گزشتہ انبیاء کو گزشتہ قوموں کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا تجھے بھی ایک امت کے درمیان بھیجا ہے کہ جس سے پہلے امتیں آئیں اور چلی گئیں (کذٰلک ارسلنٰک فی امۃ قد خلت من قبلھا امم)۔ مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کیا ہے وہ تو ان کے سامنے پڑھے (لتتلوا علیھم الذی اوحینا الیک)۔ حالانکہ وہ "رحمٰن" (وہ خدا کہ جس کی رحمت اور وسیع و عام فیض مومن و کافر اور یہود و نصاریٰ سب پر محیط ہے) کا انکار کرتے ہیں (وھم یکفرون بالرحمٰن)۔ کہہ دو: اگر تم انکار کرتے ہو تو رحمٰن کہ جس کا فیض و رحمت عام ہے، میرا پروردگار ہے (قل ھو ربی)۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں اس پر توکل کرتا ہوں اور میری بازگشت اسی کی طرف ہے (لا الٰہ الا ھو علیہ توکلت و الیہ متاب)۔

Marfat.com

اس کے بعد ان بہانہ تراش افراد کے جواب میں کہ جو ہر چیز پر اعتراض کرتے ہیں، فرماتا ہے: یہاں تک کہ اگر قرآن کے ذریعے پہاڑ چلنے لگ جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کے ذریعے مردوں سے گفتگو بھی ہو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے (ولو ان قرانًا سیرت به الجبال او قطعت به الارض او کلم به الموتی)۔

لیکن یہ تمام کام خدا کے اختیار میں ہے اور وہ جتنا ضروری سمجھتا ہے انجام دیتا ہے (بل الله الامر جمیعًا)۔

مگر تم لوگ حق کے طالب نہیں ہو، اگر ہوتے تو جس قدر اعجاز کی نشانیاں اس پیغمبر سے صادر ہوئی ہیں ایمان لانے کے لیے کافی ہیں۔ یہ تو سب بہانے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کیا وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو تمام لوگوں کو جبراً ہدایت کر دے (افلم یایئس الذین امنوا ان لو یشاء الله لهدی الناس جمیعًا)[1]۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ داخلی یا خارجی طور پر جبری طریقے سے منکرین اور ہٹ دھرم افراد تک کو بھی ایمان لانے پر آمادہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کی قدرت کے سامنے کوئی کام مشکل نہیں ہے لیکن وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا کیونکہ ایسا جبری ایمان بے وقعت ہے۔ ایسا ایمان اس معنویت اور کمال سے محروم ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس کے باوجود کفار ہمیشہ اپنے اعمال کے سبب تباہ کن مصائب کے حملے سے دوچار ہیں یہ مصائب مختلف بلاؤں کی صورت میں نازل ہوتے ہیں اور کبھی ان پر مجاہدین اسلام کے تباہ کن حملوں کی صورت میں آتے ہیں (ولا یزال الذین کفروا تصیبهم بما صنعوا قارعة)۔

یہ مصائب اگر ان کے گھروں پر نازل نہ ہوں تو ان کے گھروں کے آس پاس نازل ہوں گے (او تحل قریبًا من دارهم) تاکہ وہ عبرت حاصل کریں، حرکت میں آئیں اور خدا کی طرف لوٹ آئیں۔

یہ تنبیہیں اسی طرح جاری رہیں گی یہاں تک کہ خدا کا آخری حکم آپہنچے (حتّٰی یأتی وعد الله)۔

یہ آخری حکم ہو سکتا ہے موت کی طرف یا روزِ قیامت کی طرف اشارہ ہو یا بقول بعض کے فتح مکہ کی طرف اشارہ ہو کہ جس نے دشمن کی ساری طاقت کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

بہرحال خدا کا وعدہ حتمی ہے "اور خدا کبھی بھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا" (ان الله لا یخلف المیعاد)۔

زیر نظر آخری آیت پیغمبر اکرمؐ کی طرف روئے سخن کیے ہوئے کہتی ہے: صرف تم ہی نہیں ہو کہ جسے اس کافر گروہ کے طرح طرح کے تقاضوں

---

[1] "اَفَلَم یَایئَس" "یأس" کے مادہ سے ناامیدی کے معنی میں ہے مگر بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں علم کے معنی میں ہے لیکن (فخر رازی کے مطابق) "کچھ لوگوں" کے بقول کہیں نہیں دیکھا گیا کہ "یئست" "علمت" کے معنی میں ہو۔ مفردات میں راغب کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "یأس" یہاں اپنے اسی مشہور معنی میں ہے لیکن ہر مایوسی کے لیے ضروری ہے کہ اس کام کے نہ ہو سکنے کا علم ہو۔ اس بناء پر ان کے یأس کے ہونے کا لازمہ ان کا علم ہے لیکن راغب کی اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں یأس وجود کے علم کے معنی میں نہیں ہے بلکہ عدم کے علم کے معنی میں ہے اور یہ مفہوم آیت کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا اس بناء پر حق وہی ہے جو مشہور مفسرین نے کہا ہے اور اس کے لیے اقوال عرب سے بھی شواہد پیش کیے گئے ہیں اور ان کے نمونے فخر رازی نے اپنی تفسیر میں پیش کیے ہیں (غور کیجئے گا)۔

Marfat.com

اور من پسند معجزوں کی فرمائش کے ذریعے تمسخر اور استہزاء کا سامنا کرنا پڑا ہے بلکہ یہ تو پوری تاریخ انبیاء میں ہوتا رہا ہے" اور تجھ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا تمسخر اڑایا گیا ہے" (ولقد استھزئ برسل من قبلك)۔

لیکن ہم نے ان کافروں کو فوراً عذاب نہیں کیا بلکہ" ہم نے انہیں مہلت دی" (فاملیت للذین کفروا) اس لیے کہ شاید بیدار ہو جائیں اور شاید راہِ حق کی طرف پلٹ آئیں یا کم از کم ان پر کافی اتمام حجت ہو جائے کیونکہ اگر وہ بدکار اور گنہگار ہیں تو خدا کی مہربانی اور اس کا لطف و کرم اور حکمت بھی تو موجود ہے۔

بہر حال یہ مہلت و تاخیر اس معنی میں نہیں کہ ان کی سزا اور کیفرِ کردار کو فراموش کر دیا جائے لہٰذا" اس مہلت کے بعد ہم نے انہیں گرفت کی اور تو نے دیکھا کہ ہم نے انہیں کس طرح سزا دی" یہ انجام تیری ہٹ دھرم قوم کے بھی انتظار میں ہے (ثم اخذتھم فکیف کان عقاب)۔

چند اہم نکات

۱۔ **لفظ" رحمٰن" کیوں استعمال کیا گیا ہے؟** مندرجہ بالا آیات اور ان کے بارے میں مذکور شانِ نزول نشاندہی کرتی ہیں کہ قریش کو لفظ" رحمٰن" سے خدا کی توصیف و تعریف پسند نہیں تھی کیونکہ ایسی کوئی چیز ان کے درمیان رائج نہ تھی لہٰذا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے حالانکہ مندرجہ بالا آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ اس لفظ میں ایک خاص لطف پوشیدہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اس کے لطفِ عام کی طرف اشارہ ہے کہ جو دوست اور دشمن سب پر محیط ہے اور مومن اور کافر سب کے شاملِ حال ہے جب کہ اس کے مقابلے میں صفتِ رحیمیت خدا کی صفتِ خاص ہے اور صالح اور مومن بندوں کے بارے میں ہے۔

یعنی — تم کس طرح اس خدا پر ایمان نہیں لاتے ہو کہ جو منبع لطف و کرم ہے یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کو بھی اپنے لطف و رحمت سے نوازتا ہے۔ یہ تمہاری انتہائی نادانی ہے۔

۲۔ **پیغمبر اکرمؐ نے معجزات کا تقاضا کیوں پورا نہ کیا** یہاں ہمیں پھر ان لوگوں کی گفتگو کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوائے قرآن کے اور کوئی معجزہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ زیرِ نظر آیات اور اس قسم کی دیگر آیات سے مدد لیتے ہیں کیونکہ ان آیات کا ظہور یہ بتاتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے مختلف معجزات کی فرمائش کو ٹھکرا دیا۔ وہ لوگ پہاڑوں کو ان کی جگہ سے پیچھے ہٹانے کا، وہاں کی زمین میں شگاف کر کے چشمے اور نہریں جاری کرنے کا اور مُردوں کے زندہ ہو کر گفتگو کرنے کا تقاضا کر رہے تھے لیکن آپؐ نے ان کی درخواست رد کر دی۔

لیکن — ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ معجزہ ان لوگوں کو کہ جو حقیقت طلب ہیں صرف حقیقت کا چہرہ دکھانے کے لیے ہے نہ یہ کہ پیغمبر ایک معجزہ گر بن جائے اور جو شخص جس عمل کی بھی فرمائش کرے وہ اسے انجام دیتا جائے چاہے وہ اسے قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو۔

من پسند کے معجزات کی ایسی فرمائش صرف ایسے ہٹ دھرم اور کوتاہ فکر افراد کی طرف سے کی جاتی ہے کہ جو کسی حق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اتفاق کی بات ہے کہ اس امر کی نشانیاں مندرجہ بالا آیات میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ آخری زیرِ بحث آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ گفتگو ان کی طرف سے پیغمبر کا مذاق اڑانے کے سلسلے میں آئی ہے یعنی وہ لوگ حق کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے

Marfat.com

بلکہ ایسی فرمائشوں سے ان کا مقصود پیغمبر اکرمؐ کا تمسخر اڑانا تھا۔

علاوہ ازیں ان آیات کے بارے میں جو شان ہائے نزول ہم نے پڑھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے تقاضا کیا تھا کہ وہ گزشتہ بزرگوں میں سے کسی ایک کو زندہ کردیں تاکہ وہ ان سے پوچھیں کہ کیا آپ حق پر ہیں یا باطل پر حالانکہ اگر پیغمبر اس قسم کا معجزہ (مردوں کو زندہ کرنا) پیش کردیں تو پھر اس بات کے پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ پیغمبر حق پر ہیں یا باطل پر۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ وہ متعصب، ہٹ دھرم اور معاند افراد تھے اور ان کا مقصد حق کی جستجو نہ تھا۔ وہ ہمیشہ عجیب و غریب فرمائشیں کرتے رہتے تھے اور آخرکار وہ ایمان بھی نہیں لاتے تھے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۹۰ کے ذیل میں ہم انشاء اللہ دوبارہ اس مسئلے کی وضاحت کریں گے۔

۳۔ "قارعة" کیا ہے؟ "قارعة" "قرع" کے مادہ سے ہے جو کھٹکھٹانے کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر "قارعة" کا معنی ہے "کھٹکھٹانے والی"۔ یہاں ایسے امور کی طرف اشارہ ہے جو انسان کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور اسے تنبیہ کرتے ہیں اور اگر بیدار ہونے کے لیے آمادہ ہو تو اسے بیدار کرتے ہیں۔

درحقیقت "قارعة" کا ایک وسیع معنی ہے کہ جس میں ہر قسم کی انفرادی یا اجتماعی مصیبتوں، مشکلات اور دردناک حوادث کا مفہوم شامل ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین اسے جنگوں، خشک سالیوں، قتل ہونے اور قید ہونے کے معنی میں سمجھتے ہیں جب کہ بعض دوسرے اسے صرف ان جنگوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو صدر اسلام میں "سریہ" کے عنوان سے ہوئیں۔ "سریہ" ان جنگوں کو کہا جاتا ہے جن میں پیغمبر اسلامؐ خود شریک نہیں ہوئے بلکہ ان میں آپؐ نے اپنے اصحاب و انصار کو مامور فرمایا لیکن مسلم ہے کہ "قارعة" ان امور میں سے کسی ایک کے لیے مختص نہیں اور اس کے مفہوم میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ زیر بحث آیات میں ہے کہ یہ تباہ کن حوادث خود انہیں پہنچتے تھے یا ان کے گھر کے آس پاس رونما ہوتے تھے یعنی اگر وہ خود ان بیدار کرنے والے اور تنبیہ کرنے والے حوادث میں مبتلا نہ ہوں تو بھی یہ ان کے اوس پڑوس یا ان کے نزدیک رونما ہوتے ہیں۔ تو کیا یہ ان کی بیداری کے لیے کافی نہیں۔

Marfat.com

۳۳- اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ
قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ
مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ
وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝
۳۴- لَهُمْ عَذَابٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ
مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝

ترجمہ

۳۳- کیا وہ کہ جو سب کے سروں پر موجود ہے (اور سب کا نگران اور نگہبان ہے) اور سب کے اعمال دیکھتا ہے (اس کی مانند ہے کہ جو ان میں سے کوئی صفت نہیں رکھتا)۔ انہوں نے خدا کے لیے شریک قرار دیے ہیں۔ کہہ دو: ان کے نام لو، کیا اسے ایسی چیز کی خبر دیتے ہو کہ روئے زمین میں جس کے وجود سے وہ بے خبر ہے یا ظاہری اور کھوکھلی باتیں کرتے ہو (نہیں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے) بلکہ کافروں کے سامنے ان کے جھوٹ مزین کیے گئے ہیں (اور اندرونی ناپاکی کی بناء پر ان کا خیال ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہیں) اور وہ (خدا کی) راہ سے روک دیے گئے ہیں اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی راہنما نہیں ہوگا۔

۳۴- ان کے لیے دنیا میں (دردناک) عذاب ہے اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے اور خدا کے مقابلے میں کوئی ان کا دفاع نہیں کر سکتا۔

تفسیر

کس طرح خدا کو بتوں کا شریک بناتے ہو؟

ان آیات میں قرآن پھر توحید اور شرک کی بحث کی جانب لوٹتا ہے اور لوگوں کو اس واضح دلیل سے خطاب کرتا ہے، کیا وہ کہ جو

Marfat.com

تمام عالم ہستی میں ہر چیز کا محافظ ہے اور جس نے سب کو اپنی تدبیر کے زیر پردہ قرار دیا ہے اور تمام لوگوں کے اعمال سے باخبر ہے اس کی طرح ہے کہ جس میں ان صفات میں سے کوئی بھی نہیں (افمن ھو قائم علی کل نفس بما کسبت)۔[1]

درحقیقت مندرجہ بالا جملہ وضاحت سے کہتا ہے کہ خدا نے تمام چیزوں کا اس طرح سے احاطہ کر رکھا ہے کہ گویا وہ سب کے سروں پر کھڑا ہے، جو کچھ انجام دیتا ہے وہ اسے دیکھتا ہے، جانتا ہے، اس کا حساب وکتاب رکھتا ہے، اس کی جزا وسزا دیتا ہے اور تصرف و تدبیر کرتا ہے۔ اس بناء پر لفظ "قائم" ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں یہ تمام امور شامل ہیں اگرچہ بعض مفسرین نے ان میں ایک پہلو لے لیا ہے۔

اس کے بعد گزشتہ بحث کی تکمیل اور آئندہ بحث کی تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے: انہوں نے خدا کے شریک قرار دیئے ہیں (و جعلوا للہ شرکاء)۔

فوراً ہی انہیں چند طریقوں سے جواب دیا گیا ہے:

پہلا یہ کہ — فرمایا: ان شریکوں کے نام لو (قل سموھم)۔

نام لینے سے یا تو یہ مراد ہے کہ ان کی وقعت اور قدر وقیمت اتنی بھی نہیں کہ ان کا نام ونشان بھی ہو یعنی تم چند بے نام ونشان اور بے وقعت موجودات کو قادر ومتعال پروردگار کے کس طرح ہم پلہ قرار دیتے ہو؟

یا مراد یہ ہے کہ ان کی صفات بیان کرو تاکہ ہم دیکھیں کہ کیا وہ عبودیت کے لائق ہیں۔ اللہ کے بارے میں ہم کہتے ہیں وہ خالق، رازق، زندگی بخشنے والا، عالم، قادر اور بزرگ و برتر ہے تو کیا تم یہ صفات بتوں کے لیے استعمال کرسکتے ہو یا اس کے برعکس اگر ان کا ذکر کرنا چاہیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ پتھر، لکڑی کے بے حس وحرکت بت کہ جو عقل وشعور سے عاری ہیں اور اپنے عبادت کرنے والوں کے محتاج ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر چیز سے عاری بت۔ — تو پھر ان دونوں کو کس طرح ایک جیسا قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ بات شرم انگیز نہیں ہے؟

یا یہ مراد ہے کہ ان کے کام شمار کرو۔ کیا اب تک انہوں نے کسی کو کوئی نقصان پہنچایا ہے یا کسی کو کوئی فائدہ پہنچایا ہے، کسی کی مشکل حل کی ہے یا کسی کام میں مدد کی ہے؟ تو ان حالات میں کونسی عقل اجازت دیتی ہے کہ انہیں خدا کا ہم پلہ قرار دیا جائے کہ جو تمام برکات و نعمات، سود وزیاں اور جزا وسزا کا مالک ہے۔

البتہ کوئی مانع نہیں کہ یہ تمام معانی "سموھم" (ان کے نام لو) کے جملے میں جمع ہوں۔

دوسرا یہ کہ اس قسم کا کوئی شریک کیسے ہوسکتا ہے جب کہ وہ خدا جو تمہارے خیال میں ان کا شریک ہے ان کے وجود کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتا جب کہ اس کا علم تمام جہان پر محیط ہے۔ "کیا اسے اس چیز کی خبر دیتے ہو جس کے وجود کو وہ زمین میں نہیں جانتا" (ام تنبئونہ بما لا یعلم فی الارض)۔

---

[1] درحقیقت مندرجہ بالا جملہ مبتدا پر مشتمل ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، تقدیر میں اس طرح تھا:

افمن ھو قائم علی کل نفس بما کسبت کمن لیس کذلک

یعنی — کیا وہ کہ جو اس صفت کا حامل ہے اس جیسا ہے کہ جو اس سے عاری ہے۔

Marfat.com

یہ تعبیر در حقیقت مد مقابل کی بے ہودہ اور فضول گفتگو کو ختم کرنے کے لیے بہترین راستہ ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص آپ سے کہتا ہے کہ کل رات فلاں شخص تمہارے گھر میں مہمان تھا اور آپ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم مجھے ایسے مہمان کی خبر دیتے ہو جس کی مجھے اطلاع نہیں ہے یعنی کیا یہ ممکن ہے کوئی شخص میرا مہمان ہو اور میں اس سے بے خبر ہوں اور تم اس سے آگاہ ہو۔

تیسرا یہ کہ دراصل خود تم بھی دل میں ایسی چیز کا ایمان نہیں رکھتے "صرف ایک کھوکھلی ظاہری بات کا سہارا لیے ہوئے ہو کہ جس میں کوئی حقیقی مفہوم موجود نہیں ہے" (ام بظاهر من القول)۔

اسی بناء پر یہ مشرکین جب زندگی کی کسی سخت گھاٹی میں جو ہر طرف سے بند ہو کر پھنس جاتے ہیں تو "الله" کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ وہ دلی طور پر جانتے ہیں کہ بتوں سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خدا ان کی حالت سورہ عنکبوت کی آیہ ۶۵ میں بیان فرماتا ہے جب کہ وہ کسی کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور سخت طوفان میں گھر جاتے ہیں تو صرف خدا کا رُخ کرتے ہیں۔

چوتھا یہ کہ یہ مشرکین صحیح شعور نہیں رکھتے اور چونکہ ہوا و ہوس اور اندھی تقلید میں گرفتار ہیں لہٰذا عقل مندانہ اور صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے۔ اسی بناء پر اس گمراہی میں آن پڑے ہیں "پیغمبر اور مومنین کے خلاف ان کی سازشوں کو اور ان کے جھوٹ، تہمتوں اور بہتانوں کو (ان کی اندرونی ناپاکی کی بناء پر) مزین کر دیا گیا ہے" یہاں تک کہ انہوں نے ان بے وقعت اور بے نام و نشان موجودات کو خدا کا شریک جان لیا ہے (بل زين للذين كفروا مكرهم وصدوا عن السبيل) اور جس شخص کو خدا گمراہ قرار دے اس کی ہدایت کسی کے بس میں نہیں ہے (ومن يضلل الله فماله من هاد)۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ گمراہی جبری معنی میں نہیں ہے اور نہ یہ بغیر کسی شرط اور بنیاد کے من پسند کا مسئلہ ہے بلکہ خدا کی طرف سے گمراہی خود انسان کے غلط کاموں کے عکس العمل کے معنی میں ہے یہ اس کے اپنے اعمال کا ردّ عمل ہے کہ جو اسے گمراہیوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ چونکہ ایسے اعمال میں خدا نے یہ خاصیت پیدا کی ہے لہٰذا اس کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے۔

زیرِ بحث آخری آیت میں دنیا و آخرت میں ان کی دردناک سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں فطرتاً شکست و ناکامی، سیاہ روزی اور ذلت و رسوائی شامل ہیں۔ فرمایا گیا ہے: ان کے لیے دنیاوی زندگی میں بھی سزا ہے اور آخرت کی سزا زیادہ سخت اور شدید تر ہے (لهم عذاب في الحيوة الدنيا ولعذاب الأخرة اشق)۔ کیونکہ وہ سزا دائمی بھی ہے، جسمانی و روحانی بھی اور اس میں طرح طرح کا عذاب شامل ہے اور اگر وہ یہ گمان کریں کہ اس سے بچ نکلنے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ یا وسیلہ ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ "خدا کے مقابلے میں انہیں کوئی چیز نہیں بچا سکتی" (وما لهم من الله من واق)۔

Marfat.com

۳۵۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ○

ترجمہ

۳۵۔ وہ جنت کہ جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کے سائے ہمیشہ کے لیے ہیں۔ یہ انجام ان لوگوں کیلیے ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے اور کافروں کا انجام آگ ہے۔

تفسیر

اس سورہ کی آیات میں توحید، قیامت اور دیگر اسلامی معارف کا باری باری ذکر آیا ہے۔ اس آیت میں معاد کے بارے میں خصوصاً جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جنت کے وہ باغ کہ جن کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے ایسے ہیں کہ جن کے درختوں کے نیچے جاری پانی کی نہریں رواں دواں ہیں (مثل الجنة التی وعد المتقون تجری من تحتها الانهر)[1]۔

«مثل» کی تعبیر شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت کے گھر کے باغات اور دیگر نعمتوں کی اس محدود جہان میں رہنے والوں کے لیے کسی بیان سے تعریف نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ جہان بعد از موت کے جہان کے مقابلے میں نہایت چھوٹا ہے۔ اس جہان کے لوگوں کے لیے وہاں کی چیزوں کو صرف «مثل» اور ارشاداتی گفتگو میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک بچہ جو عالم جنین میں ہے اگر عقل و شعور رکھتا ہو تو اس کے سامنے اس دنیا کی نعمتوں کی وضاحت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ صرف ناقص اور کم رنگ مثالیں پیش

---

[1] اس جملے کی ترکیب کے سلسلے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ بعض «مثل» کو مبتدا اور «تجری» کو اس کی خبر سمجھتے ہیں۔ بعض «مثل» کو مبتدا اور اس کی خبر کو محذوف خیال کرتے ہیں اور اس کی تقدیر یوں ہے:

فیما نقص علیکم مثل الجنة

وہ چیزیں کہ جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان میں سے جنت کی مثال یہ ہے۔

Marfat.com

کی جا سکتی ہے۔

باغاتِ بہشت کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کے پھل دائمی ہیں (اکلھا دائم)۔ نہ کہ اس جہان کے پھلوں کی طرح کہ جو موسمی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص موسم میں پیدا ہوتا ہے بلکہ کسی آفت کی وجہ سے ممکن ہے کسی سال بالکل نہ ہو لیکن جنت کے پھلوں کو نہ کوئی آفت درپیش ہے اور نہ وہ کسی موسم کے محتاج ہیں بلکہ سچے مومنین کے ایمان کی طرح قائم و دائم ہیں۔ اسی طرح ان درختوں کا سایہ بھی دائمی ہے (وظلھا)۔ ان کے سائے دنیا کے درختوں کے سائے کی طرح نہیں ہیں کہ ہو سکتا دن کے وقت جب کہ وقت صبح سورج ایک طرف سے چمکتا ہے ان کے سائے سطح باغ میں گہرے ہوں لیکن جب آفتاب عمودی شکل میں چمکتا ہے تو وہ کم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح فصلِ بہار میں گرمیوں میں جب کہ درخت پتوں سے بھرے ہوتے ہیں ان کا سایہ ہوتا ہے مگر فصلِ خزاں میں اور سردیوں میں جب درخت برہنہ ہو جاتے ہیں ان کا سایہ بھی جاتا رہتا ہے۔ (البتہ دنیا میں کہیں کہیں سدا بہار درختوں کے نمونے بھی موجود ہیں کہ جو ہمیشہ پھل پھول دیتے رہتے ہیں۔ یہ درخت ایسے علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں خزاں کی خنکی اور فصلِ سرما نہیں ہوتی)۔

خلاصہ یہ کہ جنت کے سائے اس کی تمام نعمتوں کی طرح جاودانی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ باغاتِ بہشت کے لیے خزاں نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں نورِ آفتاب یا اس جیسی کوئی چیز ہے ورنہ جہاں شعاعِ نور نہ ہو وہاں سائے کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ یہ جو سورہ دہر کی آیہ ۱۳ میں ہے:

لا یرون فیھا شمسًا ولا زمھریرًا

وہاں شدت کی دھوپ دیکھیں گے اور نہ زیادہ سردی۔

ہو سکتا ہے یہ موسم کے اعتدال کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سوزشِ آفتاب اور اسی طرح سخت سردی جنت میں نہیں ہے نہ یہ کہ وہاں سورج بالکل نہیں چمکتا۔

کرۂ آفتاب کا خاموش ہو جانا بھی اس کے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے:

قیامت میں زمین و آسمان دوسرے (نئے اور وسیع تر) زمین و آسمان میں تبدیل ہو جائیں گے۔

لہٰذا اگر کہا جائے کہ جہاں سورج کی تمازت اور تپش نہیں وہاں پھر سایہ کس لیے ہے؟ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سائے کا لطف صرف تمازتِ آفتاب سے بچنے میں نہیں ہے بلکہ پتوں سے طبعی اور اوپر جانے والی رطوبت کہ جو نشاط بخش آکسیجن سے ملی ہوتی ہے سائے کو ایک خاص قسم کی لطافت اور تازگی بھی دیتی ہے۔ اسی لیے درخت کا سایہ کمرے کی چھت کے سائے کی طرح ہرگز خشک اور بے رُوح نہیں ہوتا۔

جنت کی یہ تین صفات بیان کرنے کے بعد، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ ہے پرہیز گاروں کا انجام، لیکن کافروں کا انجام آگ ہے (تلک عقبی الذین اتقوا وعقبی الکافرین النار)۔

جنت کی نعمتوں کا ذکر اس خوبصورت اور زیبا تعبیر کے ذریعے لطافت اور تفصیل کے ساتھ ہوا ہے لیکن دوزخیوں کے بارے میں ایک مختصر سا خشک اور سخت جملہ ہے کہ ان کا انجام کار جہنم ہے۔

٭

Marfat.com

۳۶۔ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَنْ يُنْكِرُ بَعْضَهُ ۚ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ ○

ترجمہ

۳۶۔ اور وہ کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے وہ اس پر خوش ہیں کہ جو تجھ پر نازل ہوا ہے اور بعض احزاب (اور گروہ) اس کے ایک حصہ کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ دو: میں مامور ہوں کہ اللہ کی عبادت کروں اور اس کے لیے شریک قرار نہ دوں۔ میں اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور (سب کی) بازگشت اسی کی طرف ہے۔

تفسیر

خداپرست اور دیگر گروہ

اس آیت میں آیات قرآن کے نزول پر لوگوں کے مختلف ردّعمل کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حقیقت کے متلاشی اور حق جو افراد کس طرح جو کچھ پیغمبر پر نازل ہوتا تھا اس پر سر تسلیم خم کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے جب کہ مخالف اور ہٹ دھرم افراد اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دے رکھی ہے وہ اس پر خوش ہوتے ہیں جو کچھ تجھ پر نازل ہوتا ہے (والذین آتیناھم الکتب یفرحون بما انزل الیک)۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "اتیناھم الکتاب" اور اس قسم کی تعبیر پورے قرآن میں عام طور پر یہود و نصاریٰ اور ان جیسے آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ یہاں بھی انہی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور ان جیسے دوسرے حق جو یان حق تجھ پر ان آیات کے نزول پر مسرور ہوتے ہیں کیونکہ ایک طرف تو وہ انہیں ان نشانیوں سے ہم آہنگ پاتے ہیں جو ان کے پاس ہیں اور دوسری طرف یہ ان کے لیے ان خرافات سے نیز یہود و نصاریٰ

Marfat.com

اور دیگر مذاہب کے ان عالم نما جاہلوں کے شر سے آزادی اور نجات کا سبب ہیں جنہوں نے انہیں قید و بند میں جکڑ رکھا ہے اور فکری آزادی اور تکامل و ارتقائے انسانی سے محروم کر رکھا ہے۔

یہ جو بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے کہ "الذین اٰتینا ھم الکتاب" سے مراد حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب و انصار ہیں، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے لیے ایسی تعبیر کا استعمال معمول نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات "بما انزل الیک" سے مطابقت نہیں رکھتی [1]

نیز جو کچھ کہا گیا ہے سورۂ رعد کا مکی ہونا اس کے منافی نہیں کیونکہ یہودیوں کا اصلی مرکز اگرچہ مدینہ اور خیبر تھے اور عیسائیوں کا اصلی مرکز نجران وغیرہ تھا پھر بھی اس میں شک نہیں کہ وہ مکہ آتے جاتے تھے اور مکہ میں ان کے افکار و نظریات اور ثقافت کا تھوڑا بہت اثر تھا۔ اسی بناء پر مکہ کے لوگ ان نشانیوں کی بناء پر کہ جو یہودی خدا کے آخری پیغمبر کے بارے میں بیان کرتے تھے ان میں سے ایسے پیغمبر کے ظہور کے انتظار میں رہتے تھے۔ (اس سلسلے میں ورقہ بن نوفل اور اس قسم کے دیگر افراد کے واقعات مشہور ہیں)۔

قرآن مجید کی دیگر سورتوں میں بھی اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ اہل کتاب میں سے سچے مومنین پیغمبر اسلام پر آیاتِ قرآن کے نزول سے خوش تھے۔ سورۂ قصص کی آیہ ۵۲ میں ہے:

الذین اٰتینا ھم الکتٰب من قبلہ ھم بہ یؤمنون

جنہیں ہم نے اس سے پہلے آسمانی کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان رکھتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: لیکن احزاب میں سے ایک جماعت تجھ پر نازل ہونے والی بعض آیات کا انکار کرتی ہے (ومن الاحزاب من ینکر بعضہ)۔

اس گروہ سے مراد یہود و نصاریٰ کی وہی جماعت ہے کہ جس پر قومی و مذہبی تعصب اور ایسے دوسرے تعصبات کا غلبہ تھا۔ اسی بناء پر قرآن انہیں "اہل کتاب" نہیں کہتا کیونکہ وہ اپنی آسمانی کتب کے سامنے بھی سر تسلیم خم نہیں کیے ہوئے۔ بلکہ حقیقت میں وہ "احزاب" اور مختلف گروہ تھے کہ جو صرف اپنے اپنے گروہ کے راستے پر چلتے تھے۔ یہ گروہ ہر اس چیز کا انکار کر دیتے تھے کہ جو ان کے اپنے میلان، طریقے اور پہلے سے کیے گئے فیصلوں سے ہم آہنگ نہ ہوتی۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "احزاب" مشرکین کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سورہ احزاب میں بھی ان کا اس لفظ کے ذریعے ذکر کیا گیا ہے۔ اصل میں ان کا کوئی دین و مذہب نہ تھا بلکہ وہ بکھرے ہوئے گروہ اور احزاب تھے کہ جو قرآن اور اسلام کی مخالفت میں متحد تھے۔

عظیم مفسر مرحوم طبرسی اور بعض دوسرے مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مندرجہ بالا آیت صفتِ رحمٰن کے ساتھ خداوند عالم کی توصیف سے بت پرستوں کے انکار کی طرف اشارہ ہے جب کہ اہل کتاب خصوصاً یہودی اس توصیف سے آشنائی کی بناء پر قرآنی آیات میں لفظ "رحمٰن" کی موجودگی پر خوشی کا اظہار کرتے تھے اور مشرکین مکہ کہ جو اس صفت سے ناآشنا تھے اس کا مذاق

[1] کیونکہ اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ "ما انزل الیک" "الکتاب" ہی ہو کیونکہ اس صورت میں دونوں قرآن کی طرف اشارہ ہیں حالانکہ قرینہ مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "الکتاب" سے مراد اور ہے اور "ما انزل الیک" سے مراد کچھ اور ہے۔

Marfat.com

اڑاتے تھے۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کی اور اس کی مخالفت اور ہٹ دھرمی کی پرواہ نہ کرو بلکہ اپنے حقیقی خط اور صراطِ مستقیم پر قائم رہو اور کہو: "میں مامور ہوں کہ صرف اللہ کی پرستش کروں کہ جو یکتا و یگانہ خدا ہے اور اس کے لیے کسی شریک کا قائل نہ ہوں میں صرف اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میری اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (قل انما امرت ان اعبد اللہ ولا اشرک بہ الیہ ادعوا و الیہ مآب)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سچے موحد اور حقیقی خدا پرست کا خدا کے فرامین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ اور پروگرام نہیں ہے وہ ان تمام امور کے لیے فرماں بردار ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے کا قائل نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں کہ جس چیز کے بارے میں اس کی رغبت ہو اسے قبول کرلے اور جس کے بارے میں میلان نہ ہو اس کی مخالفت کرے اور انکار کردے۔

ایک اہم نکتہ

ایمان اور جماعتی وابستگیاں: زیر نظر آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا کس طرح یہود و نصاریٰ میں سے سچے مومنین کو "اہلِ کتاب" سے تعبیر کر رہا ہے اور جو لوگ اپنے تعصبات اور ہوا و ہوس کے تابع تھے انہیں "احزاب" قرار دے رہا ہے۔ یہ امر صدر اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر یہود و نصاریٰ میں منحصر نہیں بلکہ حقیقی مومنین اور ایمان کے دعویداروں میں ہمیشہ یہی فرق رہا ہے کہ سچے مومنین فرامین حق کے سامنے تسلیم محض ہوتے ہیں اور ان میں تفریق و تبعیض کے قائل نہیں ہوتے یعنی اپنی خواہش و رغبت کو ان کے تحت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اہلِ کتاب اور اہلِ ایمان کا لقب سجتا ہے۔

لیکن وہ گروہ جو "نؤمن ببعض ونکفر ببعض" کا مصداق ہیں یعنی جو کچھ ان کی ذاتی سوچ، رغبت اور ہوا و ہوس سے ہم آہنگ ہے اسے قبول کر لیتے اور جو کچھ ایسا نہیں اس کا انکار کر دیتے ہیں یا جو کچھ ان کے فائدے میں ہے اسے مان لیتے ہیں اور جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہے اس کا انکار کر دیتے ہیں وہ نہ حقیقی مسلمان ہیں اور نہ سچے مومن بلکہ وہ تو جماعتی وابستگیاں رکھتے اور اپنے مقاصد دین میں تلاش کرتے ہیں اسی لیے تعلیماتِ اسلام اور احکام دین میں ہمیشہ تبعیض کے قائل ہوتے ہیں۔

Marfat.com

۳۷۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ
مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا
وَاقٍ ؑ ○

۳۸۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ
ذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ
لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ○

۳۹۔ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ○

۴۰۔ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا
عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ○

ترجمہ

۳۷۔ جس طرح (کہ ہم نے گزشتہ انبیاء کو آسمانی کتاب دی ہے) تجھ پر بھی واضح اور صریح فرمان نازل کیا ہے اور تیرے پاس آگاہی آجانے کے بعد اگر تو ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو خدا کے سامنے کوئی تیری حمایت کرنے والا اور بچانے والا نہیں ہوگا۔

۳۸۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں اور ان کی بیویاں اور اولاد بھی تھی اور کوئی رسول حکم خدا کے بغیر (اپنی طرف سے) کوئی معجزہ نہیں لا سکتا تھا، ہر زمانہ ایک کتاب رکھتا ہے (اور ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے)۔

۳۹۔ خدا جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبات عطا کرتا ہے اور ام الکتاب اُس کے

Marfat.com

پاس ہے۔

۴۰۔ اور وہ بعض سزائیں کہ جن کا ہم نے اُن سے وعدہ کیا ہے تجھے دکھائیں یا (ان سزاؤں کے آنے سے پہلے) ہم تجھے مار دیں تو ہر حالت میں تو فقط ابلاغ پر مامور ہے اور (ان کا) حساب ہمارے ذمہ ہے۔

تفسیر

قطعی اور قابلِ تغیر حوادث

ان آیات میں بھی نبوت سے مربوط مسائل کا سلسلہ جاری ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جیسے ہم نے اہلِ کتاب اور گزشتہ انبیاء پر آسمانی کتاب نازل کی ویسے ہی یہ قرآن بھی تم پر نازل کیا ہے اس حالت میں کہ یہ واضح و آشکار احکام پر مشتمل ہے (وکذلک انزلناہ حکمًا عربیًا)۔

جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے "عربی" فصیح اور واضح گفتگو کے معنی میں ہے:

الفصیح البین من الکلام

لہٰذا جس وقت کہا جاتا ہے: "امرأۃ عروبۃ" تو اس کا مفہوم ہے: "وہ عورت جو اپنی عفت و پاکدامنی سے آگاہ ہو"

اس کے بعد راغب مزید کہتا ہے:

قولہ حکمًا عربیًا قیل معناہ مفصحًا یحق الحق ویبطل الباطل

یہ جو خدا نے فرمایا ہے" حکما عربیا" اس کا مفہوم ہے ایسی واضح اور آشکار گفتگو جو حق کو ثابت کرتی ہے اور باطل کا بطلان کرتی ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "عربی" یہاں "شریف" کے معنی میں ہے کیونکہ لغت میں یہ لفظ اس معنی میں بھی آیا ہے۔

اس طرح اس صفت سے قرآن کی توصیف سے مراد یہ ہے کہ اس کے احکام واضح و آشکار ہیں اور اس سے غلط فائدہ اٹھانے اور مختلف تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے اس تعبیر کے بعد دیگر آیات میں استقامت، ٹیڑھا پن نہ ہونے اور یا علوم آلٰہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ زمر کی آیت ۲۸ میں ہے:

قرآنا عربیًا غیر ذی عوج

یہ آشکار قرآن ہے کہ جو ہر قسم کی کجی اور ٹیڑھ پن سے پاک ہے۔

سورہ حٰم السجدہ کی آیہ ۲ میں ہے:

Marfat.com

کتاب فصلت اٰیاتہ قراٰنا عربیًا لقوم یعلمون

یہ وہ کتاب ہے کہ جس کی آیات تشریح شدہ ہیں اور یہ اُن کے لیے واضح و آشکار قرآن ہے کہ جو جاننا چاہے۔

اس طرح اس آیت میں قبل اور بعد کا جملہ تائید کرتا ہے کہ "عربیت" سے مراد بیان کا واضح، روشن اور پیچ و خم سے خالی ہونا چاہیے۔

یہ تعبیر قرآن کی سات سورتوں میں آئی ہے لیکن چند ایک مواقع پر "لسان عربی مبین" اور اس قسم کے دیگر الفاظ بھی آئے ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی اسی معنی یعنی بیان کا روشن، واضح اور ابہام سے خالی ہونا، میں ہو۔

البتہ اس خاص موقع پر ہو سکتا ہے عربی زبان کی طرف اشارہ ہو کیونکہ خدا ہر نبی کو اس کی اپنی قوم کی زبان میں مبعوث کرتا تھا تاکہ وہ سب سے پہلے اپنی قوم کو ہدایت کرے اس کے بعد اس انقلاب کا دامن دوسری جگہوں تک پھیلائے۔

اس کے بعد تہدید آمیز اور قاطع لہجے میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب کہ حقیقت تجھ پر آشکار ہو جائے تو اس کے بعد اگر تو اُن کی خواہشات کی پیروی کرے تو تمہیں خدائی عذاب کے ذریعے سزا ہو گی (ولئن اتبعت اھوائھم بعد ما جاءك من العلم مالك من الله من ولی ولا واق)۔

پیغمبر اکرمؐ کے مقام عصمت، معرفت اور علم و آگہی کی وجہ سے اگرچہ ان کے لیے انحراف کا احتمال یقیناً نہیں ہے لیکن یہ الفاظ اولاً تو واضح کرتے ہیں کہ خدا کسی شخص کے ساتھ خصوصی ارتباط نہیں رکھتا بالفاظ دیگر اس کی کسی سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے یہاں تک کہ اگر پیغمبر کا مقام بلند و بالا ہے تو ان کی تسلیم و عبودیت اور ایمان و استقامت کی بناء پر ہے۔

ثانیاً یہ بات دوسروں کے لیے تاکید ہے کہ جہاں پیغمبر جیسی ہستی راہ حق سے انحراف اور باطل راستے کی طرف میلان کی صورت میں خدائی سزا سے بچ نہیں سکتی تو پھر دوسروں کی حیثیت واضح ہے۔

یہ بعینہ اس طرح ہے کہ کوئی شخص اپنے اچھے اور نیک بیٹے کو مخاطب کر کے کہے، اگر تو اپنا ہاتھ غلط کاریوں سے آلودہ کرے تو میں تجھے سزا دوں گا تاکہ دوسروں کو اپنا حساب کتاب معلوم ہو جائے۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "ولی" (سرپرست و محافظ) اور "واق" (نگہدار) اگرچہ معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں تاہم ان میں فرق یہ ہے کہ ایک مثبت پہلو کو بیان کرتا ہے اور دوسرا منفی پہلو کو۔ ایک نصرت و مدد کرنے والے کے معنی میں ہے اور دوسرا دفاع اور حفاظت کرنے والے کے معنی میں ہے۔

بعد والی آیت درحقیقت ان مختلف اعتراضات کا جواب ہے کہ جو دشمن آپ پر کرتے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر نوع بشر میں سے ہو اور اس کی بیوی اور بچے ہوں تو مندرجہ بالا آیت انہیں جواب دیتے ہوئے کہتی ہے: یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم نے تجھ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ہیں۔ ان کی بیویاں بھی تھیں اور اولاد بھی (ولقد ارسلنا رسلاً من قبلك وجعلنا لھم ازواجًا و ذریۃ)۔[1]

[1] بعض مفسرین نے اس آیت کے لیے ایک شان نزول ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے پیغمبر اکرم کی ایک سے زیادہ ازواج ہونے پر اعتراض کیا تھا حالانکہ سورہ رعد مکی ہے اور مکہ میں تعداد ازواج کا معاملہ درپیش نہیں تھا۔

Marfat.com

ان کے اعتراض سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یا تو تاریخِ انبیاء سے ناواقف تھے یا اپنے آپ کو نادانی اور جہالت میں رکھے ہوئے تھے ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے۔

دوسرا یہ کہ انہیں توقع تھی کہ وہ جو معجزہ بھی تجویز کریں اور جو بھی ان کی خواہشات کا تقاضا ہو آپ اسے انجام دیں (چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں)۔ لیکن انہیں جاننا چاہیے کہ "کوئی رسول حکمِ خدا کے بغیر کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا" (وما کان لرسول ان یأتی بایة الا باذن الله)۔

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کیوں آئے ہیں اور انہوں نے تورات یا انجیل کے احکام کو کیوں تبدیل کر دیا ہے، کیا یہ آسمانی کتب نہیں ہیں اور خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا اپنا حکم تبدیل کر دے؟ (یہ اعتراض خصوصاً اس امر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے کہ یہودی نسخِ احکام کے ناممکن ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے)۔

زیرِ نظر آیت اپنے آخری جملے میں انہیں جواب دیتی ہے: ہر زمانے کے لیے ایک حکم اور قانون مقرر ہوا ہے (تاکہ بشریت اپنے آخری بلوغ تک پہنچ جائے اور آخری حکم صادر ہو) (لکل اجل کتاب)۔

لہٰذا مقامِ تعجب نہیں کہ ایک دن وہ تورات نازل کرے، دوسرے دن انجیل نازل کرے اور پھر قرآن۔ کیونکہ تکاملِ حیات کے لیے مختلف اور گوناگوں پروگراموں کی ضرورت ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "لکل اجل کتاب" ان لوگوں کا جواب ہو جو کہتے ہیں کہ اگر پیغمبر سچ کہتا ہے تو پھر کیوں خدائی عذاب اس کے مخالفین کا قلع قمع نہیں کرتا۔ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ہے اور کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے۔ سزا اور عذاب کا وقت بھی آپہنچے گا۔[1]

جو کچھ گزشتہ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے بعد والی آیت اس کے لیے تاکید و استدلال کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ ہر حادثے اور حکم کے لیے ایک معین زمانہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے:

ان الامور مرهونة باوقاتها

اور اگر دیکھتے ہو کہ بعض آسمانی کتب دیگر کتب کی جگہ لیتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "خدا جو چیز چاہتا ہے محو کر دیتا ہے جیسے وہ اپنے ارادے اور حکمت کے تقاضے سے کچھ امور کا اثبات کرتا ہے نیز کتاب اصلی اور ام الکتاب اُس کے پاس ہے" (یمحوا الله ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب)۔

آخر میں مزید تاکید کے طور پر ان عذابوں کا ذکر ہے کہ پیغمبر جن کا وعدہ کرتے تھے اور وہ ان کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اعتراض کرتے تھے کہ تمہارے وعدے نے عملی شکل کیوں اختیار نہیں کی۔ ارشاد ہوتا ہے: اور بعض امور کہ جن کا ہم نے وعدہ کر رکھا ہے (یعنی تیری کامیابی، ان کی شکست، تیرے پیروکاروں کی رہائی اور ان کے پیروکاروں کی اسارت) ہم تجھے تیری زندگی میں دکھائیں یا ان وعدوں

---

[1] البتہ اس معنی کے مطابق، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے مندرجہ بالا جملے میں تقدیم و تاخیر کا قائل ہونا پڑے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ تقدیر میں "لکل کتاب اجل" تھا (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

پرعمل درآمد سے پہلے تجھے اس دنیا سے لے جائیں تیری ذمہ داری بہرصورت ابلاغ رسالت ہے اور ہماری ذمہ داری ان سے حساب لینا ہے (وان ما نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک فانما علیک البلاغ و علینا الحساب)۔

دو اہم نکات

۱۔ لوحِ محو و اثبات اور ام الکتاب: "یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت" مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ انبیاء پر نزول معجزات یا آسمانی کتب کے نازل ہونے کے بارے میں آیا ہے لیکن اس میں ایک عمومی قانون بیان کیا گیا ہے کہ جس کی طرف مختلف منابع اسلامی میں بھی اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ تحقق موجودات اور عالم کے مختلف حوادث کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ قطعیت ہے کہ جس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا (مذکورہ بالا آیت میں "ام الکتاب" اسی کی طرف اشارہ ہے)۔ دوسرا مرحلہ غیر قطعی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مشروط ہے کہ اس مرحلے میں تبدیلی ممکن ہے لہٰذا اسے مرحلۂ محو و اثبات کہتے ہیں۔

کبھی انہیں "لوحِ محفوظ" اور "لوحِ محو و اثبات" بھی کہا جاتا ہے۔ گویا ان میں سے ایک لوح میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ بالکل محفوظ ہے لیکن دوسری میں ممکن ہے کوئی چیز لکھی جائے اور پھر وہ محو ہو جائے اور اس کی جگہ دوسری چیز لکھی جائے۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ کبھی ایک حادثہ پر ہم اس کے ناقص اسباب کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً زہر قاتل کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ انسان کو ختم کر دے، اسے نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ جو شخص اسے کھائے گا مر جائے گا مگر اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ اس زہر کے لیے ایک "ضد زہر" بھی ہے اگر اس کے بعد اسے کھا لیا تو اس کے اثرات ختم ہو جائیں گے (البتہ ممکن ہے ہم بے خبر تو نہ ہوں لیکن اس "ضد زہر" کے بارے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھیں)۔

اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ حادثہ یعنی زہر کھانے سے موت، قطعی پہلو نہیں رکھتا یعنی اس مقام پر "لوحِ محو و اثبات" ہے کہ جس میں دوسرے حوادث پر نظر رکھتے ہوئے تغیر ممکن ہے لیکن اگر حادثے کو اس کی علتِ تامہ یعنی مقتضی کے وجود، تمام شرائط کی موجودگی اور تمام موانع کے خاتمے کے ساتھ نظر میں رکھیں (مندرجہ بالا مثال میں زہر کھانے اور "ضد زہر" نہ کھانے کے ساتھ نظر میں رکھیں) تو پھر یہاں حادثہ قطعی ہے جو اصطلاح کے مطابق اس کی جگہ لوحِ محفوظ اور ام الکتاب میں ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

یہ بات ایک اور طرح بیان کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ خدا کے علم کے دو مرحلے ہیں۔ "مقتضیات اور عللِ ناقصہ کا علم" اور "عللِ تامہ کا علم"۔ جو دوسرے مرحلے سے مربوط ہے اسے علم الکتاب اور لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے اور جو پہلے مرحلے سے مربوط ہے اسے لوحِ محو و اثبات سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ آسمان کے کسی گوشے میں کوئی لوح اور تختی نہیں رکھی ہوئی کہ جس پر کوئی چیز لکھی جاتی ہو یا مٹا کر اس پر دوسری چیز لکھی جاتی ہو۔

یہاں سے منابع اسلامی کے مطالعہ سے سامنے آنے والے بہت سے سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہے کیونکہ کبھی کبھی روایات یا بعض قرآنی آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں کام فلاں نتیجے کا سبب بنتا ہے لیکن ہم بعض اوقات اس میں ایسا نتیجہ نہیں دیکھتے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ اس نتیجے کا حصول بعض شرائط یا موانع کا حامل ہوتا ہے کہ جو شرط پوری نہ ہونے یا رکاوٹ دور نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو پاتا۔

Marfat.com

نیز بہت سی روایات کہ جو لوح محفوظ، لوح محو و اثبات اور انبیاء و آئمہ علیہم السلام کے علم کے بارے میں ہیں ان کا مفہوم اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے۔ ان میں سے چند روایات ہم بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

(۱) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں رسول اللہؐ سے سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا:

لاقرن عینیک بتفسیرها و لاقرن عین امتی بعدی بتفسیرها الصدقة علی وجهها وبر الوالدین و اصطناع المعروف یحول الشقاء سعادة، ویزید فی العمر، ویقی مصارع السوء.

اس آیت کی تفسیر سے میں تیری آنکھوں کو روشن کروں گا اور اسی طرح اپنے بعد اپنی امت کی آنکھوں کو۔ ضرورت مندوں کی صحیح طریقے سے مدد کرنا، ماں باپ سے نیکی کرنا اور اچھے کام کو انجام دینا شقاوت کو سعادت میں بدل دیتا ہے، زندگی کو طولانی کر دیتا ہے اور خطرات سے بچاتا ہے۔[1]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سعادت و شقاوت کوئی حتمی اور ناقابل تغیر امر نہیں۔ یہاں تک کہ اگر انسان نے ایسے اعمال انجام دیئے ہوں کہ جن کی وجہ سے بدبختوں کی صف میں شامل ہو تو وہ اپنی جگہ تبدیل کر کے اور نیکیوں کا رخ کر کے خصوصاً مخلوق خدا کی مدد اور خدمت کر کے اپنی سرنوشت کو بدل سکتا ہے کیونکہ ان امور کا مقام لوح محو و اثبات ہے نہ کہ ام الکتاب۔

توجہ رہے کہ جو کچھ مندرجہ بالا حدیث میں آیا ہے وہ مفہوم آیت کا ایک حصہ ہے کہ جو ایک مثال کے طور پر بیان ہوا ہے۔

(۲) امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

من الامور امور محتومة کائنة لا محالة، ومن الامور امور موقوفة عند الله، یقدم فیها ما یشاء ویمحو ما یشاء ویثبت منها ما یشاء۔۔۔۔

کچھ امور و حوادث حتمی ہیں کہ جو یقیناً رونما ہوتے ہیں اور بعض خدا کے ہاں کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں وہ جس میں مصلحت دیکھتا ہے اسے مقدم کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبت کر دیتا ہے۔[2]

نیز مرقوم ہے کہ امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

لولا اٰیة فی کتاب الله لحدثتکم بما کان و ما یکون الی یوم القیامة، فقلت له ایة اٰیة فقال قال الله: یمحوا الله ما یشاء و یثبت و عنده ام الکتاب

اگر قرآن میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں گزشتہ اور آئندہ قیامت تک کے حوادث کی تمہیں خبر دیتا۔

---

[1] و [2] المیزان جلد ۱۱ ص٤١٩۔

Marfat.com

راوی حدیث کہتا ہے: میں نے عرض کیا کہ کونسی آیت ہے تو فرمایا:

خدا فرماتا ہے: یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب[1]

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مختلف حوادث کے متعلق دین کے عظیم راہبروں کے کم از کم کچھ علوم لوحِ محو و اثبات سے مربوط ہیں اور لوحِ محفوظ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ خدا سے مخصوص ہے اور وہ اس کے کچھ حصے کی کہ جس میں مصلحت سمجھتا ہے اپنے خاص بندوں کو تعلیم دے دیتا ہے۔

رمضان المبارک کی راتوں کی دعاؤں میں ہم پڑھتے ہیں:

وان کنت من الاشقیاء فامحنی من الاشقیاء واکتبنی من السعداء

اگر میں شقاوت مندوں میں سے ہوں تو ان میں سے حذف کرکے مجھے سعادت مندوں میں لکھ دے (یعنی مجھے اس کام کی توفیق دے)۔

بہرحال جیسا کہ کہا جا چکا ہے محو و اثبات کا ایک جامع مفہوم ہے۔ شرائط کی تبدیلی اور موانع کی موجودگی کے زیر اثر اس میں ہر قسم کی تبدیلی شامل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے کسی خاص مصداق کی نشاندہی کی ہے مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ یہ توبہ کے زیر اثر گناہوں کے محو ہونے یا حالات بدلنے سے روزی کم یا زیادہ ہونے یا اس قسم کے امور کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے ہر بات اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے جب مراد ایک مصداق بیان کرنا ہو۔

۲۔ بدا کیا ہے؟ شیعہ اور سنی میں جو ایک پیچیدہ سی بحث پیدا ہو گئی ہے وہ مسئلہ "بدا" کے بارے میں ہے۔

فخر رازی اپنی تفسیر میں زیر بحث آیت کے ذیل میں کہتا ہے:

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے لیے بدا جائز ہے اور ان کے نزدیک بدا کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص ایک چیز کا معتقد ہو پھر ظاہر ہو جائے کہ حقیقت اس کے اعتقاد کے برخلاف ہے اور یہ بات ثابت کرنے کے لیے انہوں نے "یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت" کی آیت کا سہارا لیا ہے۔

فخر رازی مزید کہتا ہے:

یہ عقیدہ باطل ہے کیونکہ علمِ خدا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے اور جو ایسا ہو اس میں تغیر و تبدل محال ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسئلہ بدا کے بارے میں شیعہ عقیدہ سے عدم آگاہی اور لاعلمی کے سبب بہت سے اہل سنت بھائیوں نے شیعوں کی طرف ایسی ناروا نسبتیں دی ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے:

لغت میں لفظ "بداء" آشکار ہونے اور پوری طرح واضح ہونے کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ پشیمانی کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ جو شخص پشیمان ہوتا ہے یقیناً اسے کوئی نئی چیز پیش آتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے خدا کے بارے میں بداء کا کوئی مفہوم نہیں اور ممکن نہیں۔ اور کسی عقلمند اور

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۵۱۲۔

Marfat.com

دانا کے لیے ممکن نہیں کہ اسے یہ احتمال ہو کہ کوئی مطلب خدا سے پوشیدہ ہوتا ہے اور پھر وقت گزرنے سے اس پر آشکار ہو جاتا ہے۔ اصولی طور پر یہ بات صریح کفر ہے اور کھٹکنے والی ہے۔ اس بات کا لازمی مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذاتِ پاک کی طرف جہالت کی نسبت دی جائے اور اس کی ذات کو محلِ تغیر اور محلِ حوادث سمجھا جائے حاشا و کلا۔ شیعہ امامیہ ذاتِ مقدس پروردگار اور خدائے لایزال کے بارے میں ایسا احتمال ہرگز نہیں رکھتے۔

جس معنی میں شیعہ بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں اور جس کے مطابق روایاتِ اہلِ بیتؑ میں آیا ہے کہ

ما عرف الله حق معرفته من لم یعرفه بالبداء

جس نے خدا کو بداء کے ساتھ نہیں پہچانا اس نے ٹھیک طرح سے خدا کو نہیں پہچانا۔

وہ یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم علل و اسباب کے ظواہر کے مطابق محسوس کرتے ہیں کہ ایک واقعہ وقوع پذیر ہوگا یا کسی پیغمبر کو ایسا واقعہ پیش آنے کی خبر دی گئی حالانکہ ہم بعد میں دیکھتے ہیں ایسا واقع نہیں ہوا تو اس موقع پر ہم کہتے ہیں کہ "بداء" واقع ہوا ہے یعنی جس امر کو ہم واقع شدہ سمجھتے تھے اور اس کے رونما ہونے کو یقینی جانتے تھے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔

اس بات کی بنیاد اور اصلی علت وہی ہے جو گزشتہ بحث میں بیان ہو چکی ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ہماری آگاہی کا تعلق صرف عللِ ناقصہ سے ہوتا ہے اور ہم شرائط و موانع نہیں دیکھ پاتے اور ہم اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد جب شرط کے فقدان یا مانع کے وجود سے سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس کی ہم توقع کر رہے ہوتے ہیں اس کے خلاف واقع ہو جاتا ہے تو پھر ہم ان مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح کبھی پیغمبر یا امام لوحِ محو و اثبات سے آگاہی حاصل کر لیتے ہیں جب کہ یہ طبعاً قابلِ تغیر ہے اور پھر موانع پیش آنے اور شرائط مفقود ہونے کی بناء پر اس طرح رونما نہیں ہوتا۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے "نسخ" اور "بداء" کا آپس میں موازنہ کرنا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک نسخِ احکام جائز ہے۔ یعنی ممکن ہے ایک حکم شریعت میں نازل ہو اور لوگ سمجھیں کہ یہ ابدی حکم ہے لیکن پھر وہ ذاتِ پیغمبر کے ذریعے منسوخ قرار پا جائے اور اس کی جگہ دوسرا حکم آجائے (جیسے ہم نے تفسیر، فقہ اور حدیث میں قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں پڑھا ہے)۔

یہ درحقیقت "بداء" کی ایک قسم ہے لیکن عام طور پر امورِ تشریعی اور احکام و قوانین میں اسے نسخ کہتے ہیں اور امورِ تکوینی میں اس کی نظیر کو "بداء" کا نام دیتے ہیں۔ اسی بناء پر بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ نسخِ احکام ایک قسم کا بداء ہے اور امورِ تکوینی میں بداء ایک قسم کا نسخ ہے۔ کیا کوئی شخص اپنے منطقی امر کا انکار کر سکتا ہے سوائے ایسے شخص کے جو علتِ تامہ اور علتِ ناقصہ کے درمیان فرق نہ کر سکے یا یہ کہ وہ شیعیانِ اہلِ بیت کے خلاف ہونے والے منحوس پراپیگنڈا کا شکار ہو جائے اور اس کا تعصب اسے اجازت نہ دے کہ شیعہ عقائد کا مطالعہ خود ان کی کتب سے کرے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فخرالدین رازی نے "یمحوا الله ما یشاء و یثبت" کے ذیل میں بداء کے بارے میں شیعوں کے عقیدے کی بات تو کی ہے لیکن اس نے اس مسئلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ بداء اسی "محو و اثبات" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس نے تو اپنے مخصوص تعصب کی بناء پر صرف شیعوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بداء کے قائل کیوں ہیں۔

Marfat.com

اجازت دیجئے کہ مسئلہ بداء کے بارے میں چند ایسے نمونے پیش کیے جائیں کہ جنہیں سب نے قبول کیا ہے۔

(۱) حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ ان کی قوم کی نافرمانی سبب بنی کہ عذاب الٰہی اُن کی طرف آئے اور اس عظیم پیغمبر نے بھی چونکہ انہیں قابل ہدایت نہ سمجھا اور انہیں مستحق عذاب جانا تو انہیں چھوڑ کر چلے گئے لیکن اچانک "بداء واقع ہوا" اس قوم کے ایک عالم نے جب آثارِ عذاب دیکھے تو انہیں جمع کیا اور توبہ کی دعوت دی۔ سب نے اس کی بات مان لی اور وہ عذاب کہ جس کی نشانیاں ظاہر ہو چکی تھیں ٹل گیا۔

فلولا كانت قرية اٰمنت فنفعها ايمانها الا قوم يونس لما اٰمنوا كشفنا عنهم عذاب الخزى فى الحيوٰة الدنيا ومتعناهم الى حين

(یونس۔ ۹۸)

(۲) اسلامی تواریخ میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دلہن کے بارے میں خبر دی کہ وہ اسی شب زفاف مر جائے گی لیکن وہ آپ کی پیش گوئی کے برخلاف زندہ رہی جب آپ سے ماجرا پوچھا گیا تو فرمایا:

کیا تم نے اس سلسلے میں کوئی صدقہ دیا ہے۔

انہوں نے کہا:

جی ہاں

تو آپؑ نے فرمایا:

صدقہ حتمی بلاؤں کو دور کر دیتا ہے[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے درحقیقت لوحِ محو و اثبات سے ارتباط کی وجہ سے ایسے واقعہ کے رونما ہونے کی خبر دی تھی حالانکہ یہ واقعہ مشروط تھا (شرط یہ تھی کہ اس میں صدقہ کی طرح کا کوئی مانع پیدا نہ ہو) لیکن جب مانع پیدا ہو گیا تو نتیجہ کوئی اور نکل آیا۔

(۳) بہادر بت شکن ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہ اسماعیلؑ کو ذبح کرنے پر مامور ہوئے اور اس ماموریت کے بعد اپنے بیٹے کو قربان گاہ میں لے گئے لیکن جب انہوں نے ثابت کر دیا کہ میں پوری طرح آمادہ ہوں تو بداء واقع ہو گیا اور واضح ہو گیا کہ یہ ایک امتحان تھا اس عظیم پیغمبر اور ان کے فرزند ارجمند کی اطاعت و تسلیم کو آزمایا جائے۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ پہلے وہ مامور ہوئے کہ اپنی قوم سے تیس دن تک علیحدہ رہیں اور احکام تورات حاصل کرنے کے لیے خدائی وعدہ گاہ کی طرف جائیں لیکن پھر (بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے) اس مدت کو دس دن بڑھا دیا گیا۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بداء کے ایسے واقعات کا کیا فائدہ ہے؟

اس سوال کا جواب ان امور میں توجہ کرنے سے ظاہراً مشکل نہیں رہتا جن کا سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات

---

[1] بحار الانوار، چاپ قدیم، جلد ۲ صفحہ ۱۳۱ از امالی صدوق۔

Marfat.com

اہم مسائل مثلاً کسی شخص کی آزمائش، کسی قوم کا امتحان، توبہ اور خدائی بازگشت (جیسے داستانِ یونس میں آیا ہے) صدقہ، حاجتمند دل کی مدد اور نیک کاموں کے زیرِ اثر دردناک حوادث برطرف ہو جاتے ہیں۔ ایسے امور تقاضا کرتے ہیں کہ آئندہ کے واقعات پہلے اس طرح سے منظم ہوں اور پھر شرائط و حالات بدلنے سے وہ بھی بدل جائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کی سرنوشت خود انہی کے ہاتھ ہے اور روش کی تبدیلی سے وہ اپنی تقدیر بدلنے پر قادر ہیں اور یہ بداء کا بہت بڑا فائدہ ہے (غور کیجئے گا) اور جو ہم نے پڑھا ہے کہ جس شخص نے خدا کو بداء کے ساتھ نہیں پہچانا وہ اس کی پوری معرفت نہیں رکھتا، یہ بھی انہی حقائق کی طرف اشارہ ہے

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ما بعث الله عزوجل نبیاً حتّٰی یاخذ علیه ثلاث خصال الاقرار بالعبودیة، و خلع الانداد، و ان الله یقدم ما یشاء و یوخر ما یشاء

خدا نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس سے یہ تین پیمان لیے۔ پروردگار کی بندگی کا اقرار، ہر قسم کے شرک کی نفی اور یہ کہ خدا جس چیز کو چاہتا ہے مقدم کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے مؤخر کرتا ہے[1]

حقیقت میں پہلا پیمان خدا کی اطاعت اور اس کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے سے مربوط ہے دوسرا عہد شرک کے خلاف قیام کرنے سے متعلق ہے اور تیسرا مسئلہ بداء سے مربوط ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ حالات تبدیل کر کے اپنے آپ کو لطفِ الٰہی یا عذابِ خدا کا حقدار بنا لیتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا پہلوؤں کی بناء پر علماءِ شیعہ نے کہا ہے کہ جب "بداء" کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو "ابداء" کے معنی میں ہوتی ہے یعنی کسی ایسی چیز کو ظاہر کر دینا جو پہلے ظاہر نہ ہوا اور جس کی پیشین گوئی نہ کی جا سکتی ہو۔

لیکن ــــ شیعوں کی طرف یہ نسبت دینا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کبھی کبھی اپنے کام پر پشیمان ہو جاتا ہے یا کسی ایسی چیز سے باخبر ہو جاتا ہے جس سے پہلے آگاہ نہ ہو ــــ یہ بہت بڑی زیادتی ہے اور ایسی تہمت ہے جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔

اسی لیے آئمہ معصومین علیہم السلام سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

من زعم ان الله عزوجل یبدو له فی شیء لم یعلمه امس فابرؤا منه

جو شخص یہ گمان کرے کہ خدا پر کوئی ایسی چیز آج آشکار ہوتی ہے جسے وہ کل نہیں جانتا تھا تو ایسے شخص سے بیزاری اختیار کرو[2]

---

[1] اصولِ کافی جلد ۱ صفحہ ۱۱۴، سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۶۱۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۶۱۔

۴۱۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ
لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○
۴۲۔ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا
تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ○
۴۳۔ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ
بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ○

ترجمہ

۴۱۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ ہم ہمیشہ زمین کے اطراف (وجوانب) کو کم کرتے رہتے ہیں (معاشرے، تمدن اور علماء تدریجاً ختم ہوتے رہتے ہیں) اور خدا حکومت کرتا ہے اور کسی شخص کو اسے روکنے یا اس کے احکام رد کرنے کا یارا نہیں اور وہ سریع الحساب ہے۔

۴۲۔ وہ لوگ جنہوں نے ان سے پہلے سازشیں کیں اور منصوبے بنائے لیکن منصوبہ بنانا تو خدا کا کام ہے کہ جو ہر شخص کے کام سے آگاہ ہے اور عنقریب کفار جان لیں گے کہ دوسرے گھر میں (نیک و بد) انجام کس کا ہے۔

۴۳۔ جو کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے۔ کہہ دے کہ خدا اور وہ لوگ کہ جن کے پاس علم کتاب (اور قرآن کی آگاہی) ہے (میری) گواہی کے لیے کافی ہیں۔

تفسیر

انسان اور معاشرے ختم ہو جاتے ہیں، خدا باقی رہتا ہے

گزشتہ آیات میں روئے سخن رسول اللہ کی رسالت کے منکرین کی طرف تھا۔ ان آیات میں اس بحث کو جاری رکھا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے

Marfat.com

کہ انہیں تنبیہ کی جائے، انہیں بیدار کیا جائے۔ ان کے سامنے استدلال کیا جائے الغرض مختلف طریقوں سے انہیں عقل راہ پر لگا کر غور و فکر کرنے اور پھر اپنی حالت کی اصلاح کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے، ان مغرور اور ہٹ دھرم افراد نے دیکھا نہیں کہ ہم مسلسل زمین کے اطراف و جوانب کو کم کرتے رہتے ہیں (اولم یروا انا ناتی الارض ننقصها من اطرافها)۔

واضح ہے کہ زمین سے یہاں مراد اہل زمین ہیں۔ یعنی کیا وہ اس واقعیت کی طرف نگاہ نہیں کرتے کہ ہمیشہ اقوام، تمدن اور حکومتیں زوال پذیر ہوتی ہیں۔ وہ قومیں کہ جوان سے زیادہ قوی تھیں، زیادہ طاقتور تھیں اور زیادہ سرکش تھیں، ان سب نے اپنے اپنے منہ مٹی میں چھپا لیے۔ یہاں تک کہ علماء، بزرگ اور دانشور کہ جو زمین کا سہارا تھے انہوں نے بھی اس جہان سے آنکھیں بند کرلیں اور ابدیت کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ کیا یہ ہمہ گیر قانون حیات کہ جو تمام افراد، تمام انسانی معاشروں اور ہر چھوٹے بڑے پر جاری و ساری ہے ان کے بیدار ہونے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اس چند روزہ زندگی کو ابدی نہ سمجھیں اور اسے غفلت میں نہ گزاردیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے، حکومت اور فرمان جاری کرنا خدا کے لیے ہے اور کسی شخص میں اس کے فرمان کو رد کرنے اور اسے روکنے کا یارا نہیں ہے (و اللہ یحکم لا معقب لحکمہ) اور وہ سریع الحساب ہے (و ھو سریع الحساب)۔

اس بناء پر ایک طرف تو اس نے تمام افراد اور سب قوموں کی پیشانی پر قانون فنا رقم کردیا ہے اور دوسری طرف کسی کی مجال نہیں کہ اس فرمان کو یا خدا کے دوسرے فرامین کو بدل سکے اور تیسری طرف وہ بندوں سے بڑی تیزی سے حساب لیتا ہے اور اس طرح سے اس کی جزا قطعی ہے۔

کئی ایک روایات کہ جو تفسیر برہان، نور الثقلین، دیگر تفاسیر اور کتب حدیث میں آئی ہیں ان میں زیر نظر آیت کی تفسیر علماء اور دانشمند بیان کی گئی ہے کیونکہ ان کا فقدان زمین اور اسلامی معاشرے کی کمی اور نقصان کا سبب بنتا ہے۔

مفسر بزرگ طبرسی اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

ننقصها بذهاب علمائها، و فقهائها و خيارها

ہم زمین میں اس کے علماء، فقہاء اور نیک لوگوں کے چلے جانے سے کمی واقع کریں گے[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام شہید ہوئے تو عبداللہ بن عمر نے یہ آیت پڑھی:

انا ناتي الارض ننقصها من اطرافها

اس کے بعد کہا:

يا امير المؤمنين لقد كنت الطرف الاكبر في العلم، اليوم نقص علم الاسلام و مضى ركن الايمان

اے امیر المومنین آپ عالم انسانیت میں علم کی بہت بڑی "طرف" تھے۔ آپ کی شہادت سے آج اسلام کا علم و دانش

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۳۰۱۔

Marfat.com

نقصان کی طرف جھک گیا اور ایمان کا ستون گر گیا[1]

البتہ ــــ جیسا کہ ہم نے کہا ہے آیت کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ اس میں ہر قسم کا نقصان اور کمی شامل ہیں چاہے وہ افراد ہوں، یا معاشرے یا بطور کلی اہل زمین۔ یہ تمام لوگوں کے لیے جرس بیداری ہے چاہے وہ نیک ہوں یا برے حتیٰ کہ علماء اور دانشمندوں کے لیے بھی کہ جو انسانی معاشروں کے ستون ہیں جب کہ ان میں سے کبھی ایک کے چلے جانے سے پوری دنیا کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ سب کے لیے بولتی ہوئی اور ہلا دینے والی صدائے ہوشیار باش ہے۔

باقی رہا یہ کہ بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ زمین کے نقصان سے مراد کفار کی زمینوں کا کم ہونا اور مسلمان علاقوں میں اضافہ ہونا ہے اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت تو ایسی فتوحات نہیں تھیں کہ کفار جنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور قرآن ان کی طرف اشارہ کرتا۔

نیز یہ جو بعض مفسرین کہ جو علوم طبیعی میں مستغرق ہیں وہ زیر نظر آیت کو قطبین کی طرف سے زمین کے کم ہونے اور استوائی جانب سے زیادہ ابھرنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ قرآن کی زیر نظر آیت میں یہ چیز بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے، صرف یہی گروہ نہیں کہ جو سازشوں اور مکر و فریب کے ساتھ تمہارے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ "ان سے پہلے والے بھی سازشیں اور مکاریاں کیا کرتے تھے" (و قد مکر الذین من قبلھم)۔

لیکن ان کے منصوبے نقش بر آب ہو گئے اور ان کی سازشیں حکم خدا سے بے اثر ہو کر رہ گئیں کیونکہ وہ ہر شخص کے معاملات خود اس سے بہتر جانتا ہے بلکہ "تمام منصوبے خدا کے لیے ہیں" (فللہ المکر جمیعًا) وہ ہے کہ جو ہر شخص کے کسب و کار سے آگاہ ہے اور "وہ جانتا ہے کہ ہر شخص کیا انجام دیتا ہے" (یعلم ما تکسب کل نفس)۔

اور پھر تہدید کے لہجے میں انہیں ان کے انجام کار سے ڈراتے ہوئے فرمایا گیا ہے، کفار بہت ہی جلد جان لیں گے کہ انجام کار اور نیک و بد عاقبت دوسرے جہان میں کس کس کے لیے ہے (وسیعلم الکفار لمن عقبی الدار)۔

جس طرح سے یہ سورت قرآن اور کتاب اللہ کے ذکر سے شروع ہوئی تھی اسی طرح زیر بحث آخری آیت میں قرآن کے معجزہ ہونے پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اسی پر سورہ رعد ختم ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے (ویقول الذین کفروا لست مرسلاً) یہ لوگ ہر روز ایک نیا بہانہ تراشتے ہیں، ہر وقت معجزے کا تقاضا کرتے ہیں اور پھر بھی انکار کرتے ہیں کہ تو پیغمبر نہیں ہے۔

ان کے جواب میں کہو: یہی کافی ہے کہ دو ہستیاں میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہیں ایک اللہ اور دوسرا وہ کہ جس کے پاس کتاب کا علم اور قرآن کی آگہی موجود ہے (قل کفیٰ باللہ شھیدًا بینی و بینکم و من عندہ علم الکتاب)۔

ایک تو خود خدا جانتا ہے کہ میں اس کا بھیجا ہوا ہوں اور دوسرے وہ لوگ کہ جو میری اس آسمانی کتاب یعنی قرآن کے بارے میں کافی آگاہی رکھتے ہیں وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب انسانی دماغ کی ساختہ نہیں ہے اور ممکن نہیں ہے کہ خدائے بزرگ کے سوا کسی اور کی ہو، یہ بھی مختلف پہلوؤں سے قرآن کے اعجاز ہونے کے بارے میں ایک تاکید ہے۔ اس کی تفصیل ہم دیگر مقامات پر خصوصاً کتاب "قرآن و آخرین

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۰۱۔

Marfat.com

پیامبر۔ میں بیان کر چکے ہیں۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کی بناء پر "من عندہ علم الکتاب" سے مراد مضامین قرآن مجید سے آگاہ افراد ہیں۔

لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ اہل کتاب کے علماء کی طرف اشارہ ہے۔

بہت سی روایات میں آیا ہے کہ "من عندہ علم الکتاب" سے مراد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اور دیگر آئمہ ہدیٰ علیہم السلام ہیں۔ اس سلسلے کی روایات تفسیر نور الثقلین اور تفسیر برہان میں جمع کر دی گئی ہیں۔

لیکن یہ روایات اس بات کی دلیل نہیں کہ مفہوم آیت اسی پر منحصر ہے۔ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ ایک مصداق یا مصادیق تام وکامل کی طرف اشارہ ہیں۔ بہرحال یہ روایات پہلی تفسیر کہ جسے ہم نے انتخاب کیا ہے کی تائید کرتی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم اپنی گفتگو پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک روایت پر ختم کریں۔

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر گرامی سے "قال الذی عندہ علم من الکتاب" (اس شخص نے کہا کہ جس کے پاس کتاب میں سے علم تھا)[1] کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

ذاك وصی اخی سلیمان بن داؤد

وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کا وصی اور جانشین تھا۔

ابو سعید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، "قل کفی باللہ شھیدا بینی و بینکم ومن عندہ علم الکتاب" کس کے بارے میں ہے اور کس کی طرف اشارہ ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا:

ذاك اخی علی بن ابی طالب

وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں[2]

پروردگارا! اپنی رحمت کے دروازے ہم پر کھول دے اور اپنی کتاب کا علم ہم پر ارزانی فرما۔

بار الہا! قرآن کی آگہی سے ہمارے دل اس طرح سے روشن اور ہماری فکر کو ایسا توانا بنا کہ ہم تجھے چھوڑ کر تیرے غیر کی طرف نہ جائیں کسی چیز کو تیری مشیت پر مقدم نہ کریں، خود غرضیوں، تنگ نظریوں اور خود بینیوں کے تنگ و تاریک گڑھوں میں نہ گریں، تیرے بندوں کے درمیان تفرقہ نہ ڈالیں، اپنے اسلامی انقلاب کو خطرے کی طرف کھینچ نہ لے جائیں اور اسلام، قرآن اور ملت اسلامی کی مصلحتوں کو ہر چیز پر مقدم رکھیں۔

خداوندا! عراق کے ظالم حکام کو خواب غفلت سے بیدار کر کہ جنہوں نے یہ خانماں سوز، ویران گر اور تباہ کن جنگ دشمنان اسلام کی تحریک ہم پر مسلط کی ہے اور اگر وہ بیدار ہونے والے نہیں تو انہیں نابود فرما اور ہمیں اپنی کتاب کے زیر سایہ آگاہی عطا فرما کہ جس سے

---

[1] یہ آیت حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں ہے۔

[2] المیزان جلد ۱۱ صفحہ ۴۲۷۔

Marfat.com

ہم حق و عدالت کے دشمنوں پر کامیابی کے لیے تمام جائز اور ممکنہ وسائل سے استفادہ کریں ۔۔۔

آمین یا رب العالمین

سورہ رعد کی تفسیر اختتام پذیر ہوتی ہے

Marfat.com

سورۃ ابراھیم

مکی

۵۲ آیات ہیں
یہ مکہ میں نازل ہوئی
(البتہ بہت سے مفسرین کے بقول آیات ۲۸ اور ۲۹
مدنی ہیں جو جنگ بدر میں مارے جانے والے مشرکین کے
بارے میں نازل ہوئی ہیں)

Marfat.com

اس سورہ کے مضامین

جیسا کہ اس سورہ کے نام سے ظاہر ہے اس کا ایک حصہ توحید کے بت شکن ہیرو ابراہیمؑ کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ اس میں ان کی دعائیں شامل ہیں۔

اس کے دوسرے حصے میں گزشتہ انبیاء مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ قوم عاد و ثمود کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں پوشیدہ عبرت آموز درسوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر یہ درس اس سورہ میں وعظ و نصیحت اور بشارت و انذار کے مباحث کی تکمیل کرتے ہیں۔

زیادہ تر مکی سورتوں کی طرح اس کا ایک اہم حصہ مبداء و معاد کے بارے میں بحث کرتا ہے کیونکہ مبداء و معاد پر ایمان راسخ ہو جائے تو انسان کی روح میں ایک روشنی پیدا ہوتی ہے جس کا اثر اس کی گفتار اور کردار پر ہوتا ہے اور انسان راہِ حق اور صراطِ الٰہی پر گامزن ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ـــــ یہ سورت اعتقادات، پند و نصائح اور گزشتہ اقوام کی عبرت انگیز سرگزشتوں کا مجموعہ ہے اور اس میں انبیاء کی رسالت اور آسمانی کتب کے نزول کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من قرء سورة ابراهيم و الحجر اعطى من الاجر عشر حسنات بعدد من عبد الاصنام و بعدد من لم يعبدها

جو شخص سورہ ابراہیم اور سورہ حجر پڑھے گا خدا تعالیٰ اسے ان کی تعداد کے برابر کہ جو بتوں کی پوجا کرتے تھے اور جو پوجا نہیں کرتے تھے، دس حسنات دے گا [1]

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن کی سورتیں پڑھنے کے سلسلے میں جس اجر و ثواب کا ذکر ہے وہ اُس تلاوت کے لیے ہے جو غور و فکر سوچ بچار اور پھر عمل کے ساتھ ہو اور چونکہ اس سورہ میں نیز سورہ حجر میں توحید و شرک اور اس کی فروعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے تو مسلمان ان کے مضامین کی طرف توجہ اور عمل سے ایسی فضیلت بھی حاصل ہو گی یعنی یہ توجہ اور عمل انسان کو اپنے رنگ میں رنگ لے گا اور اسے ایسے مقام کا اہل بنا دے گا

⁂

---

[1] مجمع البیان و نور الثقلین، اس سورہ کی تفسیر کے آغاز میں۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱۔ الٓرٰ قف كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ
بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ○
۲۔ اللّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَوَيۡلٌ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ
مِنۡ عَذَابٍ شَدِيۡدِ ۙ○
۳۔ الَّذِيۡنَ يَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا عَلَى الۡاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ
سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِىۡ ضَلٰلٍۢ بَعِيۡدٍ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ الر ۔ یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر نازل کی تاکہ تو پروردگار کے فرمان سے لوگوں کو (شرک، ظلم اور طغیان کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان، عدل اور صلح) کی روشنی کی طرف لے جائے، عزیز و حمید خدا کی راہ کی طرف ۔

۲۔ وہی خدا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اسی کا ہے۔ کافروں کے لیے افسوس ناک ہے عذابِ شدید۔

۳۔ وہی کہ جو دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ راہِ حق کو ٹیڑھا کر دیں اور دور کی گمراہی میں ہیں ۔

Marfat.com

تفسیر

ظلمتوں سے نور کی طرف

یہ سورہ بھی قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی طرح حروف مقطعہ (الٓر) سے شروع ہوئی ہے۔ ان حروف کی تفسیر ہم سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتداء میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں جس نکتے کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ ۲۹ مقامات پر قرآن کی سورتوں کا آغاز حروف مقطعہ سے ہوا ہے۔ ان میں سے ۲۴ مقامات ایسے ہیں جن میں بلا فاصلہ قرآن مجید کے بارے میں گفتگو آئی ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن اور حروف مقطعہ کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے اور ہو سکتا ہے یہ وہی تعلق ہو جس کا ذکر ہم سورہ بقرہ کی ابتداء میں کر چکے۔ وہ یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ اس سے واضح کرے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب اپنے باعظمت معانی و مفاہیم کہ جن کی بناء پر وہ تمام انسانوں کی ہدایت اپنے ذمہ لیے ہوئے ہے کے باوجود اسی سادہ سے خام مال (الف، باء) سے تشکیل پائی ہے اور یہ اس اعجاز کی اہمیت کی نشانی ہے کہ وہ سادہ ترین چیز سے افضل ترین چیز کو وجود بخشتا ہے۔

بہر حال الف، لام، را ــــ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ وہ کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر اس لیے نازل کی کہ تو لوگوں کو گمراہیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے (کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور)۔

درحقیقت نزولِ قرآن کے تمام تربیتی، انسانی، روحانی اور مادی مقاصد اسی ایک جملے میں جمع ہیں "ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے جانا" ظلمِ جہالت سے نورِ علم کی طرف، ظلمتِ کفر سے نورِ ایمان کی طرف، ظلمتِ ظلم سے نورِ عدالت کی، ظلمت فساد سے نورِ صلاح کی طرف ظلمتِ گناہ سے نورِ تقویٰ کی طرف اور ظلمتِ افتراق سے نورِ وحدت کی طرف۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ یہاں "ظلمات" بعض دیگر قرآنی سورتوں کی طرح جمع کی شکل میں آیا ہے اور "نور" واحد کی صورت میں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمام نیکیاں، پاکیزگیاں، ایمان و تقویٰ اور فضیلت نورِ توحید کے سائے میں اپنے آپ میں وحدت و یگانگی کی حالت میں ہیں اور سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور متحد ہیں اور ان سے ایک متحد و واحد معاشرہ جو ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ کپڑے کی مانند ہو تیار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ظلمت ہر مقام پر پراگندگی اور صفوں میں تفرقہ کا سبب ہے۔ ستم گر، بدکار، آلودہ گناہ اور منحرف لوگ عموماً اپنی انحرافی راہوں میں بھی وحدت نہیں رکھتے اور آپس میں حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں۔

تمام نیکیوں کا سرچشمہ چونکہ خدا کی ذاتِ پاک ہے اور ادراکِ توحید کی بنیادی شرط اسی حقیقت کی طرف توجہ ہے لہٰذا بلا فاصلہ مزید فرمایا گیا ہے: یہ سب کچھ ان (لوگوں) کے پروردگار کے اذن و حکم سے ہے (باذن ربھم) اس نور کے بارے میں مزید توضیح کے لیے فرمایا گیا ہے: عزیز و حمید خدا کی راہ کی طرف (الی صراط العزیز الحمید)[1] وہ خدا کہ جس کی عزت اس کی قدرت کی دلیل ہے کیونکہ کی

---

[1] الی صراط ..... درحقیقت "الی النور" کا بدل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نور کی طرف ہدایت سے مراد "عزیز و حمید" کی راہ کی طرف ہدایت ہے ضمناً "کتاب انزلناہ" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور اصل میں "ھٰذا کتاب انزلناہ" تھا۔

Marfat.com

کے بس میں نہیں کہ اس پر غلبہ حاصل کر سکے اور اس کا حمید ہونا اس کی بے پایاں نعمات کی نشانی ہے کیونکہ حمد و ستائش ہمیشہ نعمتوں، عنایتوں اور زیبائیوں پر ہوتی ہے۔

اگلی آیت میں معرفت خدا کے لیے ایک درس توحید دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وہی خدا کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اسی کا ہے (اللہ الذی لہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض)[1]

تمام چیزیں اس کی ہیں کیونکہ وہی موجودات کا خالق ہے۔ اسی بناء پر وہ قادر و عزیز بھی ہے، تمام نعمتیں بخشنے والا اور حمید بھی۔

ذکر مبداء کے بعد آیت کے آخر میں مسئلہ معاد کی جانب توجہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وائے ہو کفار پر قیامت کے شدید عذاب سے (وویل للکافرین من عذاب شدید)۔

اگلی آیت میں بلا فاصلہ کفار کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ان کی صفات کے تین حصوں کا ذکر کر کے ان کی کیفیت کو پوری طرح مشخص کر دیا گیا ہے اس طرح سے کہ ہر شخص ان کا سامنا کرتے ہی انہیں پہچان لے فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اس جہان کی پست زندگی کو آخرت کی زندگی پر مقدم شمار کرتے ہیں (الذین یستحبون الحیٰوۃ الدنیا علی الاٰخرۃ)[2] اسی وجہ سے وہ ایمان، حق، عدالت، شرف آزادگی اور سربلندی کہ جو آخرت سے لگاؤ رکھنے والوں کی خصوصیات میں سے ہیں اپنے گھٹیا مفادات، شہوات اور ہوا و ہوس پر قربان کر دیتے ہیں

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ایسے لوگ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ خود گمراہی میں پڑنے کے بعد دوسروں کو بھی بھٹکانے کی کوشش کرتے ہیں اور "وہ لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں" (ویصدون عن سبیل اللہ)۔

درحقیقت وہ اللہ کی راہ کہ جو راہ فطرت ہے اور انسان خود سے چل کر اسے عبور کر سکتا ہے اس میں طرح طرح کی دیواریں اٹھاتے ہیں اور رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ اپنی ہوا و ہوس اور خواہشات کو بنا سنوار کر پیش کرتے ہیں، لوگوں کو گناہ کا شوق دلاتے ہیں اور راستی و پاکیزگی کے راستے سے خوفزدہ کرتے ہیں۔

ان کا کام فقط اللہ کے راستے میں رکاوٹیں اور دیواریں کھڑی کرنا نہیں بلکہ "کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے اسے بگاڑ کر پیش کریں" (ویبغونھا عوجًا)۔

دراصل وہ پوری توانائیوں سے کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ لیں اور اپنا ہم مسلک بنالیں۔ لہٰذا ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اللہ کے سیدھے راستے کو ٹیڑھا کر کے دکھائیں۔ اسی لیے وہ اس میں طرح طرح کی خرافات اور بے ہودگیاں پیدا کرتے ہیں، مختلف تحریفات سے کام لیتے ہیں۔ قبیح بدعتوں کو رواج دیتے ہیں اور کثیف طور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ واضح ہے کہ "ان صفات و اعمال کے حامل ہونے کی وجہ سے ایسے افراد بہت دُور کی گمراہی میں ہیں" (اولٰئک فی ضلٰل بعید)۔ یہ وہی لوگ ہیں کہ راہ حق سے زیادہ دُور ہونے کی بناء پر جن کا راہ حق کی طرف لوٹ آنا آسانی سے ممکن نہیں لیکن یہ سب کچھ خود انہی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

---

[1] زیر کے ساتھ لفظ "اللہ" "عزیز حمید" کا بدل ہے کہ جو گزشتہ آیت میں آیا ہے۔

[2] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "استحب الکفر علی الایمان" کا معنی یہ ہے کہ کفر کو ایمان پر مقدم شمار کریں اور استحباب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی چیز کی محبت میں کوشش کرے اور جب یہ لفظ "علیٰ" کے ساتھ متعدی ہو تو مقدم رکھنے کا معنی دیتا ہے مثلاً: اما ثمود فھدینا ھم فاستحبوا العمیٰ علی الھدیٰ۔

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ ایمان اور راہ خدا کو نور سے تشبیہ دینا: اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "نور" عالم مادہ کا لطیف ترین موجود ہے، اس کی رفتار نہایت تیز ہے اور جہانِ مادہ میں اس کے آثار و برکات ہر چیز سے زیادہ ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام مادی نعمات و برکات کا سرچشمہ نور ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان اور راہ خدا میں قدم رکھنے کو نور سے تشبیہ دینا کس قدر پُر معنی ہے۔

نور اتحاد کا سبب ہے اور ظلمت انتشار کا عامل ہے۔ نور زندگی کی علامت ہے اور ظلمت موت کی نشانی ہے۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں بہت سے قیمتی امور کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ان میں سے ایک عمل صالح ہے۔

یوم تری المؤمنین والمؤمنات یسعٰی نورھم بین ایدیھم و بایمانھم

وہ دن کہ جب تو صاحبِ ایمان مردوں اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور اُن کے سامنے اور دائیں جانب رواں دواں ہو گا۔ (حدید۔ ۱۲)

ایمان و توحید کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ مثلاً:

اللہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور

اللہ ان لوگوں کا ولی و سرپرست ہے جو ایمان لائے ہیں کہ جنہیں وہ ظلمتوں سے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے (بقرہ۔ ۲۵۷)

قرآن کو بھی نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون

اور جو پیغمبر پر ایمان لائے ہیں، اس کی عزت و توقیر کرتے ہیں، اس کی مدد کرتے ہیں اور اُس نور کی پیروی کرتے ہیں کہ جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے، وہ فلاح پانے والے ہیں۔ (اعراف۔ ۱۵۷)

نیز خدا کے آئین و دین کو اس پُر برکت وجود سے تشبیہ دی گئی ہے:

یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم

وہ چاہتے ہیں کہ پھونکوں سے نورِ خدا کو خاموش کر دیں۔ (توبہ۔ ۳۲)

اور سب سے بڑھ کر خدا کی ذات پاک کہ جو افضل ترین اور برترین وجود ہے بلکہ سب کی ہستی جس کے وجودِ مقدس کا پرتو ہے کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اللہ نور السمٰوٰت و الارض

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (نور۔ ۳۵)

یہ تمام امور ایک ہی حقیقت کی طرف پلٹتے ہیں کیونکہ یہ سب اللہ، اس پر ایمان، اس کی گفتگو اور اس کی راہ کے پرتو ہیں۔ للہٰذا یہ

Marfat.com

لفظ ان مواقع پر مفرد کی شکل میں آیا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس "ظلمات" چونکہ ہر جگہ انتشار و تفرقہ کا عامل ہے لہٰذا جمع کی صورت میں تعدد و کثرت کی علامت کے طور پر ذکر ہوا ہے اور خدا پر ایمان لانا، اس کی راہ میں قدم رکھنا چونکہ حرکت اور بیداری کا سبب ہے، اجتماعیت و وحدت کا عامل ہے اور ارتقاء و پیش رفت کا ذریعہ ہے لہٰذا یہ تشبیہ ہر لحاظ سے رسا، بامعنی اور باعث زینت ہے۔

۲۔ "لتخرج" کا مفہوم: پہلی آیت میں "لتخرج" کی تعبیر درحقیقت دو نکات کی طرف اشارہ کرتی ہے:

پہلا یہ کہ قرآن مجید اگرچہ انسان کے لیے ہدایت و نجات کی کتاب ہے تاہم اسے اجراء و نفاذ کرنے والے اور عملی صورت بخشنے والے کی احتیاج ہے لہٰذا پیغمبر جیسے راہبر کی ضرورت ہے جو اس کے ذریعے راہِ حقیقت سے بھٹکے ہوؤں کو بدبختی کی ظلمات سے نورِ سعادت کی طرف ہدایت کرے۔ لہٰذا قرآن بھی اپنی اس قدر عظمت کے باوجود رہبر، راہنما، مُجری اور نافذ کرنے والے کے بغیر تمام مشکلات حل نہیں کرسکتا۔

دوسرا یہ کہ خارج کرنے کی تعبیر درحقیقت تغیر و تبدل کے ساتھ حرکت دینے اور چلانے کی دلیل ہے۔ گویا بے ایمان لوگ ایک تنگ و تاریک فضا میں ہوتے ہیں اور پیغمبر و رہبران کا ہاتھ پکڑ کر انہیں وسیع اور روشن فضا میں لے جاتے ہیں۔

۳۔ سورۃ کے آغاز و اختتام پر ایک نظر: یہ امر جاذبِ توجہ ہے کہ اس سورۃ کا آغاز لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف ہدایت سے ہوا ہے اور اس کا اختتام بھی لوگوں کو ابلاغ و انذار پر ہوا ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ بہرحال اصلی ہدف خود لوگ، ان کی سرنوشت اور ان کی ہدایت ہے اور درحقیقت انبیاء و مرسلین کا بھیجا جانا اور آسمانی کتب کا نزول سب اسی مقصد کو پانے کے لیے ہے۔

Marfat.com

۴۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

۵۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ○

۶۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ○

۷۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ○

ترجمہ

۴۔ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ ان کے سامنے (حقائق) آشکار کرے پھر خدا جسے چاہے (اور مستحق سمجھے) گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے (اور مستحق سمجھے) ہدایت کرتا ہے اور وہ توانا و حکیم ہے۔

۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ بھیجا (اور حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکال

Marfat.com

اور انہیں ایام اللہ یاد دلا اس میں ہر صبر کرنے والے اور شکر گزار کے لیے نشانیاں ہیں ۔

۶۔ وہ وقت یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا : اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد رکھو جب کہ اس نے تمہیں آلِ فرعون (کے چنگل) سے نجات بخشی ۔ وہ کہ جو تمہیں بدترین طریقے سے عذاب دیتے تھے ۔ تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (خدمت گاری کے لیے) زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی ۔

۷۔ (اسی طرح) اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے پروردگار نے اعلان کیا کہ اگر شکر گزاری کرو گے تو تم پر (اپنی نعمت کا) اضافہ کروں گا اور اگر کفران کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے ۔

تفسیر

زندگی کے حساس دن

گزشتہ آیات میں قرآنِ مجید اور اس کے حیات بخش اثرات کے متعلق گفتگو تھی ۔ زیرِ بحث پہلی آیت میں بھی ایک خاص پہلو سے اس موضوع کے بارے میں بات کی گئی ہے اور وہ ہے انبیاء اور آسمانی کتب کی زبان کا اُس پہلی قوم کی زبان سے ہم آہنگ ہونا جس کی طرف وہ مبعوث ہوئے ۔

فرمایا گیا ہے : ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ) ۔

کیونکہ ــــ پہلے پہل تو کسی پیغمبر کا تعلق اسی قوم سے پیدا ہوتا ہے جس میں سے وہ قیام کرتے ہیں ، انبیاء کے ذریعے پہلی وحی کی شعاع اسی پر پڑتی ہے اور ان کے اوّلین اصحاب و انصار اسی میں سے ہوتے ہیں لہٰذا پیغمبر کو انہی کی زبان میں گفتگو کرنا چاہیے " تاکہ وہ ان کے لیے حقائق کو واضح طور پر پیش کر سکے " (لیبین لھم) ۔

اس جملے میں درحقیقت اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ عام طور پر انبیاء کی دعوت ان کے پیروکاروں پر کسی انجانے اور غیر مانوس طریقے سے منعکس نہیں ہوتی تھی بلکہ واضح و روشن طور پر اور عام مروّجہ زبان میں وہ تعلیم و تربیت کرتے تھے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : ان کے سامنے دعوتِ الٰہی کی وضاحت کے بعد " خدا جس شخص کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے " (فیضل اللہ من یشاء و یھدی من یشاء) ۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آخر کار کسی کا ہدایت یافتہ ہونا یا گمراہ ہونا انبیاء کا کام نہیں ان کا کام تو تبلیغ اور تبیین ہے ۔ بندوں کی حقیقی ہدایت و رہنمائی تو خدا ہی کے ہاتھ ہے ۔

Marfat.com

اس بناء پر کہیں یہ تصور نہ ہو کہ اس کا مطلب جبر، لازمی طور پر ہونا اور انسان کی آزادی کا سلب ہونا ہے، بلا فاصلہ مزید ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ عزیز حکیم ہے (وھو العزیز الحکیم)۔

اپنی عزت و قدرت کی وجہ سے وہ ہر چیز پر قادر و توانا ہے اور کوئی شخص اس کے ارادے کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق وہ کسی شخص کو بلاسبب ہدایت نہیں کرتا اور نہ کسی کو بلاوجہ گمراہ کرتا ہے بلکہ بندے اپنے ارادے کی انتہائی آزادی کے ساتھ "سیر الی اللہ" کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے دل پر نور ہدایت اور فیض حق کی کرنیں پڑتی ہیں۔ جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیہ ۶۹ میں ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

جو لوگ ہماری راہ میں جہاد اور جدوجہد کرتے ہیں ہم یقینی طور پر انہیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

اسی طرح جن لوگوں نے تعصب، ہٹ دھرمی، حق دشمنی، شہوات میں غوطہ زنی اور ظلم میں آلودگی کے باعث ہدایت کے لیے اپنی قابلیت گنوادی ہے وہ فیض ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں اور ضلالت و گمراہی کی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:

کذلک یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب

اسی طرح خدا ہر اسراف کرنے والے اور آلودہ شک شخص کو گمراہ کرتا ہے۔ (مومن - ۳۴)

یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وما یضل بہ الا الفاسقین

اس کے ذریعے خدا صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے (بقرہ - ۲۶)

نیز یہ بھی ارشاد ہوتا ہے:

ویضل اللہ الظالمین

خدا ستمگروں کو گمراہ کرتا ہے۔ (ابراہیم - ۲۷)

گویا ہدایت و گمراہی کا سرچشمہ خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔

اگلی آیت میں اپنے ہم عصر طاغوتوں کے مقابلے میں انبیاء کے قیام کا ایک نمونہ ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ظلمتوں سے نکال کر وادئ نور میں لے جانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات (مختلف معجزات) کے ساتھ بھیجا اور ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف ہدایت کرو (ولقد ارسلنا موسیٰ بایاتنا ان اخرج قومک من الظلمات الی النور)[1]

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی پہلی آیت میں پڑھا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروگرام کا خلاصہ بھی لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکال لے جانا تھا۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سب خدا کے انبیاء و رسل ہیں بلکہ سب کے سب انسانوں کے معنوی و روحانی راہنما

---

[1] حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے ظاہر ہونے والے معجزات کی طرف زیر نظر آیت میں لفظ "آیات" کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ کے مطابق وہ نو اہم معجزات تھے جن کی تفصیل اس آیت کے ضمن میں آئے گی (انشاء اللہ)۔

Marfat.com

ہیں۔کیا برائیاں، گمراہیاں، کجرویاں، ظلم وستم، استثمار، ذلتیں، زبوں حالیاں، فتنہ وفساد اور گناہ ظلمت وتاریکی کے علاوہ کچھ اور ہیں اور کیا ایمان وتوحید، تقویٰ وپاکیزگی، آزادی واستقلال اور سربلندی وعزت نور وضیا کے سوا کچھ اور ہے۔ اس بناء پر تمام رہبروں کی دعوت کے درمیان بالکل یہی قدر مشترک اور قدر جامع ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، تیری ذمہ داری ہے کہ تو اپنی قوم کو" ایام اللہ" یاد دلائے (وذکرھم بایام اللہ)۔

مسلّم ہے کہ تمام دن ایام الٰہی ہیں جیسے تمام جگہیں اور مقامات خدا سے تعلق رکھتے ہیں اب اگر کسی خاص مقام کو" بیت اللہ" سے موسوم کیا جائے تو یہ اس کی خصوصیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح مسلّم ہے کہ" ایام اللہ" کا عنوان مخصوص دنوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو بہت زیادہ امتیاز ودرخشندگی رکھتے ہیں۔

اسی بناء پر مفسرین نے اس کی تفسیر میں مختلف احتمالات پیش کیے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ گزشتہ انبیاء اور ان کی سچی اور اچھی امتوں کی کامیابی کے دنوں کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح وہ ایام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں کہ جن میں انہیں ان کی اہلیت کی بناء پر انواع واقسام کی نعمتوں سے نوازا گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ ان دنوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے سرکش قوموں کو عذاب کی زنجیر میں جکڑا اور طاغوت وسرکش افراد کو ایک ہی فرمان سے تباہ وبرباد کر دیا۔

بعض نے ان دونوں حصوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن اصولی طور پر اس گویا، عمدہ اور رسا تعبیر کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تمام دن" ایام اللہ" ہیں کہ جو نوع بشر کی زندگی کی تاریخ میں حامل عظمت ہیں۔ ہر وہ دن کہ جس میں کوئی فرمانِ الٰہی اس طرح سے درخشندہ ہوا کہ باقی امور کو اپنے تحت الشعاع لے آیا وہ ایام اللہ میں سے ہے۔

جس روز انسانوں کی زندگی کا کوئی نیا باب کھلا، انہیں درسِ عبرت دیا گیا، ان میں کسی پیغمبر نے ظہور یا قیام فرمایا یا جس دن کوئی منکر، طاغوت اور فرعون ظلمت کے گڑھے میں پھینکا گیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ دن کہ جس میں حق وعدالت برپا ہوئی اور ظلم وبدعت خاموش ہوئی وہ ایام اللہ میں سے ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کی اس تفسیر کے ذیل میں منقول روایات میں بھی حساس دنوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: اس گفتگو میں اور تمام ایام اللہ میں ہر صابر وباستقامت اور شکر گزار انسان کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیات لکل صبار شکور)۔

"صبار" اور" شکور" دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں ان میں سے ایک صبر واستقامت زیادہ ہونے اور دوسرا نعمت واحسان پر شکر گزاری زیادہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ صاحب ایمان افراد نہ تو سختیوں اور مشکلوں کے دنوں میں حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو حوالۂ حوادث کر دیتے ہیں اور نہ ہی کامیابی اور نعمت کے دنوں میں غرور وغفلت میں گرفتار ہوتے ہیں اور" ایام اللہ" کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ان دونوں کا تذکرہ گویا اسی مقصد کی نشاندہی کر رہا ہے۔

Marfat.com

بعد والی آیت میں تاریخ بنی اسرائیل میں ایام اللہ اور درخشاں و پُربار دنوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کا ذکر نسلوں کے لیے بھی تذکر تھا۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اس نعمتِ خدا کا تذکرہ کرو کہ جب اس نے تمہیں آلِ فرعون سے نجات بخشی (و اذ قال موسٰی لقومہ اذکروا نعمۃ اللّٰہ علیکم اذ انجاکم من اٰل فرعون) وہی فرعونی کہ جنہوں نے تم پر بدترین عذاب مسلط کر رکھا تھا، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو خدمت اور کنیزی کے لیے زندہ رکھتے تھے (یسومونکم سوء العذاب و یذبحون ابناءکم و یستحیون نساءکم) اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بہت بڑی آزمائش تھی (و فی ذٰلکم بلاء من ربکم عظیم)۔

اس دن سے زیادہ بابرکت کونسا دن ہوگا کہ جس دن تمہارے سروں سے خود غرض، سنگدل اور استعمارگر لوگوں کو دُور کیا۔ وہی لوگ کہ جو تمہارے ساتھ ایک بہت بڑا ستم روا رکھے ہوئے تھے۔ اس ظلم سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا کہ وہ تمہارے بیٹوں کے سر جانوروں کی طرح کاٹ دیتے تھے (توجہ رہے کہ قرآن نے ذبح کہا ہے قتل نہیں) اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تمہاری عزت و ناموس بے شرم دشمن کے چنگل میں کنیزوں کی طرح گرفتار تھی۔

نہ صرف بنی اسرائیل کے لیے بلکہ تمام اقوام و ملل کے لیے آزادی و استقلال کے حصول اور طاغوت کی دست برد سے نجات کا دن ایام اللہ میں سے ہے کہ جسے انہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ ایسی یاد کہ جس کے سبب وہ گزشتہ حالت کی طرف لوٹنے سے محفوظ رہیں۔

"یسومونکم" "سوم" (بروزن "صوم") کے مادہ سے ہے۔ دراصل یہ کسی چیز کے پیچھے جانے اور اس کی جستجو کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ کسی پر کسی کام کو زبردستی ٹھونسنے کے معنی میں بھی آیا ہے[1]

لہٰذا "یسومونکم سوء العذاب" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تم پر بدترین سختیاں اور عذاب مسلط کرتے تھے۔ کیا یہ کم مصیبت ہے کہ ایک گروہ کی فعال قوت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے اور اس کی عورتوں کو کسی سرپرست کے بغیر چند ظالموں کے چنگل میں کنیزوں کی طرح باقی رہنے دیا جائے۔

ضمناً "یسومون" کا فعل مضارع کی صورت میں ہونا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کام مدتوں جاری رہا[2]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بیٹوں کے سر کاٹنے اور عورتوں کی کنیزی کے ذکر کے بعد ان کا واؤ کے ذریعے "سوء العذاب" پر عطف کیا گیا ہے حالانکہ یہ خود "سوء العذاب" کا مصداق ہیں۔ ایسا ان دونوں عذابوں کی اہمیت کی بنا پر ہوا ہے۔ نیز یہ نشاندہی کرتا ہے کہ فرعون کی جابر اور ستمگر قوم بنی اسرائیل پر اور مظالم بھی روا رکھتی تھی لیکن ان میں سے یہ دو ظلم بہت شدید اور نہایت سخت تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ بات بھی یاد رکھو کہ تمہارے پروردگار نے اعلان کیا کہ اگر میری نعمتوں کا شکر بجا لاؤ تو یقیناً میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا اور اگر کفران کرو تو میرا عذاب اور سزا شدید ہے (و اذ تاذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم و لئن کفرتم ان عذابی لشدید)۔[3]

---

[1] مفردات راغب، تفسیر المنار (جلد ا ص۳۰۷) اور تفسیر ابوالفتوح رازی جلد، صد کی طرف رجوع کریں۔

[2] توجہ رہے کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس آیت کی نظیر سورہ بقرہ کی آیت ۴۹ میں بھی ہے۔

[3] "تاذن" باب تفعل سے ہے اور تاکید سے اعلان کرنے کے معنی میں ہے کیونکہ اس سے افعال کا مادہ "ایذان" اعلان کے معنی میں ہے اور جب تفعل کے معنی میں آئے تو اس سے اضافہ اور تاکید کا استفادہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

ہوسکتا ہے یہ آیت بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا تسلسل ہو۔ آپؑ نے انہیں اس نجات، کامیابی اور نعمات فراواں پر شکرگزاری کی دعوت دی اور ان سے نعمت میں اضافے کا وعدہ کیا اور کفران کی صورت میں عذاب کی تہدید کی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایک مستقل جملہ ہو اور مسلمانوں سے خطاب ہو لیکن بہرحال نتیجے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اگر بنی اسرائیل کو خطاب ہو پھر بھی قرآن مجید میں ہمارے لیے ایک اصلاحی درس کے طور پر آیا ہے۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ شکر کے بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے: "لازید نکم" (یقیناً میں اپنی نعمت تم پر زیادہ کردوں گا)۔ جب کہ کفرانِ نعمت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ تمہیں عذاب کروں گا بلکہ ارشاد ہوتا ہے "میرا عذاب شدید ہے"۔ تعبیر کا یہ فرق پروردگار کا انتہائی لطف و کرم ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **ایام اللہ کی یاد آوری:** جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ "اللہ" کی طرف "ایام" کی اضافت انسانوں کی زندگی کے اہم اور تقدیر ساز دنوں کی طرف اشارہ ہے اور ان دنوں کی عظمت کی بناء پر انہیں خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ نیز اس بناء پر کہ اگر ایک عظیم نعمتِ الٰہی کسی لائق قوم کے شاملِ حال ہو۔ یا عظیم عذابِ الٰہی کسی سرکش و طغیان گر قوم کو دامن گیر ہو تو دونوں صورتوں میں تذکرہ یاد آوری کے لائق ہے۔

آئمہ معصومین علیہم السلام سے منقول روایات میں "ایام اللہ" کی تفسیر مختلف دنوں سے کی گئی ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

ایام اللہ، یوم یقوم القائم (ع) ویوم الکرۃ و یوم القیامۃ

ایام اللہ مہدی موعودؑ کے قیام کا دن، روزِ رجعت اور قیامت ہیں[۱]

تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے:

"ایام اللہ تین دن ہیں قیام مہدیؑ کا دن، موت کا دن اور قیامت کا دن[۲]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

ایام اللہ نعمائہ و بلائہ و بلائہ سبحانہ

ایام اللہ اس کی نعمتوں اور اس کی طرف سے مصائب کے ذریعے آزمائشوں کے دن ہیں[۳]

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے اس قسم کی احادیث کبھی بھی اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ مفہوم انہی میں منحصر ہے بلکہ ان میں بعض مصادیق کے بعض حصوں کا بیان ہے۔

بہرحال عظیم دنوں کی یاد آوری (چاہے وہ کامیابی کے دن ہوں یا سختی کے) ملتوں کی بیداری اور ہوشیاری میں بہت مؤثر ہوتی ہے۔

---

[۱]، [۲] و [۳] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۲۶۔

Marfat.com

اسی آسمانی پیام سے ہدایت لیتے ہوئے ہم تاریخِ اسلام کے عظیم دنوں کی یاد کو زندہ و جاوداں رکھتے ہیں اور ان یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ہر سال ہم نے کچھ دنوں کو مخصوص کیا ہوا ہے۔ ان دنوں میں ہم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس سے ہم درس لیتے ہیں، ایسے درس کہ جو ہمارے آج کے لیے بہت زیادہ مؤثر ہیں۔

نیز ہماری موجودہ تاریخ میں خصوصاً انقلاب اسلامی ایران کی پُرشکوہ تاریخ میں بہت سے دن ایسے ہیں جو "ایام اللہ" کے مصداق ہیں۔ ہر سال ہمیں ان کی یاد زندہ رکھنا چاہیے ایسی یاد کہ جس میں شہیدوں، غازیوں، مجاہدوں اور عظیم دلاوروں کی یاد رچی بسی ہو اور پھر ان سے ہدایت لینا چاہیے اور ان کی عظیم میراث کی پاسداری کرنا چاہیے۔

لہٰذا ان عظیم دنوں کا ذکر ہمارے مدارس کی درسی کتب میں ہونا چاہیے اور ان کی یاد ہماری اولاد کی تعلیم و تربیت کا حصہ ہونا چاہیے اور ہمیں آئندہ نسلوں کے بارے میں "ذکرھم" (انہیں یاد دلاؤ) کی ذمہ داری پوری کرنا چاہیے۔

قرآن مجید میں بھی بارہا "ایام اللہ" کی یاد دہانی کروائی گئی ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں بھی اور مسلمانوں کے بارے میں بھی نعمتوں اور سختیوں کے دنوں کو یاد رکھا گیا ہے۔

۲۔ جابروں کے طور طریقے: ہم نے بار ہا قرآنی آیات میں پڑھا ہے کہ فرعونی بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ یہ کام صرف فرعون اور فرعونی نہیں کرتے تھے بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر استعمارگر کا یہی شیوہ اور طریقہ تھا کہ وہ فعال، جنگجو اور پرعزم قوتوں کا ایک حصہ نابود کر دیتے اور دوسرے کو کمزور کر کے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے استعماری اور استثماری کام جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

لیکن اہم بات یہ کہ ہم سمجھیں کہ ایسی قوتیں کبھی تو فرعونیوں کی طرح لڑکوں کو نابود ہی کر دیتی ہیں اور کبھی منشیات، شراب اور بدکاری جیسی بری عادتوں میں غرق کر کے فعال قوتوں کو ناکارہ بنا دیتی ہیں اور انہیں زندہ نامردہ بنا دیتی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے کہ جس پر مسلمانوں کو گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اگر ان کی نسلِ نو ایسے کاموں میں پڑ گئی اور اپنی ایمانی و جسمانی قوت گنوا بیٹھی تو پھر انہیں جان لینا چاہیے کہ ان کے لیے غلامی یقینی ہے۔

۳۔ سب سے بڑی نعمت آزادی ہے: یہ امر جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں "ایام اللہ" کے ذکر کے بعد صرف ایک دن کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ دن کہ جو فرعونیوں کے چنگل سے بنی اسرائیل کی نجات کا دن ہے (اذ انجٰکم من اٰل فرعون) حالانکہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اور بھی بہت سے عظیم دن تھے کہ جن میں حضرت موسیٰؑ کی ہدایت کے زیرِ سایہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عظیم نعمتیں بخشی تھیں لیکن زیرِ بحث آیات میں "یوم نجات" کا ذکر قوموں کی سرنوشت میں آزادی اور استقلال کی انتہائی اہمیت کی دلیل ہے۔

جی ہاں! جب تک کوئی قوم وابستگی سے نجات حاصل نہ کرے، غلامی اور استعمار کے چنگل سے آزاد نہ ہو اس کی صلاحیتیں استعداد اور کمال ظاہر نہیں ہو سکتا اور وہ اللہ کی راہ میں قدم نہیں رکھ سکتی وہ راہ کہ شرک، ظلم اور بیداد کے خلاف قیام کا راستہ ہے۔

اسی بنا پر عظیم الٰہی رہبروں کا پہلا کام یہی تھا کہ وہ قوموں کو فکری، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی غلامی سے آزاد کروائیں اور اس کے بعد کوئی اور کام کریں اور توحید و انسانیت کے پروگراموں کو عملی شکل دیں۔

۴۔ شکرِ نعمت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ: اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتوں پر ہمارے تشکر کا محتاج نہیں

Marfat.com

اور اگر وہ شکرگزاری کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی ہم پر ایک اور نعمت کا موجب ہے اور ایک اعلیٰ درجے کا تربیتی انداز ہے۔

اہم یہ بات ہے کہ ہم دیکھیں کہ شکر کی حقیقت کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کا نعمت کی زیادتی سے کیا تعلق ہے اور کس طرح وہ خود ایک عامل تربیت ہو سکتا ہے۔

شکر کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبانی شکر کیا جائے یا "الحمد للّٰہ" وغیرہ کہا جائے بلکہ شکر کے تین مراحل ہیں:

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ نعمت عطا کرنے والا کون ہے۔ یہ توجہ، ایمان اور آگاہی شکر کا پہلا ستون ہے۔

دوسرا مرحلہ اس سے آگے زبان کا مرحلہ ہے۔ لیکن

تیسرا مرحلہ اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ عمل کا مرحلہ ہے یعنی عملی شکر یہ ہے کہ ہم پوری طرح سے غور کریں کہ ہر نعمت ہمیں کس مقصد کے لیے دی گئی ہے اور اسے ہم اس کے اپنے مقام پر صرف کریں اور اگر ایسا نہ کیا تو پھر ہم نے کفرانِ نعمت کیا۔ جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے:

الشکر صرف العبد جمیع ما انعمہ اللّٰہ تعالیٰ فیما خلق لاجلہ

شکر یہ ہے کہ بندہ ہر نعمت کو اس کے مصرف ہی میں صرف کرے۔

واقعاً خدا نے ہمیں آنکھیں کیوں دی ہیں، اس نے ہمیں دیکھنے اور سننے کی نعمت کیوں بخشی ہے۔ کیا اس کے علاوہ کوئی مقصد تھا کہ ہم جہان میں اس کی عظمت کو دیکھیں، راہِ حیات کو پہچانیں اور ان وسائل کے ذریعے تکامل و ارتقاء کی طرف قدم بڑھائیں، ادراکِ حق کریں، حمایتِ حق کریں، اس کا دفاع کریں اور باطل کے خلاف جنگ کریں۔ اگر خدا کی ان عظیم نعمتوں کو ہم نے ان کے راستے میں صرف کیا تو ان کا عملی شکر ہے اور اگر یہ نعمتیں طغیان، خود پرستی، غرور، غفلت اور خدا سے دوری کا ذریعہ بن گئیں تو یہ عین کفران ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ادنی الشکر رؤیۃ النعمۃ من اللّٰہ من غیر علۃ یتعلق القلب بھا دون اللّٰہ، والرضا بما اعطاہ، و ان لا تعصیہ بنعمۃ وتخالفہ بشیٔ من امرہ ونھیہ بسبب من نعمتہ

کمترین شکر یہ ہے کہ تو نعمت کو خدا کی طرف سے سمجھے بغیر اس کے کہ تیرا دل اس نعمت میں مشغول رہے اور تو خدا کو بھول جائے اور (شکر) اس کی عطا پر راضی ہونا ہے اور یہ کہ تو اس کی نعمت کو اس کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنائے اور اس کی نعمتوں سے استفادہ کرنے کے باوجود تو اس کے اوامر و نواہی کو روند نہ ڈالے[1]

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ طاقت، علم، قوتِ فکر و نظر، معاشرتی حیثیت، مال و ثروت اور تندرستی و سلامتی میں سے ہر ایک کے شکر کا راستہ کیا ہے اور کفران کی راہ کونسی ہے۔

تفسیر نور الثقلین میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث بھی اس تفسیر کے لیے ایک واضح دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:

شکر النعمۃ اجتناب المحارم

شکرانِ نعمت گناہوں سے بچنے کا نام ہے[2]

---

[1] سفینۃ البحار جلد ا صفحہ ۱۰۱۔

[2] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۲۹۔

Marfat.com

یہیں سے شکر اور نعمت میں اضافے کے درمیان تعلق واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب بھی انسانوں نے نعماتِ الٰہی کو بالکل مقاصدِ نعمت کے تحت صرف کیا تو انہوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ وہ اہل ہیں اور یہ اہلیت زیادہ وسیع زیادہ فیض اور فزوں تر نعمت کا سبب بنی۔

اصولی طور پر شکر دو طرح کا ہے:

۱۔ شکرِ تکوینی اور

۲۔ شکرِ تشریعی

شکرِ تکوینی یہ ہے کہ ایک موجود خود کو حاصل نعمات کو اپنے رشد و نمو کے لیے استعمال کرے۔ مثلاً باغباں دیکھتا ہے کہ باغ کے فلاں حصے میں درخت خوب پھل پھول رہے ہیں اور ان کی جتنی زیادہ خدمت کی جائے اتنے ہی زیادہ شگوفے پھوٹتے ہیں۔ یہی امر سبب بنتا ہے کہ باغبان باغ کے درختوں کے اس حصے کی خدمت پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور اپنے کارکنوں کو ان کی نگہبانی کی نصیحت کرتا ہے کیونکہ درخت زبانِ حال سے پکار رہے ہوتے ہیں کہ اے باغبان! ہم اس بات کے اہل ہیں کہ تو اپنی نعمت و احسان ہم پر زیادہ کرے۔

وہ بھی اس پکار کا مثبت جواب دیتا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر ؎

سزا خود ہمین است مر بی بری را

بے ثمر درختوں کی لکڑیاں جلیں کیونکہ بے ثمری کی یہی سزا ہے۔

جہانِ بشری کی بھی یہی حالت ہے۔ فرق یہ ہے کہ درخت میں خود اختیاری نہیں ہے اور وہ فقط تکوینی قوانین کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں لیکن انسان اپنے ارادہ و اختیار کی طاقت سے اور تشریعی تعلیم و تربیت سے استفادہ کرتے ہوئے اس راہ پر آگاہی سے قدم رکھ سکتے ہیں۔

لہٰذا وہ شخص کہ جو طاقت کی نعمت کو ظلم و سرکشی کا وسیلہ بناتا ہے گویا زبانِ حال سے پکار رہا ہوتا ہے کہ خداوندا! میں اس نعمت کے لائق نہیں اور جو شخص اپنی صلاحیت کو حق و عدالت کی راہ میں کام میں لاتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ پروردگارا: میں اس لائق ہوں، لہٰذا اضافہ فرما۔

یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے کہ جس وقت ہم شکرِ الٰہی بجا لاتے ہیں، چاہے وہ فکر و نظر سے ہو، چاہے زبان سے اور چاہے عمل سے شکر کی یہ توانائی خود ہر مرحلے میں ایک نئی نعمت ہے اور اس طرح سے شکر کرنا ہمیں اس کی نئی نعمتوں کا مرہونِ منت قرار دیتا ہے اور یوں یہ ہرگز ہمارے بس میں نہیں کہ اس کے شکر کا حق ادا کر سکیں۔ جیسا کہ امام سجاد علیہ السلام کی پندرہ مناجاتوں میں سے مناجاتِ شاکرین میں ہے:

کیف لی بتحصیل الشکر و شکری ایاك یفتقر الی شکر، فکلما قلت لكَ الحمد وجب علی لذلك ان اقول لك الحمد

میں تیرے شکر کا حق کیسے ادا کر سکتا ہوں جب کہ میرا یہ شکر ایک اور شکر کا محتاج ہے اور جب میں "لك الحمد" کہتا ہوں تو مجھ پر لازم ہے کہ اس شکرگزاری کی توفیق پر کہوں: "لك الحمد"

لہٰذا انسان کے لیے مرحلہ شکر کا افضل ترین مقام یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی نعمتوں پر شکر سے عاجزی کا اظہار کرے جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

Marfat.com

فیما اوحی اللہ عزوجل الی موسٰی اشکرنی حق شکری فقال یارب و کیف اشکرك حق شکرك و لیس من شکر اشکرك بہ الا و انت انعمت بہ علی قال یا موسٰی الان شکرتنی حین علمت ان ذلك منی

خدا نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرا حقِ شکر ادا کرو تو انہوں نے عرض کیا: پروردگارا! میں تیرا حقِ شکر کس طرح ادا کروں جب کہ میں جب بھی تیرا شکر بجالاؤں تو یہ توفیق بھی خود میرے لیے ایک نعمت ہوگی۔

اللہ نے فرمایا: اب تو نے میرا حقِ شکر ادا کیا جب کہ تو نے جانا کہ حتیٰ یہ توفیق بھی میری طرف سے ہے [1]

بندہ ہمان بہ کہ ز تقصیر خویش
عذر بہ درگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش
کس نتواند کہ بجا آورد

اچھا بندہ وہی ہے کہ جو اپنی کوتاہیوں کا عذر بارگاہِ الٰہی میں پیش کردے ورنہ اس کی خداوندی کا حق کوئی بجا نہیں لاسکتا۔

شکرِ نعمت کے بارے میں چند اہم نکات

۱۔ حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں اپنے حکمت آمیز کلمات میں فرماتے ہیں:

اذا وصلت الیکم اطراف النعم فلا تنفروا اقصاھا بقلۃ الشکر

جس وقت نعماتِ الٰہی کا پہلا حصہ تم تک پہنچ جائے تو کوشش کرو کہ شکر کے ذریعے باقی حصّے کو بھی اپنی طرف جذب کرو نہ یہ کہ شکر گزاری میں کمی کرکے اسے اپنے آپ سے دُور بھگادو [2]

۲۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے نعمتوں پر صرف خدا کی سپاس گزاری اور تشکر کافی نہیں بلکہ ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ جو اس نعمت کا ذریعہ بنے ہیں اور ان کی زحمات و مشقات کا حق بھی اس طریقے سے ادا کرنا چاہیے اور اس طرح انہیں اس راہ میں مزید خدمات کی تشویق دلانا چاہیے۔ ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جب روزِ قیامت ہوگا تو خدا اپنے بعض بندوں سے فرمائے گا: کیا تم نے فلاں شخص کا شکریہ ادا کیا ہے۔

تو وہ عرض کرے گا: پروردگارا! میں نے تیرا شکر ادا کیا ہے۔

اللہ فرمائے گا: چونکہ تو اس کا شکر بجا نہیں لایا تو گویا تو نے میرا شکر بھی ادا نہیں کیا۔

پھر امامؑ نے فرمایا:

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۹۸ (باب الشکر)۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار شمارہ ۱۳۔

Marfat.com

اشکرکم اللہ اشکرکم للناس

تم میں سے خدا کا زیادہ شکر کرنے والے وہ ہیں جو لوگوں کا زیادہ شکریہ ادا کرتے ہیں[1]

۳ ۔ خدا کی نعمتوں کی افزائش کا جس کا شکرگزاروں سے وعدہ کیا گیا ہے صرف اس لیے نہیں ہے کہ انہیں نئی مادی نعمتیں بخشی جائیں بلکہ خود شکرگزاری کہ جو خدا کی طرف خاص توجہ اور اس کی ساحتِ مقدس سے نئے عشق کے ساتھ ہو ایک عظیم روحانی نعمت ہے کہ جو انسانی نفوس کی تربیت اور انہیں فرامینِ الٰہی کی اطاعت کی طرف رغبت دلانے کے لیے بہت موثر ہے۔ بلکہ شکر ذاتی طور پر زیادہ سے زیادہ معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی بناء پر علماء عقائد علم کلام میں "وجوب معرفت الٰہی" کو ثابت کرنے کے لیے "وجوب شکرِ منعم" کی دلیل پیش کرتے ہیں۔

۴ ۔ معاشرے میں تحریک پیدا کرنے اور پیش رفت کے لیے روحِ شکرگزاری کا احیاء بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنے علم و دانش سے یا فداکاری اور شہادت سے یا کسی دوسرے طریقے سے اجتماعی اہداف کی پیش رفت کے لیے خدمت کی، ان کی قدردانی اور ان کا تشکر معاشرے کو آگے بڑھانے کا بہت اہم عامل ہے۔ جس معاشرے میں تشکر اور قدردانی کی روح مردہ ہو اس میں خدمت کے لیے لگاؤ اور گرمجوشی بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرے میں لوگوں کی زحمتوں اور خدمتوں کی زیادہ قدردانی کی جاتی ہو وہاں نشاط و مسرت زیادہ محسوس کی جا سکتی ہے اور ایسی قومیں زیادہ ترقی کرتی ہیں۔

اسی حقیقت کی طرف توجہ کے سبب ہمارے ہاں گزشتہ بزرگوں کی زحمتوں کی قدردانی کے اظہار کے لیے ان کے سوسالہ، ہزار سالہ روز ولادت وغیرہ کے موقع پر اور دیگر مناسب مواقع پر پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں اور ان کی خدمات کے تشکر اور سپاس گزاری سے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مثلاً ہمارے ملک میں برپا ہونے والے اسلامی انقلاب کہ جو اڑھائی ہزار سالہ تاریک دور کا اختتام ہے اور ایک دورِ نو کا آغاز ہے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال اور ہر ماہ بلکہ ہر روز شہدائے انقلاب کی یاد تازہ کی جاتی ہے، انہیں ہدیۂ عقیدت و سلام پیش کیا جاتا ہے ان تمام لوگوں کا احترام کیا جاتا ہے جو ان کی طرف منسوب ہے اور ان کی خدمات کو سراہا جاتا ہے تو یہ امر سبب بنتا ہے کہ دوسروں میں فداکاری اور قربانی کا عشق پیدا ہو اور لوگوں میں فداکاری کی سطح بلندتر ہو اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس نعمت کا تشکر اس میں اضافے کا باعث ہو اور ایک شہید کے خون سے ہزاروں شہداء پیدا ہوں اور "لازیدنکم" کا زندہ مصداق بن جائیں۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۸۱ حدیث ۳۰ ۔

Marfat.com

۸۔ وَقَالَ مُوسَىٰ إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ
لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ○

۹۔ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۛ
وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم
بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا
كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَا
إِلَيْهِ مُرِيبٍ ○

۱۰۔ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ
يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ
مُّسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيدُونَ أَن
تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ○

ترجمہ

۸۔ موسیٰ نے (بنی اسرائیل سے) کہا: اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ کافر ہو جائیں تو (خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ) خدا بے نیاز اور لائقِ ستائش ہے۔

۹۔ کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی کہ جو تم سے پہلے تھے۔ قوم نوح، عاد، ثمود اور وہ جو ان کے بعد تھے وہی کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے۔ ان کے پیغمبران کے پاس واضح دلائل لے کر آئے لیکن انہوں نے (تعجب اور استہزاء سے) اپنے منہ پر ہاتھ رکھا کہ ہم اس چیز کے کافر ہیں جس کے لیے تم مامور ہو اور جس

Marfat.com

کی طرف تم بلاتے ہو اس کے بارے میں ہمیں شک ہے۔

۱۰۔ ان کے رسولوں نے کہا: کیا اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، وہ کہ جو تمہیں دعوت دیتا ہے تا کہ تمہارے گناہ بخش دے اور تمہیں مقرر وعدہ گاہ تک باقی رکھے۔ انہوں نے کہا: (ہم یہ باتیں نہیں سمجھتے ہم تو اتنی بات جانتے ہیں کہ) تم تو ہمارے جیسے انسان ہو اور تم چاہتے ہو کہ ہمارے آباؤ اجداد جن کی پوجا کرتے تھے اس سے باز رکھو تم ہمارے لیے کوئی واضح دلیل لاؤ۔

تفسیر

کیا خدا کے بارے میں شک ہے؟

زیر نظر پہلی آیت شکر گزاری اور کفران نعمت کی بحث کی تائید و تکمیل ہے اور یہ آیت حضرت موسیٰ بن عمران کی زبانی گفتگو کے ضمن میں نقل ہوئی۔ فرمایا گیا ہے: موسیٰ نے بنی اسرائیل کو یاد دہانی کروائی کہ اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ کافر ہو جائیں (اور خدا کی نعمت کا کفران کریں) تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ بے نیاز اور لائق ستائش ہے (و قال موسٰی ان تکفروا انتم و من فی الارض جمیعًا فان اللہ لغنی حمید)[1]۔

درحقیقت شکر نعمت اور خدا پر ایمان تمہارے لیے نعمت میں اضافے، تمہارے تکامل و ارتقاء اور تمہاری عزت و افتخار کا سبب ہے۔ ورنہ خدا تو ایسا بے نیاز ہے کہ اگر پوری کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامنِ کبریائی پر کوئی گرد نہیں پڑ سکتی کیونکہ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ یہاں تک کہ وہ تشکر و ستائش کا محتاج بھی نہیں کیونکہ وہ ذاتی طور پر لائق حمد ہے (حمید)۔

اگر اس کی ذاتِ پاک میں نیاز و احتیاج ہوتی تو وہ واجب الوجوب نہ ہوتا۔ لہٰذا اس کے غنی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ تمام کمالات اُس میں جمع ہیں اور جو ایسا ہے وہ ذاتی طور پر تعریف کے لائق ہے کیونکہ "حمید" کا معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لائق حمد ہے۔

اس کے بعد چند آیات میں بعض گزشتہ اقوام کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ وہی اقوام کہ جنہوں نے نعماتِ الٰہی پر کفرانِ نعمت کا راستہ اختیار کیا اور ہادیانِ الٰہی کی دعوت پر ان کی مخالفت کی اور کفر کی راہ اپنائی۔ ان آیات میں ان کی منطق اور ان کے انجام کی تشریح کی گئی ہے تا کہ گزشتہ آیت کے مضمون پر تاکید ہو جائے ارشاد ہوتا ہے: کیا تم تک ان لوگوں کی خبر پہنچی ہے کہ جو تم سے پہلے تھے (الم یأتکم نبؤا الذین من قبلکم)۔

ہو سکتا ہے یہ جملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا آخری حصہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کی طرف سے مسلمانوں کو خطاب کی صورت

---

[1] واضح ہے کہ "ان تکفروا" جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور "ان اللہ لغنی حمید" اس پر دلالت کرتا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا: ان تکفروا ---- لا تضروا اللہ شیئا ----

Marfat.com

میں ایک مستقل بیان ہو۔ بہرحال نتیجے کے لحاظ سے دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی قومیں اور وہ کہ جو ان کے بعد تھیں (قوم نوح وعاد و ثمود والذین من بعدھم)۔

وہی کہ جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں پہچانتا اور اس کے علاوہ کوئی ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے (لا یعلمھم الا اللّٰہ[1])

اس میں شک نہیں کہ قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی قوموں کے کچھ حالات ہم تک پہنچے ہیں لیکن مسلّم ہے کہ بیشتر حصہ ہم تک نہیں پہنچا کہ جس سے صرف خدا ہی آگاہ ہے۔ گزشتہ اقوام کی تاریخ میں اس قدر اسرار، خصوصیات اور جزئیات تھیں کہ شاید وہ کچھ کہ جو ہم تک پہنچا ہے اس کے مقابلے میں کہ جو نہیں پہنچا بہت ہی کم اور ناچیز ہے۔

اس کے بعد ان کی سرگزشت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ ان کی طرف آئے لیکن انہوں نے تعجب و انکار کی بناء پر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ جن چیزوں کے لیے تم بھیجے گئے ہو ہم ان سے کفر کرتے ہیں (جاءتھم رسلھم بالبینات فردوا ایدیھم فی افواھھم وقالوا انا کفرنا بما ارسلتم بہ)۔ کیونکہ "ہم ہر اس چیز کے بارے میں شک رکھتے ہیں کہ جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو" اور اس شک کے ہوتے ہوئے کس طرح ممکن ہے کہ ہم تمہاری دعوت قبول کرلیں (وانا لفی شک مما تدعوننا الیہ مریب)۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انہوں نے پہلے انبیاء کے بارے میں کفر اور بے ایمانی کا اظہار کیا لیکن اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ہمیں شک ہے اور لفظ "مریب" کے ساتھ اپنی بات مکمل کی، تو یہ دونوں چیزیں آپس میں کیا مناسبت رکھتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تردد و شک کا اظہار درحقیقت عدم ایمان کی علت ہے کیونکہ ایمان کے لیے یقین کی ضرورت ہے اور شک اس میں رکاوٹ ہے۔

گزشتہ آیت میں چونکہ مشرکین اور کفار نے شک کو بنیاد قرار دیتے ہوئے عدم ایمان کا اظہار کیا لہٰذا بعد والی آیت میں بلافاصلہ مختصر سی عبارت میں واضح دلیل پیش کرکے ان کے شک کی نفی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کے پیغمبروں نے ان سے کہا کہ کیا اس خدا کے وجود میں شک کرتے ہو کہ جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (قالت رسلھم افی اللّٰہ شک فاطر السمٰوٰت والارض)۔

"فاطر" دراصل شگاف کرنے والے کے معنی میں ہے لیکن یہاں پیدا کرنے والے کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے کہ جو ایک حساب شدہ پروگرام کے تحت کسی چیز کو پیدا کرتا ہے اور پھر اس کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ اس کے وجود کی برکت اور نورِ ہستی سے ظلمتِ عدم پھٹ جاتی ہے اور شگافتہ ہو جاتی ہے جیسے سپیدۂ سحر ظلمتِ شب کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور جیسے کھجور کا خوشہ اپنے غلاف کو شگافتہ کر دیتا ہے اسی لیے عرب اسے "فطر" (بروزن "شتر") کہتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فاطر" جہان کے ابتدائی مادہ کے ٹکڑے ٹکڑے میں شگاف کرنے کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ جدید سائنس کہتی ہے کہ مادۂ عالم مجموعی طور پر باہم پیوستہ چیز تھی کہ جو بعد میں شگافتہ ہو کر مختلف کُرّوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

بہرحال قرآن دیگر اکثر مواقع کی طرح خدا کے وجود اور صفات کو ثابت کرنے کے لیے یہاں نظامِ عالمِ ہستی اور آسمانوں اور زمین کی

---

[1] جملہ لا یعلمھم الا اللّٰہ ممکن ہے پہلے جملے پر معطوف ہو اور واؤ حذف ہو گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے جملے کے لیے جملۂ وصفیہ کی شبیہ ہو۔

Marfat.com

خلقت کا ذکر کرتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا شناسی کے مسئلے میں اس سے زیادہ زندہ اور زیادہ روشن کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اس عجیب و غریب نظام کا ہر گوشہ اسرار سے معمور ہے کہ جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ سوائے ایک قادرِ حکیم اور عالمِ مطلق کے کوئی بھی ایسی قدرت پیش نہیں کر سکتا۔ اسی بناء پر جس قدر انسانی علم ترقی کر رہا ہے اتنے ہی اس نظام کے دلائل آشکار ہو رہے ہیں اور یہ امر ہمیں ہر لمحہ خدا سے نزدیک کرتا ہے۔

واقعاً قرآن کس قدر عجائب و غرائب کا حامل ہے کہ جس نے خدا شناسی اور توحید کی بحث کو اسی ایک جملے میں استفہام انکاری کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ "افی اللہ شک فاطر السمٰوٰت و الارض" وہ جملہ کہ جس کے تجزیہ و تحلیل اور وسیع بحث کے لیے ہزاروں کتابیں بھی کافی نہیں ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسرارِ ہستی اور نظامِ آفرینش ہمیں صرف وجود خدا کی طرف ہدایت نہیں کرتا بلکہ اس کی صفات مثلاً علم و قدرت، حکمت و دانائی اور ازلیت و ابدیت بھی اس مطالعے سے واضح ہوتی ہیں۔

اس کے بعد منکرین کے دوسرے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ اعتراض پیغمبرانِ الٰہی کی رسالت کے بارے میں ہے (کیونکہ انہیں توحید کے بارے میں بھی شک تھا اور دعوتِ پیغمبر کے بارے میں بھی)۔

یہ مسلم ہے کہ دانا و حکیم پروردگار اپنے بندوں کو ہرگز راہبر کے بغیر نہیں رہنے دیتا بلکہ "وہ انبیاء بھیج کر تمہیں دعوت دیتا ہے تاکہ تمہیں گناہوں اور آلودگیوں سے پاک کرے اور تمہارے گناہ بخش دے" (یدعوکم لیغفرلکم من ذنوبکم)[1] اور اس کے علاوہ "تمہیں معین زمانے تک باقی رکھے" تاکہ تم اپنے کمال و ارتقاء کی راہ طے کر سکو اور اس زندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکو (و یؤخرکم الی اجل مسمّی)۔

درحقیقت دعوتِ انبیاء کے دو اہداف تھے۔ ایک گناہوں کی بخشش یعنی انسان کے جسم و روح اور زندگی کی پاکیزگی اور دوسرا مقررہ مدت تک زندگی کی بقاء۔ اور یہ دونوں دراصل ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں کیونکہ وہی معاشرہ باقی رہ سکتا ہے جو گناہ و ظلم سے پاک ہو۔

تاریخ میں بہت سے ایسے معاشرے تھے جو ظلم و ستم، ہوس بازی اور طرح طرح کے گناہوں کی بناء پر "جواں مرگ" کا شکار ہو گئے اور قرآنی اصطلاح میں وہ "اجل مسمّی" تک نہ پہنچ سکے۔

امام صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں ایک جامع اور جاذبِ نظر حدیث منقول ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

من یموت بالذنوب اکثر ممن یموت بالاجال، و من یعیش بالاحسان اکثر ممن

---

[1] اس بارے میں کہ "لیغفرلکم من ذنوبکم" میں "من" کا کیا مفہوم ہے، مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض اسے تبعیض کے معنی میں لیتے ہیں یعنی "تمہارے بعض گناہوں کو بخش دے گا" لیکن اگر اس امر کی طرف توجہ کی جائے کہ ایمان لانا تمام گناہوں کی بخشش کا باعث ہے، تو یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ (الاسلام یجب ما قبلہ — اسلام ماقبل کے گناہ ساقط کر دیتا ہے) بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ "من" بدلیت کے معنی میں ہے۔ اس کے مطابق اس جملے کا معنی یہ ہوگا، "خدا تمہیں دعوت دیتا ہے کہ ایمان لانے کے بدلے تمہارے گناہ بخش دے" بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "من" زائدہ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے یعنی "خدا تمہیں ایمان کی طرف دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے تمام گناہ بخش دے" یہ آخری تفسیر گزشتہ تمام تفاسیر سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

Marfat.com

يعيش بالاعمال

جو لوگ گناہوں کی وجہ سے مر جاتے ہیں ان کی تعداد طبعی موت مرنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے اور جو نیکی کے باعث زندہ رہتے ہیں (اور طویل عمر پاتے ہیں) ان کی تعداد عام عمر کے ساتھ زندہ رہنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے[1]

امام صادق علیہ السلام ہی سے منقول ہے:

ان الرجل یذنب الذنب فیحرم صلٰوۃ اللیل و ان العمل السیٔ اسرع فی صاحبہ من السکین فی اللحم۔

بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے اور نیک اعمال سے مثلاً نماز تہجد سے محروم ہو جاتا ہے۔ (جان لو کہ) برا کام انسان کی تباہی بربادی میں گوشت کے لیے چھری سے زیادہ تیز ہوتا ہے[2]

ضمناً اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ انبیاء پر ایمان لانا اور ان کے پروگراموں پر عمل کرنا "اجل معلق" کو روکتا ہے اور حیاتِ انسانی کو "اجل مسمّی" تک جاری و ساری رکھتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی اجل دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ انسان اپنے بدن کی توانائی کے مطابق اختتام عمر تک پہنچے اور دوسری "اجل معلق" ہے مختلف عوامل یا رکاوٹوں کی وجہ سے انسانی عمر کا راستے ہی میں ختم ہو جانا اور ایسا عام طور پر خود اس کے بغیر سوچے سمجھے کیے گئے اعمال کی وجہ سے اور طرح طرح کے گناہوں کے باعث ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم سورہ انعام کی آیہ ۲ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرم کفار نے اس حیات بخش دعوت کو قبول نہ کیا کہ جس میں واضح طور پر منطق توحید موجود تھی۔ اور اپنے انبیاء کو ایسا جواب دیا کہ جس سے ان کی ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے آثار جھلکتے تھے۔ کہنے لگے: تم ہم جیسے بشر ہو، اس کے علاوہ کچھ نہیں (قالوا ان انتم الا بشر مثلنا) علاوہ ازیں "تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے روکو کہ جس کی ہمارے آباؤ اجداد پوجا کرتے تھے (تریدون ان تصدونا عما کان یعبد اٰباؤنا) - بہرحال ان سب امور سے قطع نظر "تم ہمارے لیے کوئی واضح دلیل لاؤ" (فأتونا بسلطٰن مبین)۔

لیکن ہم نے بارہا کہا ہے (اور قرآن نے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے) کہ انبیاء و رسل کا بشر ہونا نہ صرف ان کی نبوت میں مانع نہیں بلکہ ان کی نبوت کی تکمیل کرنے والا امر ہے اور جو لوگ اس امر کو انبیاء کی نبوت کے انکار کی دلیل سمجھتے تھے ان کا مقصد زیادہ تر بہانہ سازی تھا۔

اسی طرح اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ عام طور پر آنے والی نسل کا علم گزشتگان سے زیادہ ہوتا ہے ان کا آباؤ اجداد کی راہ و رسم کا سہارا لینا ایک اندھے تعصب بے وقعت بے ہودگی اور خرافات کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا یہ تقاضا کہ کوئی واضح دلیل پیش کریں، اس بناء پر نہ تھا کہ انبیاء کے پاس کوئی واضح دلیل نہ تھی بلکہ ہم بارہا آیاتِ قرآنی میں پڑھتے ہیں کہ بہانہ جو لوگ واضح دلائل اور "سلطان مبین" کا انکار کرتے تھے اور ہر وقت نئی دلیل اور کسی نئے معجزے کی فرمائش کرتے رہتے تھے تاکہ اپنے لیے فرار کی راہ پیدا کر سکیں۔ بہرحال آئندہ آیات میں ہم پڑھیں گے کہ انبیاء ان کا جواب کس طرح دیتے تھے۔

---

[1] و [2] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۴۸۸۔

Marfat.com

۱۱۔ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

۱۲۔ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا: یہ ٹھیک ہے کہ ہم تم جیسے بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے (اور اسے اہل پاتا ہے) نعمت عطا کرتا ہے (اور اسے مقام رسالت پر فائز فرماتا ہے) اور ہم حکم خدا کے بغیر ہرگز معجزہ نہیں لاسکتے (اور ہم تمہاری دھمکیوں سے نہیں ڈرتے) اور باایمان افراد کی طرح صرف اللہ پر توکل کرنا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ ہم اللہ پر کیوں توکل نہ کریں جب کہ اس نے ہمیں ہماری (سعادت کی) راہوں کی طرف رہبری کی ہے، اور ہم تمہاری ایذا رسانیوں پر یقیناً صبر کریں گے (اور اپنی رسالت کی انجام دہی سے دستبردار نہیں ہوں گے) اور توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔

تفسیر

صرف اللہ پر توکل کرو

ان دو آیات میں انبیاء کے ہٹ دھرم دشمنوں کی بہانہ سازیوں کا جواب دیا گیا ہے کہ جن کا ذکر گزشتہ آیات میں کیا گیا تھا۔ وہ کہ جو کہتے تھے کہ تم نوعِ بشر میں سے کیوں ہو، ان کے جواب میں پیغمبران گرامی نے کہا یقیناً ہم بھی تم جیسے بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں

Marfat.com

سے جسے چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے اور اسے نعمت عطا کرتا ہے (قالت لهم رسلهم ان نحن الا بشر مثلكم و لكن الله يمن على من يشاء من عباده)۔

یعنی یہ امر فراموش نہ کرو کہ اگر بشر کی بجائے فرشتے کا انتخاب ہوتا تو اُس کے پاس بھی اپنی طرف سے کچھ نہ ہوتا۔ تمام نعمات کہ جن میں سے ایک رسالت و رہبری ہے، خدا کی طرف سے ہیں۔ تو جو ایسا مقام فرشتے کو دے سکتا ہے وہ انسان کو بھی دے سکتا ہے۔

واضح ہے کہ اللہ کی طرف سے ایسی نعمت کی عطا بلا وجہ نہیں ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ خدا کی مشیت اس کی حکمت سے ہم آہنگ ہے یعنی ہم جہاں بھی پڑھیں کہ "خدا جسے چاہتا ہے ....." تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے اور اہل پاتا ہے ....."، یہ ٹھیک ہے کہ مقام رسالت بالآخر خدائی نعمت ہے لیکن اہلیت بھی ذاتِ پیغمبر میں حتماً موجود ہوتی ہے۔

اس کے بعد دوسرے سوال کا جواب دیئے بغیر تیسرے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ گویا آباؤ اجداد کی سنت کو بطور دلیل پیش کرنا اس قدر کمزور اور بے بنیاد تھا کہ ہر عاقل انسان تھوڑے سے غور و فکر سے اس کی کمزوری کو جان لیتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی دیگر آیات میں اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔

بہر حال تیسرے سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: معجزات لانا ہمارا کام نہیں۔ ہم کوئی جادوگر نہیں کہ ایک طرف بیٹھ جائیں اور جو شخص بھی من پسند کے معجزے کی فرمائش کرے اسے پیش کرتے رہیں اور معجزہ بے ارزش کھیل کود ہو کر رہ جائے بلکہ "ہم کوئی معجزہ حکم الٰہی کے بغیر نہیں لا سکتے" (وما كان لنا ان نأتيكم بسلطن الا باذن الله)۔

علاوہ ازیں ہر پیغمبر لوگوں کے تقاضا کے بغیر بھی اس قدر معجزہ پیش کر دیتا ہے جو کافی ہو تاکہ وہ اس کی حقانیت کے اثبات کی سند ہو۔ اگرچہ ان کے دعوت کے مضامین اور ان کا مکتب خود تنہا عظیم ترین معجزہ ہے لیکن بہانہ تراش عام طور پر ان باتوں پر کان نہیں دھرتے اور ہر روز ایک نئی فرمائش کرتے ہیں اور پیغمبر اسے قبول نہ کریں تو پھر شور و غوغا برپا کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ ان کی دھمکیوں کا بھی قاطع جواب دیا جائے انبیاء اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے: "تمام باایمان افراد کو صرف خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے" وہی خدا کہ جس کی قدرت کے مقابلے میں تمام قدرتیں ناچیز اور حقیر ہیں (وعلى الله فليتوكل المؤمنون)۔

پھر اسی مسئلہ توکل کو ایک واضح استدلال کے ساتھ بیان کرتے: ہم اللہ پر توکل کیوں نہ کریں اور تمام مشکلات میں اس کی پناہ کیوں نہ لیں، ہم ناچیز طاقتوں اور دھمکیوں سے کیوں ڈریں جب کہ اُس نے ہماری ہدایت سعادت کی راہوں کی طرف کی ہے (وما لنا الا نتوكل على الله وقد هدانا سبلنا)۔

اُس نے جب کہ ہمیں سعادت کی راہوں کی طرف ہدایت کی افضل ترین نعمت عطا کی ہے تو یقیناً وہ ہر قسم کی جارحیت، کارشکنی اور مشکل میں ہمیں اپنی حمایت کے زیر سایہ رکھے گا۔

پھر وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتے: اب جب کہ ہمارا سہارا خدا ہے ـــ ایسا سہارا کہ جو ناقابلِ شکست ہے اور سب سے بلند ہے تو "ہم یقینی طور پر تمہاری سب اذیتوں کے مقابلے میں پامردی اور صبر و شکیبائی دکھائیں گے" (ولنصبرن على ما آذيتمونا)۔

اور وہ اپنی بات یوں ختم کرتے: تمام توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے (وعلى الله فليتوكل المتوكلون)۔

٭

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ مومنین اور متوکلین: زیر بحث پہلی آیت میں ہے کہ مومنین کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے اور دوسری آیت میں ہے کہ متوکلین کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔ گویا دوسرا جملہ پہلے کی نسبت زیادہ وسعت کا حامل ہے یعنی مومنین کے لیے تو آسان ہے کیونکہ خدا پر ایمان ہو تو یہ ایمان اُس کی قدرت، حمایت اور اس پر توکل کے ایمان سے جدا نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ غیر مومنین اور سب لوگوں کے پاس خدا کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ کیونکہ جس کی طرف بھی نگاہ کریں اُس کے پاس خود اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں تمام نعمتیں، طاقتیں اور عنایتیں اس کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہیں پس انہیں بھی اس کے آستان پر سر جھکانا چاہیے اور وہاں سے طلب کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ توکل انہیں اللہ پر ایمان کی دعوت بھی دے گا۔

۲۔ انبیاء اور معجزات: زیر بحث آیات ایسے لوگوں کے لیے واضح جواب ہیں کہ جو انبیاء سے معجزہ کی نفی کرتے ہیں یا قرآن حکیم کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے معجزات کا انکار کرتے ہیں۔ یہ آیات ہمیں سمجھاتی ہیں کہ انبیاء یہ ہرگز نہیں کہتے تھے کہ ہم معجزہ نہیں لائیں گے بلکہ وہ کہتے تھے کہ ہم حکم خدا اور اذنِ الٰہی کے بغیر یہ کام نہیں کریں گے کیونکہ معجزہ اُس کا کام ہے، اُس کے اختیار میں ہے اور جب وہ قرین مصلحت سمجھتا ہے ہمیں معجزہ دیتا ہے۔

۳۔ توکل کی حقیقت اور فلسفہ: "توکل" دراصل "وکالت" کے مادہ سے وکیل انتخاب کرنے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک اچھا وکیل وہی ہے جو کم از کم چار صفات کا حامل ہو:

(۱) کافی علم و آگاہی

(۲) امانت داری

(۳) طاقت و قدرت

(۴) ہمدردی

شاید یہ امر بھی یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ مختلف کاموں کے لیے ایک مدافع وکیل کا انتخاب اس موقع پر ہوتا ہے جہاں انسان ذاتی طور پر دفاع پر قادر نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس موقع پر دوسری قوت سے استفادہ کرتا ہے اور اس کی طاقت و صلاحیت سے اپنی مشکل حل کرتا ہے۔

لہٰذا خدا پر توکل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں کہ انسان زندگی کی مشکلات و حوادث، مخالفین کی دشمنیوں اور سختیوں، پیچیدگیوں اور کبھی اہداف کے راستے میں حائل رکاوٹوں میں جب خود انہیں دُور کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے اپنا وکیل قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے اور خود بھی ہمت اور کوشش سے باز نہ رہے بلکہ جہاں کسی کام کو خود انجام دینے کی طاقت رکھتا ہو وہاں بھی مؤثرِ حقیقی خدا ہی کو جانے کیونکہ ایک موحد کی چشم بصیرت کے دریچے سے دیکھا جائے تو تمام قدرتوں اور قوتوں کا سرچشمہ وہی ہے۔

"توکل علی اللہ" کا نقطۂ مقابل یہ ہے کہ اُس کے غیر پر بھروسہ کیا جائے۔ یعنی کسی غیر پر تکیہ کر کے بیٹھنا، دوسرے سے وابستہ ہونا اور اپنی ذات میں استقلال و اعتماد سے عاری ہونا۔

Marfat.com

علماء اخلاق کہتے ہیں کہ خدا کی توحیدِ افعالی کا ثمرہ مستقیم توکل ہے کیونکہ جیسے ہم نے کہا ہے کہ ایک موحّد کی نظر میں ہر حرکت، ہر کوشش، ہر جنبش اور عالم میں صورت پذیر ہونے والی ہر چیز آخر کار اس جہان کی پہلی علت یعنی ذاتِ خدا سے ارتباط رکھتی ہے۔ لہٰذا ایک موحّد کی نگاہ میں تمام طاقتیں اور کامیابیاں اسی کی طرف سے ہیں۔

توکل کا فلسفہ

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ:

اولاً توکل علی اللہ ـــ زندگی کے سخت حوادث و مشکلات میں اس ناقابلِ فنا منبعٔ قدرت پر توکل انسان کی استقامت و مقاومت کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے میدانِ احد میں سخت ضرب کھائی اور دشمن میدان چھوڑنے کے بعد راستے میں سے پلٹ آئے تاکہ مسلمانوں پر آخری ضرب لگائیں اور یہ خبر مسلمانوں کو پہنچی تو

قرآن کہتا ہے کہ صاحبِ ایمان افراد اس خطرناک لمحے میں وحشت زدہ نہ ہوئے جب کہ وہ اپنی فعال قوت کا ایک اہم حصہ کھو چکے تھے بلکہ "توکل" اور قوتِ ایمانی نے ان کی استقامت میں اضافہ کر دیا اور فاتح دشمن اس آمادگی کی خبر سنتے ہی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا (آل عمران ۱۷۳)

توکل کے سائے میں اس استقامت کے نمونے متعدد آیات میں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے آل عمران کی آیت ۱۲۲ میں قرآن کہتا ہے:

توکل علی اللہ نے مجاہدین کے دو گروہوں کو میدانِ جہاد میں سستی سے بچایا۔

سورہ ابراہیم کی آیہ ۱۲ میں دشمن کے حملوں اور نقصانات کے مقابلے میں توکل اور صبر کا باہم ذکر ہوا ہے۔

آل عمران کی آیہ ۱۵۹ میں اہم کاموں کی انجام دہی کے لیے پہلے مشورے کا، پھر پختہ ارادے کا اور پھر توکل علی اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔

یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے:

انه لیس له سلطان علی الذین اٰمنوا وعلی ربهم یتوکلون

شیطانی وسوسوں کا صرف وہ لوگ مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کے نفوذ سے بچ سکتے ہیں کہ جو ایمان اور توکل کے حامل ہوں۔

(نحل ـ ۹۹)

ان آیات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شدید مشکلات میں انسان ضعف اور کمزوری محسوس نہ کرے بلکہ اللہ کی بے پایاں قدرت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کامیاب اور فاتح سمجھے۔ گویا توکل امید آفریں، قوت بخش، تقویت پہنچانے والا اور استقامت میں اضافے کا سبب ہے۔ توکل کا مفہوم اگر گوشہ نشینی اختیار کرنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا ہوتا تو مجاہدین اور اس قسم کے لوگوں میں تحرک پیدا کرنے کا باعث نہ بنتا۔

اگر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ عالمِ اسباب اور طبیعی عوامل کی طرف توجہ روحِ توکل سے مناسبت نہیں رکھتی تو وہ انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ طبیعی عوامل کے اثرات کو ارادۂ الٰہی سے جدا کرنا ایک طرح کا شرک ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ عوامل طبیعی کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور سب کچھ اسی کے ارادے اور فرمان کے تحت ہے۔ البتہ اگر عوامل کو ایک مستقل طاقت سمجھا جائے اور انہیں اس کے ارادے کے مدمقابل قرار دیا جائے تو یہ وہ مقام ہے جو روحِ توکل سے مطابقت نہیں رکھتا۔

Marfat.com

کیسے ممکن ہے کہ توکل کی ایسی تفسیر کی جائے حالانکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو متوکلین کے سید و سردار ہیں اپنے اہداف کی پیش رفت کے لیے کسی موقع، صحیح منصوبہ، مثبت تکنیک اور مختلف ظاہری وسائل سے غفلت نہیں برتتے تھے۔

یہ سب چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ توکل کا دو منفی مفہوم نہیں ہے۔

ثانیاً: توکل علی اللہ انسان کو ان وابستگیوں سے نجات دیتا ہے کہ جو ذلت و غلامی کا سرچشمہ ہیں اور اسے آزادی اور خود اعتمادی بخشتا ہے۔

"توکل" اور "قناعت" ہم ریشہ ہیں اور فطرتاً ان دونوں کا فلسفہ بھی کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود ان میں فرق بھی ہے۔ یہاں ہم چند ایک اسلامی روایات پیش کرتے ہیں جن سے توکل کا حقیقی مفہوم اور اصلی بنیاد واضح ہو سکے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الغنی والعز یجولان فاذا ظفرا بموضع التوکل او طنا

بے نیازی اور عزت محوِ جستجو رہتی ہیں جہاں توکل کو پالیتی ہیں وہیں ڈیرے ڈال دیتی ہیں اور اسی مقام کو اپنا وطن بنالیتی ہیں۔[1]

اس حدیث میں بے نیازی اور عزت کا اصلی وطن "توکل" بیان کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

میں نے وحی الٰہی کے قاصد جبرئیل سے پوچھا کہ توکل کیا ہے تو اس نے کہا:

العلم بان المخلوق لا یضر ولا ینفع، ولا یعطی ولا یمنع، واستعمال الیأس من الخلق فاذا کان العبد کذٰلک لم یعمل لاحد سوی اللّٰہ ولم یطمع فی احد سوی اللّٰہ فھذا ھو التوکل۔

جب بندہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ مخلوق نقصان پہنچا سکتی ہے نہ فائدہ اور عطا کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے اور وہ مخلوق کے ہاتھ سے آنکھ اٹھالیتا ہے تو پھر وہ خدا کے علاوہ کسی کے لیے کام نہیں کرتا اور اس کے سوا کسی سے امید نہیں باندھتا تو یہ ہے حقیقتِ توکل۔[2]

کسی نے حضرت امام علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام سے پوچھا:

ما حد التوکل؟

توکل کی حد کیا ہے؟

تو آپ نے فرمایا:

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، باب "... "، حدیث ۳۔

[2] بحار الانوار، جلد ۱۵، حصہ ۲، صفحہ ... چاپ قدیم۔

Marfat.com

ان لاتخاف مع اللہ احدًا[1]
یہ کہ تو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی سے نہ ڈرے[2]

---

[1] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۶۸۲۔

[2] توکل کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "انگیزۂ پیدائشِ مذہب" کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

۱۳۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ
لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ
الظّٰلِمِيْنَ ۝ۙ
۱۴۔ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ
خَافَ وَعِيْدِ ۝
۱۵۔ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ۙ
۱۶۔ مِّنْ وَّرَاۗىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّاۗءٍ صَدِيْدٍ ۝ۙ
۱۷۔ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ
وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ۝

ترجمہ

۱۳۔ جنہوں نے اپنے رسولوں سے کفر کیا انہوں کہا، یقیناً ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے مگر یہ کہ ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ۔ تو ایسے موقع پر ان کے پروردگار نے ان کی طرف وحی کی کہ میں ظالموں کو ہلاک کردوں گا۔

۱۴۔ اور تمہیں ان کے بعد زمین میں سکونت بخشوں گا یہ (کامیابی) اس کے لیے ہے جو میرے مقام (عدالت) سے ڈرتا ہو اور میرے عذاب کا خوف رکھتا ہو۔

۱۵۔ انہوں نے (خدا سے) فتح و کامرانی کا تقاضا کیا اور ہر جبارِ منحرف نا امید اور نابود ہوا۔

۱۶۔ اس کے پیچھے جہنم ہوگی اور اسے متعفن پانی پلایا جائے گا۔

Marfat.com

۱۷۔ وہ اسے بڑی مشکل سے گھونٹ گھونٹ کرکے پیئے گا اور وہ اسے خوشی سے پینے کو تیار نہیں اور ہر جگہ سے موت اس کی طرف آئے گی لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے عذاب شدید ہے۔

تفسیر

منحرف جابروں کا طرزِ عمل اور ان کا انجام

بے منطق افراد کا طریقہ ہے کہ جب وہ اپنی بات اور عقیدے میں کمزوری پر آگاہ ہوتے ہیں تو پھر دلیل کا راستہ چھوڑ کر طاقت اور ظلم کا سہارا لیتے ہیں۔ اس جگہ پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہٹ دھرم اور بہانہ ساز کافر قوموں نے جب انبیاء کی متین و رسا منطق کہ جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے، سنی تو انہوں نے اپنے انبیاء سے کہا: ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی سرزمین سے نکال دیں گے مگر یہ کہ ہمارے دین (بت پرستی) کی طرف پلٹ آؤ (وقال الذین کفروا لرسلھم لنخرجنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا)۔

یہ جاہل مغرور گویا ساری زمین کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور اپنے انبیاء کو ایک شہری کے حقوق ملنے کے بھی قائل نہیں تھے۔ اسی لیے کہتے تھے "ارضنا" (ہماری زمین) حالانکہ خدا نے زمین اور اس کی تمام نعمتیں صالح اور نیک لوگوں کے لیے پیدا کی ہیں اور یہ خود سر، جابر اور متکبر درحقیقت اس میں کوئی حق نہیں رکھتے چہ جائیکہ سب کچھ اپنا سمجھیں۔

ہوسکتا ہے "لتعودن فی ملتنا" (ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ) سے یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ انبیاء قبلِ رسالت بت پرستی کے مذہب پر تھے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ قطع نظر اس کے کہ وہ معصوم تھے اور قبل رسالت بھی تھے ان کی عقل و درایت اس سے کہیں زیادہ تھی کہ وہ ایسا احمقانہ کام کرتے پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ کرتے۔

ہوسکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ اعلانِ نبوت سے قبل انبیاء پر تبلیغ کی ذمہ داری نہ تھی شاید اُن کی خاموشی کے سبب یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ وہ مشرکین کے ہم عقیدہ تھے۔

اس سے قطع نظر اگرچہ خطاب خود انبیاء کو ہے لیکن درحقیقت ان کے پیروکاروں پر بھی محیط ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان کے پیروکار پہلے مشرکین کے مذہب پر تھے اور مشرکین کی نظر صرف انہی پر ہے۔ نیز اصطلاح کے مطابق "لتعودن" عمومی تعبیر ہے اور بابِ تغلیب میں سے ہے (یعنی حکم اکثریت کو عمومیت پر محمول کرنا)[1]

---

[1] اس غلط فہمی کا ایک اور جواب بھی دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ "عود" کا مادہ اگر "الی" کے ساتھ متعدی ہو تو بازگشت اور لوٹنے کے معنی میں ہے اور اگر "فی" کے ساتھ متعدی ہو تو حالت کی تبدیلی کے معنی میں ہے اور بازگشت کا معنی نہیں دیتا۔ لہٰذا "لتعودن فی ملتنا" کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی اس حالت کو بدل دو اور اپنا دین چھوڑ کر ہمارے دین کو قبول کرو۔ لیکن دیگر آیات مثلاً

کلما ارادوا ان یخرجوا منھا اعیدوا فیھا (سجدہ: ۲۰)

اور بعض دوسری قرآنی آیات کی طرف رجوع کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ "عود" جب "فی" کے ساتھ متعدی ہو تو بھی بازگشت کا معنی دیتا ہے (غور کیجئے گا)۔

Marfat.com

قرآن مزید کہتا ہے کہ خداوند عالم ایسے مواقع پر پیغمبروں کی دلجوئی کرتا اور انہیں اطمینان دلاتا ہے اور ان کی طرف وحی کرتا کہ میں یقیناً ظالموں کو ہلاک کروں گا" (فاوحی الیھم ربھم لنھلکن الظّٰلمین) لہٰذا ان دھمکیوں سے ہرگز نہ ڈرو اور تمہارے آہنی ارادے کی راہ میں ذرہ بھر سستی بھی حائل نہیں ہونا چاہیے۔

ظالم منکرین چونکہ انبیاء کو اپنے علاقے سے جلا وطن کر دینے کی دھمکی دیتے تھے تو خدا تعالیٰ اس کے مقابلے میں ان سے وعدہ کرتا ہے کہ "ہم تمہیں اس علاقے میں انکی نابودی اور تباہی کے بعد سکونت بخشیں گے" (ولنسکننکم الارض من بعد ھم) لیکن یہ توفیق و کامیابی سب کو نصیب نہیں ہوتی "یہ ان کے لیے ہے جو میرے مقام سے ڈریں اور احساسِ ذمہ داری کریں اور اسی طرح انحراف، ظلم اور گناہ پر ہونے والی تہدید عذاب سے ڈریں اور اسے سنجیدگی سے لیں" (ذٰلک لمن خاف مقامی وخاف وعید)۔

لہٰذا عنایت و نعمت اور لطف و کرم نہ حساب کتاب کے بغیر ہے اور نہ بلاوجہ بلکہ ایسے افراد کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو احساسِ ذمہ داری کے ساتھ پروردگار کے مقامِ عدل کے مقابلے میں نہ ظلم و ستم کرتے ہیں اور نہ دعوتِ حق کے جواب میں دشمنی کرتے ہیں۔

اور ایسے موقع پر کہ جب انتہا ہو گئی تھی اور وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی ذمہ داری انجام دے چکے تھے، جنہیں ایمان لانا تھا لا چکے تھے اور باقی اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے تھے اور مسلسل انبیاء و رسل کو دھمکیاں دے رہے تھے "تو انہوں نے خدا سے فتح و کامرانی کا تقاضا کیا" (واستفتحوا)۔ تو خدا نے بھی ان سچے مجاہدین کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اس طرح سے کہ "منحرف جابر ناامید، زیاں کار اور نابود ہو گئے" (وخاب کل جبار عنید)۔

خاب "خیبۃ" (بروزن "غیبۃ") کے مادہ سے مطلوب ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے کہ جو تقریباً ناامیدی کا مفہوم دیتا ہے۔

"جبار" یہاں متکبر اور سرکش کے معنی میں ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے اسے کوئی حکم دیا۔ اُس نے نافرمانی کی اور فرمانِ پیغمبرؐ پر عمل نہ کیا تو آپؐ نے فرمایا:

دعوھا فانھا جبارۃ

اسے چھوڑ دو یہ سرکش عورت ہے[1]

لیکن لفظ "جبار" کبھی کبھی خدا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس کا ایک اور معنی ہے اور وہ ہے "محتاجِ اصلاح موجود کی اصلاح کرنے والا" یا "وہ کہ جو ہر چیز پر مسلط ہے"[2]

لفظ "عنید" دراصل "عند" (بروزنِ "رند") سے سمت کے معنی میں ہے۔ یہاں انحراف اور راہِ حق کے علاوہ کی طرف جھکاؤ کے معنی میں ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] تفسیر فخر رازی، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۱۹۹ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

کل جبار عنید من ابی ان یقول لا الٰہ الا اللہ

جبارِ عنید وہ ہے کہ جو لا الٰہ الا اللہ کہنے سے انکار کرے [1]

ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

العنید المعرض عن الحق

عنید وہ ہے جو حق سے روگردانی کرے [2]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ "جبار" صفتِ نفسانی یعنی روحِ سرکشی کی طرف اشارہ ہے اور "عنید" افعالِ انسانی میں اس صفت کے اثر کی طرف اشارہ ہے کہ جو اسے حق سے منحرف کر دیتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے جہان میں ان جبارانِ عنید کے نتیجۂ عمل پر انہیں ملنے والی سزاؤں کے بارے میں دو آیات میں پانچ چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ پانچ چیزیں یہ ہیں:

(۱) اس ناامیدی اور خسران کے پیچھے یا ایسے شخص کے پیچھے جہنم اور جلانے والی آگ ہو گی (من ورائہ جھنم)۔

لفظ "وراء" اگرچہ پس پشت کے معنی میں (لفظ "امام" کے مقابلے میں) ہے لیکن ایسے مواقع پر نتیجہ اور انجام کار کے معنی میں ہے جیسا کہ فارسی میں بھی اس معنی میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اگر فلاں غذا کھاؤ تو اس کے پیچھے بیماری ہے یا اگر فلاں شخص سے دوستی کرو تو اس کے پیچھے بدبختی اور پشیمانی ہے یعنی اس کا نتیجہ اور معلول اس طرح ہے۔

(۲) اس جلانے والی آگ میں جب وہ پیاسا ہو گا تو ہم اسے آبِ "صدید" پلائیں گے (ویسقیٰ من ماء صدید)۔

جیسا کہ علماء لغت نے کہا ہے "صدید" ایک طرح کی میل کچیل کو کہتے ہیں کہ جو چمڑے اور گوشت کے درمیان جمع ہو جاتی ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میل اور خون کی طرح کا بدبودار متعفن اور بدرنگ پانی اسے پلایا جائے گا۔

(۳) یہ گنہگار، مجرم اور جبارِ عنید جب دیکھے گا کہ اسے پینے کے لیے ایسا پانی ملا ہے تو بڑی تکلیف کر کے مشکل سے اسے گھونٹ گھونٹ پیے گا اگر چہ اسے ہرگز پینا نہیں چاہے گا "بلکہ ہم اس کے حلق میں یہ پانی ڈالیں گے" (یتجرعہ ولا یکاد یسیغہ)[3]۔

(۴) اسے اس قدر عذاب، تکلیف اور ناراحتی کا سامنا ہو گا کہ "ہر طرف سے موت اس کی طرف آئے گی لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں" تاکہ اپنے اعمال کا انجام بھگتے (ویأتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت)۔ اگرچہ ظاہراً یوں لگتا ہے کہ جو کچھ عذاب بیان کیا گیا ہے اس سے بڑھ کر نہیں ہو گا لیکن قرآن مزید کہتا ہے: اس کے پیچھے عذابِ شدید ہے (ومن ورائہ عذاب غلیظ)۔

اس طرح جس قدر شدید عذاب اور برا انجام فکرِ انسانی میں آ سکتا ہے حتیٰ کہ جو کچھ نہیں آ سکتا وہ ان خود غرض ظالموں اور بے ایمان گنہگار جابروں کے انتظار میں ہے۔ اُن کا بستر آگ ہے، ان کے پینے کے لیے متعفن اور نفرت آور پانی ہے اور ان کے لیے طرح طرح کا

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صـ ۵۳۲۔

[2] نور الثقلین جلد ۲ صـ ۵۳۲۔

[3] "یسیغہ" "اساغۃ" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے مینے کی چیز حلق میں ڈالنا۔

Marfat.com

عذاب ہے اس کے باوجود وہ مریں گے نہیں بلکہ زندہ رہیں گے اور اس کا مزہ چکھیں گے۔

یہ ہرگز تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اس قسم کی سزائیں غیر عادلانہ ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں کے اعمال کا نتیجہ اور طبیعی اثر ہے بلکہ ان کے کام اس طرح دوسرے گھر میں مجسم ہوتے ہیں کہ جہاں عمل اپنی مناسب شکل میں مجسم ہوگا۔

اگر ہم اپنے زمانے کے بعض ظالموں کے اعمال اور جرائم پر نظر کریں کہ جن کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے یا ایسے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا صحیح طور پر مطالعہ کریں تو بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ یہ سزائیں بھی ان کے لیے بہت کم ہیں [1]

چند اہم نکات

۱۔ مقامِ پروردگار سے کیا مراد ہے ؟ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ ظالموں پر کامیابی اور ان کی نابودی کے بعد زمین پر حکومت ان افراد کا حصہ ہے کہ جو "مقامِ الٰہی" سے ڈریں۔ یہاں لفظ "مقام" سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مختلف احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تمام احتمالات صحیح ہوں آیت سے سب مراد ہوں،

(ا) اس سے مراد محاسبہ کرتے وقت پروردگار کی حیثیت ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم کی بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے۔ مثلاً

و اما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوٰی۔۔۔۔

مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اور جی کو ناجائز خواہشوں سے روکتا رہا۔ (نازعات ۔۴۰)

اور

ولمن خاف مقام ربہ جنتان

اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اس کے لیے دو باغ ہیں (رحمٰن ۔ ۴۶)

(ب) "مقام" "قیام" کے معنی میں ہے اور "قیام" "نظارت و نگرانی" کے معنی میں ہے یعنی جو شخص اللہ کی طرف سے اپنے اعمال کی شدید نظارت سے ڈرتا ہے اور احساسِ مسؤلیت کرتا ہے۔

(ج) "مقام" اجرائے عدالت اور احقاقِ حق کے لیے قیام کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی جو پروردگار کی اس حیثیت سے ڈرتے ہیں۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب معانی جمع ہوں۔ یعنی وہ لوگ کہ جو خدا کو اپنے اوپر

---

[1] اسی تباہ کن جنگ ہی کو لیجئے کہ جس کا سامنا ہمیں اس وقت یہ بحث کرتے ہوئے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کا ماحصل ایک ستمگر حکمران کی خود خواہی یا زیادہ بہتر الفاظ میں ایک پاگل جبارِ عنید کی خودسری کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کے لیے کسی عاقلانہ مقصد کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس میں کیسے کیسے مظالم کیے گئے ہیں کہ جن کے ذکر سے زبان و قلم عاجز ہیں۔ ہم نے خود ملک کے مغربی اسپتالوں میں مجروحینِ جنگ کو دیکھا ہے۔ معصوم بچوں سے لے کر بوڑھوں اور عورتوں تک کو زخمی حالت میں دیکھا ہے ان میں سے بہت سے اپنی آنکھیں اور ہاتھ پاؤں کھو بیٹھے ہیں اور واقعاً ان کی ایسی حالت ہے کہ ان پر ایک نظر کی جائے تو انسان ہل کر رہ جائے۔ تو غور کیجئے کہ جس وقت ایک ظالم اور ستمگر لاکھوں انسانوں کو مصائب میں اس طرح تڑپائے تو اس کے لیے کیسی سزا اور عذاب ہونا چاہیے۔

Marfat.com

ناظر و نگران سمجھتے ہیں اور اس کے حساب اور اجرائے عدالت سے ڈرتے ہیں اور ان کا یہ خوف اصلاحی ہے کہ جو انہیں ہر کام میں احساسِ ذمہ داری کی دعوت دیتا ہے اور انہیں ہر قسم کی ناانصافی، ظلم اور گناہ سے روکتا ہے، کامیابی اور روئے زمین پر حکومت آخرکار انہی کا حصہ ہے۔

۲۔ **"استفتحوا" کا مفہوم:** اس لفظ کی تفسیر کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض اسے فتح و کامرانی کے تقاضا کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس کا شاہد سورہ انفال کی آیہ ۱۹ ہے:

ان تستفتحوا فقد جاءکم الفتح

اے مومنین! اگر تم فتح و کامرانی کا تقاضا کرتے ہو تو یہ فتح و کامرانی تمہارے پاس آگئی ہے۔

بعض قضاوت کا تقاضا کرنے کا معنی لیتے ہیں۔ یعنی انبیاء نے خدا سے تقاضا کیا کہ ان کے اور کافروں کے درمیان فیصلہ کرے۔ اس کا شاہد سورہ اعراف کی آیہ ۸۹ ہے:

ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین

خداوندا! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

۳۔ **ایک جابر حکمران اور قرآن کی یہ آیت:** تواریخ اور تفسیر میں آیا ہے کہ ایک دن جابر حکمران ولید بن یزید بن عبدالملک اموی نے اپنے مستقبل کے لیے قرآن سے فال نکالی۔ اتفاقاً ابتدائے صفحہ میں یہ آیت اس کے سامنے آگئی "واستفتحوا وخاب کل جبار عنید" وہ بہت زیادہ پریشان ہوا۔ اسے سخت غصہ آیا۔ یہاں تک کہ اس لعین نے وہ قرآن جو اس کے ہاتھ میں تھا پارہ پارہ کر دیا پھر یہ اشعار پڑھے:

اتوعد کل جبار عنید؟

فھا انا ذاک جبار عنید!

اذا ماجئت ربک یوم حشر

فقل یا رب مزقنی الولید

کیا تو ہے کہ جو ہر جبار عنید کو دھمکاتا ہے؟

تو یہ لے میں وہی جبار عنید ہوں

جب روز حشر اپنے پروردگار سے ملنا

تو کہہ دینا خداوندا! مجھے ولید نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا

زیادہ وقت نہ گزرا کہ یہ لعین اپنے دشمنوں کے ہاتھوں بدترین طریقے سے مارا گیا۔ انہوں نے اس کا سر کاٹ کر اسی کے محل کی چھت پر لٹکا دیا اور پھر وہاں سے ہٹا کر شہر کے دروازے پر لٹکا دیا[1]

---

[1] تفسیر قرطبی ص ۳۵۰۹۔

Marfat.com

۱۸۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ کَرَمَادِ اِشْتَدَّتْ بِهِ
الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ؕ
ذٰلِکَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ○

ترجمہ

۱۸۔ جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ان لوگوں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں کہ جنہیں ایک طوفانی دن میں تیز آندھی کا سامنا کرنا پڑے تو ان میں یہ طاقت نہیں کہ جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے اسے اپنے ہاتھ میں لیں اور یہ بہت دُور کی گمراہی ہے۔

تفسیر

تیز آندھی اور خاکستر

اس آیت میں بے ایمان افراد کے اعمال کے لیے بہت رسا اور نہایت عمدہ مثال بیان کی گئی ہے یہ آیت کفار کے انجام کے بارے میں گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ان کے اعمال اس خاکستر کی مانند ہیں جسے ایک طوفانی روز تیز آندھی کا سامنا کرنا پڑے (مثل الذین کفروا بربهم اعمالهم کرماد ۨ اشتدت به الریح فی یوم عاصف)۔

جیسے ایک طوفانی روز تیز آندھی کے سامنے راکھ اس طرح بکھر جاتی ہے کہ کوئی شخص اسے جمع نہیں کر سکتا اسی طرح منکرین حق کے بس میں نہیں کہ جو اعمال وہ انجام دے چکے ہیں انہیں اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ وہ سب تباہ و برباد ہو جائیں گے اور ان کے ہاتھ خالی رہ جائیں گے (لایقدرون مما کسبوا علیٰ شیء) اور یہ بہت دُور کی گمراہی ہے (ذٰلک هو الضلال البعید)۔

چند اہم نکات

۱۔ بکھر جانے والی راکھ: اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان کے اعمال گرد و غبار کی مانند کوئی مفید چیز نہیں ہیں انہیں خاکستر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی باقی ماندہ تھوڑی سی آگ ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ ہو سکتا ہے ان کے اعمال کا ظاہر ہو اور اندر سے کچھ نہ ہو ایک چھوٹے سے برتن میں مٹی ہو تو ہو سکتا ہے اس میں ایک خوبصورت پھول اُگے لیکن اگر بہت ساری خاکستر ہو تو وہ اس قدر فضول ہے

Marfat.com

کہ اس میں سے فضول قسم کی گھاس تک نہیں اُگتی ۔

۲ ۔ **کافروں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں :** کفار کے اعمال کو خاکستر سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ توجہ رہے کہ خاکستر کے ذرات میں کوئی پیوند یا جوڑ نہیں ہوتا یہاں تک کہ پانی کی مدد سے بھی انہیں ایک دوسرے سے نہیں جوڑا جا سکتا اور اس کا ہر ذرہ دوسرے سے تیزی سے الگ ہو جاتا ہے ۔

گویا ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ مومنین کے اعمال باہم متصل اور پیوستہ ہوتے ہیں ، ان کا ہر عمل دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور توحید و وحدت کی روح نہ صرف مومنین کے درمیان موجود ہے بلکہ ایک صاحب ایمان فرد کے اعمال کے درمیان بھی موجود ہے لیکن بے ایمان افراد کے کاموں میں ایسا کوئی ربط اور اتصال نہیں ہوتا ۔

۳ ۔ **ایک طوفانی دن اور آندھی :** تیز آندھی چلے تو راکھ بکھر جاتی ہے لیکن " فی یوم عاصف " (ایک طوفانی دن) کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے ۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے چلنے والی تیز ہوا راکھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر پھینک دے کہ جو زیادہ دُور نہ ہو ۔ لیکن اگر دن طوفانی ہو صبح سے شام تک آندھیاں چلیں اور ہر طرف سے طوفان ہی طوفان ہو تو ظاہر ہے اس قسم کی راکھ اس طرح سے منتشر ہوگی کہ اس کا ہر ذرہ کہیں بہت دور جا پڑے گا ۔ اس طرح سے کہ کسی کے بس میں نہ ہو گا کہ اسے جمع کر سکے ۔

۴ ۔ **پتوں اور راکھ کے بکھرنے میں فرق ہے :** اگر آندھی گھاس پھوس کے ڈھیر یا پتوں پر چلے اور انہیں مختلف جگہوں اور دُور دراز کے مقامات پر بکھیر دے تو پھر بھی ایک اندازہ ہو سکتا ہے لیکن اگر راکھ کے چھوٹے چھوٹے ذرے بکھر جائیں تو وہ آنکھوں سے اس طرح محو ہوں گے کہ گویا بالکل نابود ہو گئے ہیں ۔

۵ ۔ **تیز آندھی کے اثرات :** نظامِ آفرینش میں ہوا بلکہ تیز آندھی کے بہت سے اصلاحی آثار ہیں اس کے تخریبی آثار استثنائی پہلو رکھتے ہیں ۔ بہرحال اس کے مندرجہ ذیل آثار قابلِ توجہ ہیں :

الف ہوا اور آندھی مختلف نباتات کے بیج مختلف جگہوں پر پھیلا دیتی ہے اور ایک باغبان اور کسان کی طرح سارے کرۂ ارض پر بیج بکھیر دیتی ہے ۔

ب پودوں کو تلقیح کرتی ہے اور نر کے بیج نباتات کے مادہ حصوں پر چھڑکتی ہے ۔

ج بادلوں کو سمندروں کی سطح سے ہانک کر خشک زمینوں کی طرف لے جاتی ہے ۔

د بلند پہاڑوں کو آہستہ آہستہ رگڑ کر نرم اور بار آور کر دیتی ہے ۔

ہ قطبی منطقوں کا موسم منطقۂ استوار کی طرف اور خطِ استوار کا موسم سرد علاقوں کی طرف منتقل کرتی ہے اور کرۂ زمین میں حرارت کو اعتدال پر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے ۔

و سمندر کے پانی میں موجیں پیدا کرتی ہے اور اسے زیر و زبر کرتی ہے اس طرح اس میں ہوا پہنچتی ہے جب کہ سمندر کا پانی کھڑا اور جامد رہے تو متعفن ہو جائے ۔

اس طرح نباتات اور تمام زندہ موجودات ہوا کے چلنے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔

Marfat.com

لیکن ـــ خاکستر کم وزن، کھوکھلی اور سیاہ رو ہوتی ہے۔ اس میں کوئی زندہ موجود نہیں رہ سکتا، یہ سرسبز اور بارآور نہیں ہوتی۔ اس کے ذرات ایک دوسرے سے بالکل جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ جب یہ خاکستر ہوا کا سامنا کرتی ہے تو فوراً ہی منتشر ہو جاتی ہے اور اس کا بے خاصیت ظاہر بھی نظروں سے محو ہو جاتا ہے

۶ ۔ **ان کے اعمال کیوں کھوکھلے ہیں؛** یہ امر قابلِ غور ہے کہ بے ایمان افراد کے اعمال بے وقعت کیوں ہیں وہ اپنے اعمال سے کچھ حاصل کیوں نہیں کر پاتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر توحیدی نگاہ سے دیکھا جائے اور اس کے معیاروں کے مطابق تحقیق کی جائے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چیز کہ جو عمل سے شکل پذیر ہوتی ہے وہ نیت، ہدف اور طرزِ عمل ہے۔ اگر پروگرام، ہدف اور مقصد صحیح ہو تو عمل بھی ایسا ہی ہوگا اور اگر کوئی اچھا عمل غلط مقصد اور بے وقعت ہدف کے لیے انجام دیا جائے تو وہ لایعنی اور بے مفہوم ہو کر رہ جائے گا اور اس کی حیثیت تیز آندھی کے سامنے خاکستر کی سی ہوگی۔

غلط نہ ہوگا اگر اس بحث کو ہم ایک زندہ مثال کے ذریعے واضح کریں۔

اس وقت حقوقِ انسانی کے نام پر مغربی دنیا میں اور بڑی طاقتوں کی طرف سے بعض کام کیے جاتے ہیں۔ انبیاء بھی حقوقِ انسانی کے تحفظ کا پروگرام لے کر آئے تھے لیکن دونوں کے ماحصل اور ثمرہ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

جہاں خوار طاقتیں جب حقوقِ انسانی کا دم بھرتی ہیں تو یقیناً ان کا مقصد انسانی اور اخلاقی نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد اپنے جرائم اور استعماری طور طریقوں پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے کچھ جاسوس کہیں قابو آ جائیں تو وہ حقوقِ انسانی کے نام پر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن جب خود انہی کے ہاتھوں لاکھوں ویت نامی خاک وخون میں غلطاں ہوں یا ہمارے اسلامی ممالک میں وہ اپنے جرائم اور قباحتوں میں مصروف ہوں تو حقوقِ انسانی کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ انہوں نے تو حقوقِ انسانی جھوٹے اور ظالم حکمرانوں سے تعاون کی نذر کر رکھے ہیں۔

لیکن ایک سچے پیغمبر یا علیؑ جیسے وصیِ پیغمبرؐ کے نزدیک حقوقِ انسانی انسانوں کی حقیقی آزادی کا نام ہے۔ وہ انسانوں کی غلامی کے طوق اور زنجیریں توڑنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ جب وہ کسی مظلوم انسان کو دیکھتے ہیں تو تڑپ اٹھتے ہیں اور اس کی نجات کے لیے کوشش کرتے ہیں۔

گویا جہاں خوار طاقتوں کا عمل خاکستر کی مانند ہے جسے تیز آندھی کا سامنا ہے اور انبیاء و اوصیاء کا عمل بابرکت زمین کی طرح ہے جس سے طرح طرح کی پاکیزہ نباتات پیدا ہوتی ہیں اور پھل پھول اُگتے ہیں۔

یہیں سے مفسرین کی ایک بحث واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ زیرِ نظر آیت میں اعمال سے کون سے اعمال مراد ہیں۔ کہنا چاہیے کہ ان کے سارے اعمال ہیں حتیٰ کہ ان کے وہ اعمال بھی جو ظاہراً اچھے لیکن باطناً شرک و بت پرستی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

۷ ۔ **مسئلۂ احباط؛** جیسے ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں حبطِ اعمال یعنی بُرے اعمال یا کفر و بے ایمانی کی وجہ سے اچھے اعمال ختم ہو جانے کا مسئلہ علماءِ اسلام کے درمیان اختلافی ہے لیکن حق یہ ہے کہ بے ایمانی اور کفر پر اصرار اور ہٹ دھرمی نیز بعض اعمال مثلاً حسد، غیبت اور قتلِ نفس کی ایسی بُری تاثیر ہے جو نیک اعمال اور حسنات کو برباد کر دیتی ہے۔ زیرِ نظر آیت بھی حبطِ اعمال کے امکان پر ایک اور دلیل ہے[1]

---

[1] جلد ۲ تفسیر نمونہ صفحہ ۶۶ (اردو ترجمہ)

Marfat.com

۸۔ کیا ایجادات و انکشافات کرنے والوں کے لیے بھی جزاء ہے؟ مندرجہ بالا مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ علوم اور ایجادات و انکشافات کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے سائنسدانوں نے طاقت فرسا زحمتیں جھیلی ہیں اور بہت محرومیوں کو برداشت کیا ہے تاکہ ایجاد و انکشاف کر سکیں تاکہ اپنے ہم نوع لوگوں کے دوش سے بھاری بوجھ اتار سکیں مثلاً بجلی ایجاد کرنے والے اڈیسون نے اس قیمتی ایجاد کے لیے کیسی جانکاہ زحمتیں جھیلی ہیں۔ شاید اس نے اس راہ میں اپنی جان بھی گنوا دی ہے لیکن اس نے ساری دنیا کو روشن کر دیا ہے اور کارخانے چلا دیئے ہیں۔ اس ایجاد کی برکت سے سرسبز کھیتیوں کو ٹیوب ویلوں سے پانی ملا ہے، درخت سرسبز ہوئے ہیں اور کھیت آباد ہوئے ہیں خلاصہ یہ کہ دنیا کا چہرہ ہی بدل گیا ہے۔

اسی طرح پاسچر ہے کہ جس نے جراثیم کو دریافت کر کے لاکھوں انسانوں کو موت کے خطرے سے نجات دلا دی ہے۔

کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایسے سب افراد اس فرض کی بناء پر قعرِ جہنم میں گرائے جائیں کہ وہ ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن وہ افراد جنہوں نے عمر بھر انسانوں کی خدمت کا کوئی کام نہیں کیا ان کا مقام بہشت ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اسلام کے معاشرتی اصولوں کے لحاظ سے فقط عمل کو دیکھنا کافی نہیں بلکہ عمل کی قدر و قیمت اس کے محرک، سبب اور مقصد کے ساتھ بنتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہسپتال، سکول یا کوئی اور مفید عمارت تعمیر کرتے ہیں اور اظہار بھی یہ کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اس معاشرے کی انسانی خدمت ہے جس کے وہ مرہونِ منت ہیں حالانکہ اس پردے کے پیچھے کوئی اور مطلب چھپا ہوتا ہے۔ ان کا مقصد مقام و منصب یا مال و ثروت کا حصول ہوتا ہے یا وہ اپنے بچاؤ کے لیے ایسا کرتے ہیں یا وہ عوام کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مادی مفادات کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں یا پھر وہ دوسروں کی نظروں سے بچ کر خیانت کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس ممکن ہے کوئی شخص پورے خلوص سے یا سو فی صد انسانی اور روحانی جذبے سے کوئی چھوٹا سا کام انجام دے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان "عظیم لوگوں" کے عمل اور کردار کے محرک کی بھی تحقیق کی جائے۔ اگر تحقیق کی جائے تو ان کا عمل یقیناً چند اشکال سے خارج نہیں ہے۔

ا۔ کبھی کسی ایجاد کا حقیقی مقصد تخریب ہوتا ہے (جیسے اٹامک انرجی کی دریافت پہلے پہل ایٹم بم بنانے کے لیے ہوئی)۔ پھر اس کے ساتھ نوعِ انسان کو کچھ فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں کہ جو دریافت یا ایجاد کرنے والوں کا حقیقی مقصد نہیں ہوتا یا پھر اسے ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ایجادات کرنے والوں کی ذمہ داری پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ب۔ کبھی ایجاد و انکشاف کرنے والے کا مقصد مادی فوائد یا نام و نمود اور شہرت کا حصول ہوتا ہے۔ ایسا شخص درحقیقت ایک تاجر کی طرح ہے کہ جو زیادہ سے زیادہ آمدنی کے لیے زیادہ نفع بخش چیزیں بناتا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی چیزیں کچھ لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہیں اور ملک کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے جب کہ اس کا مقصد سوائے آمدنی کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور اگر کسی اور کام میں زیادہ آمدنی ہو تو وہ اسے شروع کر دیتا ہے۔ البتہ ایسی تجارت یا پیداوار اگر شرعی قوانین کے مطابق ہو تو غلط اور حرام کام نہیں ہوگا لیکن کوئی مقدس عمل بھی شمار نہیں ہوگا۔

ایسی ایجادیں اور دریافتیں تاریخ میں کم نہیں ہیں کہ جو اس قسم کے طرزِ فکر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اگر یہ لوگ دیکھیں کہ ایسے

Marfat.com

کسی کام کی نسبت دوسرے راستے میں آمدنی زیادہ ہے اگرچہ وہ معاشرے کے لیے مضر ہو (مثلاً دواسازی کی صنعت میں ٢٠٪ منافع ہے اور ہیروئن سازی میں ۵۰٪) تو یہ دوسرے کو ترجیح دیں گے۔

ایسے لوگ نہ خدا سے کوئی مطالبہ رکھتے ہیں نہ اپنے ہم نوع انسانوں سے۔ ان کا اجر وہی فائدہ اور شہرت ہے جو وہ چاہتے ہیں اور جو انہوں نے پایا ہے۔

ج ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس کے محرکات اور اسباب یقیناً انسانی ہیں یا اگر وہ اللہ کے معتقد ہیں تو ان کے اہداف اور محرکات الٰہی ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی سالہا سال تجربہ گاہوں کے گوشے میں عزت و محرومی سے گزار دیتے ہیں، اس امید پر کہ اپنی نوع کی کچھ خدمت کر سکیں اور جہانِ انسانیت کو کوئی ہدیہ اور سوغات پیش کر سکیں، کسی تکلیف زدہ کے پاؤں کی زنجیر کھول سکیں اور کسی رنجیدہ خاطر کے چہرے سے پریشانی کی پرچھائیاں دور کر سکیں۔

ایسے افراد اگر ایمان اور الٰہی محرک رکھتے ہوں تو پھر ان کے بارے میں کوئی بحث نہیں اور اگر وہ ایمان اور الٰہی محرک نہ رکھتے ہوں لیکن ان کا محرک انسانی اور لوگوں کی خدمت ہو تو اس میں شک نہیں کہ انہیں خداوندِ عالم کی طرف سے مناسب اجر اور جزا ملے گی۔ ہو سکتا ہے انہیں یہ جزا دنیا میں ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے جہان میں ملے۔ یقیناً خداوندِ عالم و عادل انہیں محروم نہیں کرے گا۔ لیکن کس طرح اور کس طرز پر، اس کی تفصیلات ہم پر واضح نہیں۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ "خدا اس قسم کے نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا" (البتہ اگر وہ ایمان قبول نہ کرنے میں جاہل قاصر ہوں تو پھر مسئلہ بہت واضح ہے)۔

اس مسئلہ کی دلیل حکمِ عقلی کے علاوہ وہ اشارات ہیں جو آیات یا روایات میں آئے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ "ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین"[1] کے مفہوم میں ایسے افراد شامل نہ ہوں۔ کیونکہ قرآن میں لفظ "محسنین" کا اطلاق صرف "مؤمنین" پر نہیں ہوا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کے پاس آئے تو انہیں پہچانے بغیر عزیزِ مصر سمجھتے ہوئے کہنے لگے:

انا نراك من المحسنين

ہم تجھے نیکوکاروں میں سے سمجھتے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے:

فمن يعمل مثقال ذرة خيرًا يره ومن يعمل مثقال ذرة شرًا يره

جو شخص ذرہ بھر اچھا کام کرے گا اُسے دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ بھر بُرا کام کرے گا اسے دیکھا گا۔

ایک حدیث میں علی بن یقطین کی وساطت سے امام کاظم علیہ السلام سے مروی ہے:

بنی اسرائیل میں ایک صاحبِ ایمان تھا۔ اس کا ہمسایہ کافر تھا۔ کافر اپنے صاحبِ ایمان ہمسائے سے اچھا سلوک کرتا تھا۔ جب وہ دنیا سے گیا تو خدا نے اس کے لیے ایک گھر بنایا تا کہ جہنم کی آگ کی تپش سے رکاوٹ ہو...... اور

---

[1] یوسف ۔ ٩٠ اور بعض دیگر سورتیں۔

Marfat.com

اس سے کہا گیا کہ یہ اپنے مومن ہمسائے سے تیرے نیک سلوک کے سبب سے ہے[1]

عبداللہ بن جدعان زمانۂ جاہلیت کے مشہور مشرکین اور قریش کے سرداروں میں سے تھا۔ اس کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

اہلِ جہنم میں سے کمترین عذاب ابنِ جدعان کو ہو گا۔

لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیوں

آپؐ نے فرمایا:

انه کان یطعم الطعام

کیونکہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا تھا[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاتم طائی کے بیٹے عدی سے فرمایا:

دفع عن ابیك العذاب الشدید بسخاء نفسه

خدا نے تیرے باپ سے شدید عذاب اس کے جود و سخا کی بناء پر اٹھا لیا ہے[3]

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

یمن سے کچھ لوگ رسول اللہؐ سے بحث و تمحیص کے لیے آپؐ کی خدمت میں آئے۔ ان میں سے ایک شخص تھا جو زیادہ باتیں کرتا تھا اور آپؐ سے بڑی سختی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ آنحضرتؐ کو اتنا برا لگا کہ ناپسندیدگی کے آثار آپؐ کے چہرہ مبارک پر پوری طرح ظاہر ہوئے۔ اس وقت جبرئیل آئے اور یہ پیامِ الٰہی آپ تک پہنچایا کہ خدا فرماتا ہے: یہ شخص سخی ہے۔ یہ بات سنتے ہی رسول اللہ کا غصہ ختم ہو گیا۔ اس کی طرف رُخ کر کے آپ نے فرمایا کہ پروردگار نے مجھے اس قسم کا پیغام دیا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تجھ پر اس قسم کی سختی کرتا کہ تو دوسروں کے لیے عبرت بن جاتا۔ اس شخص نے پوچھا: کیا آپ کے پروردگار کو سخاوت پسند ہے؟ فرمایا: ہاں۔ تو اُس نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اس کے رسول اور فرستادہ ہیں اور اُسی خدا کی قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے آج تک میں نے کسی شخص کو اپنے ہاں سے محروم نہیں پلٹایا[4]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بعض آیات اور بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان یا یہاں تک کہ ولایت قبولِ اعمال یا جنت میں داخلے کی شرط ہے لہٰذا اگر بے ایمان افراد سے بہترین اعمال سرزد ہوں تو وہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہوں گے۔

---

[1] بحار، جلد ۳ صفحہ ۳۸۲ چاپ کمپانی۔

[2] بحار، جلد ۳ صفحہ ۳۸۲ چاپ کمپانی۔

[3] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۶۰۷۔

[4] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۶۰۷۔

Marfat.com

لیکن اس سوال کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ "قبولیتِ اعمال" کا ایک اور مفہوم ہے اور مناسب اجر ملنا دوسرا مسئلہ ہے لہٰذا علماء اسلام کے درمیان مشہور ہے کہ مثلاً حضورِ قلب کے بغیر یا بعض گناہوں مثلاً غیبت سے نماز مقبولِ بارگاہِ خدا نہیں ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسی نماز شرعاً صحیح ہے، فرمانِ الٰہی کی اطاعت ہے اور اس سے ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے اور مسلّم ہے کہ فرمانِ الٰہی کی اطاعت اجر و جزا کے بغیر نہیں ہو گی۔

لہٰذا عمل کی قبولیت دراصل عمل کا عالی مرتبہ ہوتا ہے۔ زیرِ بحث مسئلے میں بھی ہم یہی بات کہتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ اگر انسانوں اور عوام کی خدمات ایمان کے ساتھ ہوں تو ان کا مفہوم عالی ہو گا لیکن ایسا نہ ہو تو بھی بالکل بے معنی اور بغیر اجر کے نہیں ہوں گی۔ جنت میں داخلے کے بارے میں بھی ہم یہی جواب دیں گے کہ عمل کا اجر ضروری نہیں کہ جنت میں داخلے پر منحصر ہو۔

(بحث کا نچوڑ اور تفصیلی بحث مناسب ہے کہ اس مسئلے کی فقہی مباحث میں ہو)۔

Marfat.com

۱۹۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ وَیَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۙ﴿۱۹﴾

۲۰۔ وَّمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ ﴿۲۰﴾

ترجمہ

۱۹۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔

۲۰۔ اور یہ کام خدا کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

تفسیر

خلقت حق کی اساس پر ہے

گزشتہ آیت میں باطل کا ذکر ہے۔ وہ باطل کہ جو خاکستر کی طرح ہے۔ وہ خاکستر کہ جو پراگندہ ہے اور آندھی چلنے سے ادھر اُدھر بکھر جاتی ہے۔ زیرِ نظر پہلی آیت میں حق کے بارے میں گفتگو ہے۔ یہ حق کے استقرار سے تعلق ہے۔

روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے دنیا کے تمام طالبانِ حق کے لیے نمونے کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے (الم تر ان اللہ خلق السمٰوٰت والارض بالحق)۔

"حق" جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے دراصل "مطابقت" اور "ہم آہنگی" کے معنی میں ہے لیکن اس کے استعمال کے مواقع مختلف ہیں۔

بعض اوقات حق ایسے کام کو کہا جاتا ہے جو حکمت کے موافق اور نظم و نسق کے مطابق کیا گیا ہو جیسا کہ قرآن میں ہے،

ھوالذی جعل الشمس ضیاء و القمر نورًا ۔۔۔۔ ماخلق اللہ ذٰلک الا بالحق

وہ وہی ہے کہ جس نے خورشید کو روشنی اور چاند کو نور افشانی کا ذریعہ قرار دیا ہے ۔۔۔۔۔ اس نے یہ کام حکمت اور حساب و کتاب کے بغیر انجام نہیں دیا۔ (یونس ـ ۵)

کبھی اُس ذات کو حق کہا جاتا ہے جو اس قسم کا کام انجام دے جیسے اللہ کے لیے اسی لفظ کا اطلاق ہوا ہے،

Marfat.com

فذلکم اللہ ربکم الحق

تمہارا یہ خدا تمہارا پروردگارِ حق ہے۔ (یونس - ۳۲)

کبھی ایسے اعتقاد کو حق کہا جاتا ہے جو حقیقت کے مطابق ہو۔ مثلاً

فھدی اللہ الذین اٰمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق

جن اعتقادات میں اختلاف کرتے ہیں، خدا نے ایمان والوں کو ان میں حق کی ہدایت کی ہے۔ (بقرہ - ۲۱۳)

کبھی ایسی گفتگو اور عمل کو حق کہا جاتا ہے کہ جو ضروری مقدار کے مطابق ہو اور اس وقت انجام پائے جب ضروری ہو۔ مثلاً

حق القول منی لاملئن جھنم

مجھ سے یہ قول حق صادر ہوا ہے کہ میں جہنم کو (گنہگاروں سے) بھر دوں گا۔ (سجدہ - ۱۳)

بہر حال "حق" کے مقابل "باطل"، "ضلال"، "لعب"، "بیہودہ" اور اس قسم کے دیگر کام ہیں لیکن زیر بحث آیت میں بلاشبہ اس پہلے معنی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی عالم آفرینش کی عمارت اور آسمان و زمین سب نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی خلقت میں نظم و نسق، حساب و کتاب اور حکمت و ہدف ہے۔ خدا کو انہیں خلق کرنے کی احتیاج تھی نہ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اور نہ ان سے وہ اپنی ذات کی کسی کمی کو دور کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے بلکہ یہ وسیع و عریض جہان مخلوقات کی پرورش اور انہیں زیادہ سے زیادہ تکامل و ارتقاء بخشنے کی منزل ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس بات کی دلیل کہ اسے تمہاری اور تمہارے ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ہے کہ "اگر وہ ارادہ کرے تو تمہیں لے جائے اور تمہاری جگہ کوئی نئی مخلوق لے آئے" ایسی مخلوق کہ جو ساری کی ساری ایمان رکھتی ہو اور تمہارے غلط کاموں میں سے کسی کو انجام نہ دے (ان یشأ یذھبکم ویأت بخلق جدید)۔

اور یہ کام خدا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے (وما ذٰلک علی اللہ بعزیز)۔

اس گفتگو کی شاہد سورہ نساء کی یہ آیت ہے:

و ان تکفروا فان للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وکان اللہ غنیاً حمیدًا ...... ان یشأ یذھبکم ایھا الناس ویأت باٰخرین وکان اللہ علی ذٰلک قدیرًا

اگر تم کافر ہو جاؤ تو اس سے خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ کا ہے اور خدا بے نیاز اور لائق حمد ہے .... اے لوگو! وہ جب چاہے تمہیں لے جائے اور دوسرا گروہ لے آئے اور یہ کام خدا کے لیے آسان ہے۔ (نساء ۱۳۱ تا ۱۳۳)

مذکورہ بالا آیت کے متعلق یہ تفسیر ابن عباس سے بھی نقل ہوئی ہے۔

ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ مندرجہ بالا جملہ مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہے یعنی خدا کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں کہ سب انسانوں کو لے جائے اور دوسری مخلوق پیدا کرے تو کیا اس قدرت کے باوجود مسئلہ معاد دوسرے جہان کی طرف تمہاری بازگشت میں تمہیں شک ہو سکتا ہے؟

Marfat.com

۲۱۔ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا
لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ
اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۧ

۲۲۔ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ
الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ
سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ
وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ
اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

۲۳۔ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ
فِيْهَا سَلٰمٌ ۝

ترجمہ

۲۱۔ اور (قیامت کے روز) وہ سب خدا کے سامنے ظاہر ہوں گے تو اس وقت ضعفاء (نادان پیروکار) مستکبرین سے کہیں گے، ہم تمہارے پیروکار تھے۔ تو کیا (اب جب کہ تمہاری پیروی کی وجہ سے ہم عذابِ خدا میں گرفتار ہوئے ہیں) تم تیار ہو کہ عذاب الٰہی کا کچھ حصہ قبول کرو اور ہم سے اس کا بوجھ اٹھا لو۔ تو وہ کہیں گے کہ اگر خدا نے (عذاب سے رہائی کی طرف) ہماری ہدایت کی ہوتی تو ہم بھی تمہیں ہدایت

Marfat.com

کرتے (معاملہ اس سے آگے نکل گیا ہے) چاہے ہم بے قرار ہوں یا صبر کریں، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں نجات کی راہ موجود نہیں ہے۔

۲۲۔ اور جس وقت کام تمام ہو گیا تو شیطان کہے گا کہ خدا نے تم سے حق وعدہ کیا اور میں نے تم سے (باطل) وعدہ کیا اور خلاف ورزی کی۔ میں تم پر کوئی تسلط نہیں رکھتا تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے قبول کر لی۔ لہٰذا مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو سرزنش کرو، نہ میں تمہارا فریادرس ہوں نہ تم میرے فریادرس ہو۔ تم نے جو مجھے شریک بنایا (اور میری اطاعت کو اطاعت خدا کے ہم پلہ قرار دیا) اور یہ تم پہلے ہی سے کرتے تھے، میں اس سے بیزار ہوں اور میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ یقیناً ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۲۳۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے وہ باغاتِ بہشت میں داخل ہوں گے۔ ایسے باغات کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمیشہ ان میں رہیں گے اور وہاں ان کا تحیہ سلام ہو گا۔

تفسیر

شیطان اور اس کے پیروکاروں کی صریح گفتگو

گزشتہ چند آیات میں ہٹ دھرم اور بے ایمان منحرفین کے لیے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ زیرِ بحث آیات اسی مفہوم کا تسلسل ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: روزِ قیامت تمام جابر، ظالم اور کافر بارگاہِ خداوندی میں پیش ہوں گے چاہے وہ تابع ہوں یا متبوع اور پیرو ہوں یا پیشوا (وبرزوا للّٰہ جمیعاً)[1]۔

---

[1] توجہ رہے کہ "برزوا" فعل ماضی ہے لیکن یہاں آئندہ کے مفہوم میں آیا ہے کیونکہ قیامت سے مربوط مسائل قطعی اور ناقابلِ تغیر ہیں لہٰذا بہت سی قرآنی آیات میں ان کا ذکر ماضی کے صیغے کے ساتھ ہوا ہے۔ جیسے ایک ایسے بیمار شخص کے لیے کہ جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ وہ مر جائے گا ہم کہتے ہیں وہ تو دنیا سے چل بسا۔

Marfat.com

اس وقت ضعفاء یعنی نادان پیروکار کہ جو اندھی تقلید کی وجہ سے اپنے آپ کو وادیٔ ضلالت میں سرگرداں کر چکے تھے مستکبرین سے کہ جو ان کی گمراہی کے عامل تھے، کہیں گے: ہم تمہارے پیروکار تھے۔ اب جب کہ ہم تمہاری رہبری کے باعث ان سب عذابوں اور بلاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں، کیا ممکن ہے کہ تم بھی ان عذابوں کا کچھ حصہ قبول کر و تاکہ ہمیں تخفیف مل جائے (فقال الضعفاء للذین استکبروا انا کنا لکم تبعاً فھل انتم مغنون عنا من عذاب الله من شیٔ)۔

لیکن وہ کہیں گے: اس کیفرِ کردار اور عذاب سے اگر خدا ہماری ہدایت نجات کی طرف کرتا تو ہم بھی تمہاری راہنمائی کرتے (قالوا لو ھدانا الله لھدینا کم)۔

لیکن افسوس کہ معاملہ اس سے آگے نکل چکا ہے" چاہے ہم بے قرار ہوں اور جزع فزع کریں چاہے صبر کریں ہمارے لیے کوئی راہِ نجات نہیں ہے" (سواء علینا اجزعنا ام صبرنا مالنا من محیص)۔

چند اہم نکات

۱۔ ایک اشکال کی وضاحت: اس آیت کے سلسلے میں جو پہلا سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ کیا لوگ اس جہان میں علمِ خدا کے سامنے ظاہر نہیں ہیں کہ جو مذکورہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں سب کے سب بارگاہِ خدا میں ظاہر ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ وہ خود اور ان کے سب اعمال بارگاہِ خدا میں ظاہر ہیں لیکن قیامت میں یہ ظہور سب محسوس کریں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں مراد قبروں سے نکلنا اور حساب و کتاب کے لیے عدلِ الٰہی کی عدالت کے سامنے پیش ہونا ہے۔

یہ دونوں تفسیریں خوب ہیں اور کوئی مانع نہیں کہ دونوں ہی آیت کے مفہوم میں داخل ہوں۔

۲۔ "لو ھدانا الله لھدینا کم" کا مفہوم: بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد اس جہان میں عذابِ الٰہی سے نجات کے طریقے کی ہدایت ہے کیونکہ یہ بات مستکبرین اپنے پیروکاروں کے جواب میں کہیں گے جب کہ پیروکار ان سے عذاب کا کچھ حصہ قبول کرنے کا تقاضا کریں گے۔ سوال و جواب کا تقاضا ہے کہ مراد عذاب سے رہائی کے طریقے کی ہدایت ہو۔

اتفاق سے یہی تعبیر (ھدایت) نعماتِ بہشت تک پہنچنے کے بارے میں بھی نظر آتی ہے۔ اہلِ جنت کی زبانی ہے:

وقالوا الحمد لله الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا الله

وہ کہیں گے: شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں ان نعمتوں کی طرف ہدایت کی ہے اور اگر اس کی توفیق و ہدایت نہ ہوتی تو ہمیں ان کی راہ نہ ملتی۔ (اعراف۔ ۴۳)

یہ احتمال بھی ہے کہ رہبرانِ ضلالت سے جب ان کے پیروکار تقاضا کریں گے تو اپنے تئیں گناہ سے بری کرنے کے لیے گمراہی کے تمام علمبرداروں کی طرح کہ جو اپنی خراب کاری دوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں، وہ بڑی ڈھٹائی سے کہیں گے، ہم کیا کریں اگر خدا ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کرتا تو ہم بھی تمہیں ہدایت کرتے یعنی ہم تو مجبور تھے اور ہمارا اپنا تو کوئی ارادہ ہی نہ تھا۔

یہی شیطان کی منطق ہے کہ جس نے اپنے آپ کو بری قرار دینے کے لیے خدائے عادل کی طرف جبر کی نسبت دیتے ہوئے کہا:

Marfat.com

فبما اغویتنی لاقعدن لھم صراطک المستقیم

اب جب کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے تو میں بھی تیرے سیدھے راستے میں بیٹھا ان کی تاک میں رہوں گا (اور انہیں منحرف کروں گا)

(اعراف - ۱۶)

لیکن توجہ رہے کہ مستکبرین چاہیں نہ چاہیں صریح آیاتِ قرآن اور واضح روایات کی رُو سے اپنے پیروکاروں کے گناہ کی ذمہ داری کا بوجھ بہرحال انہیں اپنے کندھوں پر اٹھانا ہو گا کیونکہ وہ انحراف کے بانی اور گمراہی کے عامل تھے البتہ پیروکاروں کی ذمہ داری اور عذاب و سزا میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی۔

۳۔ اندھی تقلید کی مذمت: مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ:

اوّلاً۔ وہ لوگ جو آنکھ کان بند کر کے اِس کے اور اُس کے پیچھے لگ جاتے ہیں گویا ہر شخص کے ہاتھ اپنی باگ ڈور تھما دیتے ہیں وہ بے قعت اور بے حیثیت لوگ ہیں۔ قرآن ان کے لیے "ضعفاء" کا لفظ استعمال کرتا ہے

ثانیاً۔ اُن کا اور اُن کے پیشواؤں کا انجام ایک ہی ہے اور وہ بے چارے سخت ترین حالات میں بھی اپنے گمراہ رہبروں کا تعاون حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ اُن کے رہبر اُن کی سزا اور عذاب میں ذرہ بھر تخفیف نہیں کروا سکیں گے بلکہ شاید تمسخر سے انہیں جواب دیں گے کہ بے کار واویلا نہ کرو کیونکہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۴۔ "برزو" اور "محیص" کا مفہوم: "برزوا" دراصل "بروز" کے مادہ سے ظاہر ہونے اور پردے سے باہر آنے کے معنی میں ہے۔ نیز اس کا معنی میدانِ جنگ میں صف سے باہر نکل کر حریف کے مقابلے میں آکھڑے ہونا بھی ہے۔ اصطلاح میں یہ لفظ مبارزہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"محیص" "محص" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے عیب یا تکلیف سے نجات پانا۔

اس کے بعد جابروں، گنہگاروں اور شیطان کے پیروکاروں کی روزِ قیامت روحانی اور نفسیاتی عذاب اور سزا کا منظر پیش کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: اور جب صالح اور غیر صالح بندوں کا حساب کتاب ختم ہو جائے گا اور ہر ایک اپنے قطعی انجام کو پہنچ جائے گا تو شیطان اپنے پیروکاروں سے کہے گا کہ خدا نے تم سے حق وعدہ کیا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا (جیسا کہ تم خود جانتے ہو وہ فضول اور بے قیمت وعدہ تھا) پھر میں نے اپنے وعدے کے خلاف کیا (وقال الشیطٰن لما قضی الامر ان اللہ وعدکم وعد الحق ووعدتکم فاخلفتکم)۔

گویا اس طرح شیطان بھی دیگر راہِ ضلالت کے رہبر مستکبرین کا ہم آواز ہوتا ہے اور اپنے ان بدبخت پیروکاروں پر اپنی ملامت و سرزنش کے تیر چلاتا ہے۔ پھر مزید کہتا ہے، میں تم پر کوئی جبری طور پر مسلط نہ تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اپنی مرضی سے اسے قبول کیا (وما کان لی علیکم من سلطانٍ الا ان دعوتکم فاستجبتم لی)۔ لہٰذا مجھے سرزنش نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو کہ تم نے میری شیطنت آمیز اور ظاہر الفساد دعوت کو کیوں قبول کیا (فلا تلوموني ولوموا انفسکم)۔ تم نے خود یہ کام کیا ہے لہٰذا لعنت تم پر ہو۔

بہرحال "پروردگار کے قطعی حکم اور عذاب کے سامنے نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو" (ما انا بمصرخکم وما انتم بمصرخی)۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ تمہاری طرف سے مجھے شریک قرار دینے اور میری اطاعت کو اطاعتِ الٰہی کے ہم پلہ قرار دینے

Marfat.com

سے میں بیزار ہوں اور میں اس کا انکار کرتا ہوں (انی کفرت بما اشرکتمون من قبل)۔
اب میں سمجھا ہوں کہ "اسی اطاعت میں شرک کرنے نے" مجھے بھی بدبخت کیا ہے اور تمہیں بھی، وہی بدبختی اور بے چارگی کہ جس کی تلافی کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے، جان لو کہ "ظالموں کے لیے یقیناً دردناک عذاب ہے"۔ (ان الظالمین لھم عذاب الیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ شیطان کا اپنے پیروکاروں کو سخت جواب: لفظ "شیطان" کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے اور اس میں جنوں اور انسانوں میں سے تمام طاغوتی اور وسوسہ گر شامل ہیں لیکن اس آیت اور گزشتہ آیت میں جو قرائن موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یقیناً مراد شخصی طور پر ابلیس ہے کہ جو تمام شیطانوں کا گرو شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے تمام مفسرین نے اسی تفسیر کا انتخاب کیا ہے[1]

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ شیطانی وسوسے انسان کے اختیار وارادہ کو ہرگز سلب نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی حیثیت ایک دعوت دینے والے سے زیادہ نہیں اور یہ انسان ہے جو اپنے ارادے سے شیطان کی دعوت قبول کرتا ہے۔ البتہ ممکن ہے شیطانی کاموں کے لیے طبیعت ہموار ہو جانے اور انسانی مقاصد کے خلاف مسلسل کام کرنے سے انسان ایسے مقام تک جا پہنچے جس سے وسوسوں کے مقابل ایک طرح کی سلب اختیار کی حالت پیدا ہو جائے جیسے ہم بعض منشیات کے عادی لوگوں کو دیکھتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کا اصل سبب اختیاری ہے لہٰذا نتیجہ کچھ بھی ہو اختیاری ہی شمار ہوگا۔

سورہ نحل کی آیہ ۱۰۰ میں ہے:

انما سلطانہ علی الذین یتولونہ والذین ھم بہ مشرکون

شیطان کا تسلط صرف ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اپنے لیے اس کی سرپرستی قبول کر لی ہے اور جنہوں نے اطاعت میں اسے خدا کا شریک قرار دیا ہے۔

ضمناً شیطان ان لوگوں کو دندان شکن جواب دیتا ہے جو اپنے گناہ اس کی گردن پر ڈال دیتے ہیں، اپنے انحرافات کا عامل اسے شمار کرتے ہیں اور اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ شیطان بعض گنہگاروں کی اس عامیانہ منطق سے برائت کا اظہار کرتا ہے۔ دراصل انسان پر حقیقی تسلط اس کے ارادے اور عمل کا ہے نہ کسی اور چیز کا۔

۲۔ روزِ حشر شیطان کا اپنے پیروکاروں سے رابطہ: اس عظیم محضر میں شیطان کس طرح اپنے تمام پیروکاروں سے رابطہ قائم کرے گا اور کس طرح انہیں ملامت کرے گا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یقیناً خدا اسے یہ طاقت دے گا۔ دراصل شیطان کے پیروکاروں کے لیے یہ ایک طرح کا روحانی اور نفسیاتی عذاب ہے۔ یہ اس جہان میں اس راستے پر چلنے والوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے کہ وہ ابھی سے اپنا اور اپنے رہبر کا انجام دیکھ لیں۔ بہرحال خدا کسی طرح سے شیطان اور اس کے پیروؤں کے درمیان یہ ارتباط فراہم کرے گا۔

---

[1] "شیطان" کے معنی کے سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول ص۱۶۱ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

۳ ۔ گمراہی کے دیگر پیشواؤں کا طرزِ عمل : یہ امر جاذب نظر ہے کہ روزِ قیامت ایسی ملاقات صرف شیطان اور اس کے پیروکاروں کے درمیان نہ ہوگی بلکہ ضلالت و گمراہی کے تمام پیشوا اس جہاں میں ایسا ہی کریں گے ۔ وہ اپنے پیروکاروں کا ہاتھ (خود ان کی مرضی سے) پکڑیں گے ۔ انہیں بلاؤں اور بدبختیوں کی موجوں کی طرف کھینچ لے جائیں گے اور جب دیکھیں گے کہ حالات بُرے ہیں تو انہیں چھوڑ کر چلتے بنیں گے ۔ یہاں تک کہ ان سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور انہیں ملامت کریں گے ۔ بزبانِ اصطلاح انہیں دنیا و آخرت کے خسارے میں گرفتار کریں گے ۔

۴ ۔ "مصرخ" کا مطلب : "مصرخ" "اصراخ" کے مادہ سے اصل میں "صرخ" مدد کے لیے پکارنے اور فریاد کرنے کے معنی میں آیا ہے ۔ اس بنا پر "مصرخ" فریادرس کے معنی میں ہے اور "مستصرخ" اس شخص کے معنی میں ہے جو فریادرسی چاہے ۔

۵ ۔ شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد : شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد شرکِ اطاعت ہے نہ کہ شرکِ عبادت ۔

۶ ۔ "ان الظالمین لھم عذاب الیم" کس کا جملہ ہے : یہ جملہ شیطان کی باتوں کا آخری حصہ ہے یا پروردگار کی طرف سے مستقل جملہ ہے ۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے ۔ لیکن زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے مستقل جملہ ہے کہ جو شیطان کی اپنے پیروکاروں سے گفتگو کے بعد ایک اصلاحی و تربیتی درس کے طور پر آیا ہے ۔

زیرِ بحث آخری آیت میں سرکش و بے ایمان جابر افراد کی حالت اور ان کا دردناک انجام بیان کرنے کے بعد مومنین کی حالت اور ان کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اور جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح انجام دیئے وہ باغاتِ بہشت میں داخل ہوں گے ، وہ باغات کہ جن کے درختوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری ہیں (وادخل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات جنات تجری من تحتھا الانھار) وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے (خالدین فیھا باذن ربھم) ۔ اور وہاں ان کا تحیہ سلام ہے (تحیتھم فیھا سلام) ۔

"تحیت" دراصل "حیات" کے مادہ سے لیا گیا ہے ۔ بعد ازاں یہ لفظ افراد کی سلامتی اور حیات کی دعا کے لیے استعمال ہونے لگا ۔ ہر قسم کی سلام و دعا کہ جو ابتدائے ملاقات میں کہی جاتی ہے ، اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں "تحیت" وہ خوش آمدید اور درود و سلام ہے جو اللہ تعالٰی صاحبانِ ایمان پر بھیجتا ہے اور انہیں اپنی نعمتِ سلامتی کا ہم آغوش قرار دیتا ہے ۔

سلامتی — ہر قسم کی ناراحتی اور درد و غم سے سلامتی

سلامتی — ہر قسم کی جنگ و نزاع سے سلامتی

اس مفہوم کی بنا پر "تحیتھم" کی اضافت مفعول کی طرف ہے اور اس کا فاعل خدا تعالٰی ہے ۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مراد وہ تحیہ و سلام ہے جو مومنین ایک دوسرے سے کہیں گے یا فرشتے ان سے کہیں گے ۔

بہرحال لفظ "سلام" جو بطور مطلق آیا ہے ، اس کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ جو ہر قسم کی سلامتی پر محیط ہے اور ہر قسم کی ناراحتی اور تکلیف سے سلامتی پر مشتمل ہے چاہے روحانی ہو یا جسمانی [1]

---

[1] سلام و تحیت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد چہارم ، سورۂ نساء آیت ۸۶ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں (صفحہ ۱۹ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کیجئے) ۔

Marfat.com

۲۴۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ
اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝

۲۵۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

۲۶۔ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ
الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝

۲۷۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي
الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ڐ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۝

ترجمہ

۲۴۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے کلمہ طیبہ (اور گفتار پاکیزہ) کو پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے کہ جس کی جڑ (زمین میں) ثابت ہے اور جس کی شاخ آسمان میں ہے۔

۲۵۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے بروقت اپنے پھل دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

۲۶۔ اور (اسی طرح) کلمہ خبیثہ کو ناپاک درخت سے تشبیہ دی ہے کہ جو زمین سے اکھڑ چکا ہے اور اس کے لیے قرار و ثبات نہیں ہے۔

۲۷۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اللہ ان کی گفتار اور اعتقاد کے ثبات کی وجہ سے ثابت قدم رکھے گا، اس جہان میں بھی اور آخرت میں بھی۔ نیز اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے (اور ان سے اپنا لطف و کرم چھین لیتا ہے) اور خدا جو کام چاہے (اور قرین مصلحت سمجھے) انجام دیتا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

"شجرۂ طیبہ" اور "شجرۂ خبیثہ"

یہاں حق و باطل، ایمان و کفر اور طیب و خبیث کو ایک نہایت عمیق اور پرمعنی مثال کے ذریعے مجسم کرکے بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیات اس سلسلے کی گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تونے دیکھا نہیں کہ خدا نے کس طرح پاکیزہ کلام کے لیے مثال دی ہے اور اسے طیب و پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے (الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ)۔

پھر اس شجرہ طیبہ یعنی پاکیزہ و بابرکت درخت کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور مختصر عبارت میں اس کے تمام پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم قرآن میں موجود اس شجرہ طیبہ کی خصوصیات کا مطالعہ کریں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ "کلمہ طیبہ" سے کیا مراد ہے۔

بعض مفسرین نے اس کو کلمۂ توحید اور جملہ "لا الہ الا اللہ" سے تفسیر کی ہے جب کہ بعض دوسرے اسے اوامر و فرامین الٰہی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ بعض اسے ایمان سمجھتے ہیں کہ جو لا الٰہ الا اللہ کا معنی و مفہوم ہے۔ بعض دوسروں نے اس کی "مومن" سے تفسیر کی ہے اور بعض نے اس کا مفہوم اصلاحی و تربیتی روش اور لائحہ عمل بیان کیا ہے۔[1]

لیکن — "کلمہ طیبہ" کے مفہوم و معنی کی وسعت کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں یہ تمام تفاسیر شامل ہیں کیونکہ لفظ "کلمہ" کے وسیع معنی میں تمام موجودات شامل ہیں۔ اسی بناء پر مخلوقات کو "کلمۃ اللہ" کہا جاتا ہے۔[2]

نیز "طیب" ہر قسم کی پاک و پاکیزہ چیز کو کہتے ہیں۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ اس مثال کے مفہوم میں ہر پاک سنت، حکم، پروگرام، روش، عمل، انسان شامل ہے۔ مختصر یہ کہ ہر پاک و بابرکت موجود کلمہ طیبہ ہے اور یہ سب ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہیں کہ جس کی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ وہ موجود کہ جو نشو و نما کا حامل ہے نہ کہ بے روح، جامد اور بے حرکت ہے۔ بڑھنے اور پھلنے پھولنے والا ہے۔ دوسروں کی اور اپنی پرورش و اصلاح کرنے والا ہے۔ لفظ "شجرہ" اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

۲۔ یہ درخت پاک اور طیب ہے لیکن کس لحاظ سے، اس سلسلے میں کسی خاص پہلو کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ لہٰذا اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ہر پہلو سے پاکیزہ ہے۔ اس کا پھل پاکیزہ ہے، اس کے شگوفے اور پھول پاکیزہ ہیں، اس کا سایہ پاکیزہ ہے اور اس سے خارج ہونے والی گیس پاکیزہ ہے۔

---

[1] مجمع البیان، قرطبی، فی ظلال اور تفسیر کبیر از فخر رازی کی طرف رجوع کریں۔

[2] لفظ "کلمہ" اور اس کے مفہوم کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۵ میں سورہ انعام کی آیہ ۱۱۵ کے ذیل میں ہم بحث کر چکے ہیں (دیکھئے ص ۳۳۱ اردو ترجمہ)۔

Marfat.com

۳ - یہ درخت ایک منظم نظام کا حامل ہے۔ اس کی جڑ اور اس کی شاخوں میں سے ہر ایک کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اصولی طور پر اس میں جڑ اور شاخ کا وجود اس میں موجود منظم نظام کی دلیل ہے۔

۴ - اس کی جڑ اور ریشہ ثابت و مستحکم ہے۔ اس طرح سے کہ طوفان اور تند و تیز آندھیاں اسے اس کی جگہ سے اکھاڑ نہیں سکتیں۔ اس میں ایسی توانائی ہے کہ اس کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی شاخیں سورج کی کرنوں کے نیچے اور آزاد ہوا میں محفوظ ہیں کیونکہ جو شاخ جتنی اونچی ہو اسے اتنی ہی قوی تر جڑ کی ضرورت ہے (اصلها ثابت)۔

۵ - اس شجرۂ طیبہ کی شاخیں کسی پست اور محدود ماحول میں نہیں ہیں بلکہ وہ آسمان کی بلندیوں میں ہیں۔ یہ شاخیں ہوا کا سینہ چیر کر بلندی پر جا پہنچی ہیں۔ جی ہاں "اس کی شاخیں آسمان میں ہیں (وفرعها فی السماء)۔

واضح ہے کہ شاخیں جس قدر بلند ہوں گی، زمین کے گرد و غبار سے اتنی ہی دُور ہوں گی اور ان کے پھل اتنے ہی زیادہ پاکیزہ ہوں گے اور ایسی شاخیں سورج کی کرنوں اور پاکیزہ ہوا سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گی اور ان کا اثر طیب پھلوں پر بہتر ہوگا۔[۱]

۶ - یہ شجرۂ طیبہ — پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ یہ ان درختوں کی مانند نہیں کہ جو بے ثمر ہوتے ہیں" یہ درخت اپنا پھل دیتا ہے" (تؤتی اکلها)۔

۷ - اور یہ ایسا درخت ہے جو ایک یا دو فصلوں میں پھل نہیں دیتا بلکہ ہر موسم میں اس پر پھل لدے ہوتے ہیں تو جب بھی اس کی جانب ہاتھ بڑھائے محروم نہیں لوٹے گا (کل حین)۔

۸ - اس کا یہ پھل کسی پروگرام کے بغیر نہیں بلکہ قوانین فطرت کے مطابق سنتِ الٰہی کے تحت اور" اپنے پروردگار کے اذن سے" ہے اور سب کے لیے عام ہے (باذن ربها)۔

اس "شجرۂ طیبہ" کی یہ خصوصیات آپ کے سامنے ہیں اب غور کیجئے کہ یہ برکات کس درخت کو حاصل ہیں۔ یقیناً یہ خوبیاں اور برکتیں کلمۂ توحید اور اس کے معنی میں موجود ہیں، ایک موحد اور صاحبِ معرفت انسان کو حاصل ہیں اور ایک اصلاحی اور پاکیزہ لائحہ عمل میں موجود ہیں اور یہ سب مفاہیم محکم و ثابت جڑوں کے حامل ہیں، سب میں ایسی فراواں شاخیں ہیں جو آسمان سے باتیں کرنے والی ہیں اور مادی آلودگیوں اور کثافتوں سے دُور ہیں۔ سب ثمر آور، نور افشاں اور فیض بخش ہیں۔

جو شخص جس وقت بھی ان کے پاس آئے اور ہاتھ ان کے شاخسارِ وجود کی طرف پھیلائے ان کے لذیذ، معطر اور قوت بخش پھلوں سے اپنا دامنِ مراد بھرے گا۔ حوادث کی تیز آندھیاں اور سخت طوفان انہیں ان کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتے اور ان کا افق فکر چھوٹی سی دنیا میں محدود نہیں ہے وہ زمان و مکاں کے حجاب چاک کر کے ابدیت کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔

ان کا پروگرام ہوا و ہوس کے تابع نہیں بلکہ سب کے سب اذن پروردگار سے اس کے فرمان کے مطابق آگے بڑھتے اور حرکت کرتے ہیں اور یہی ان کے ثمر بخش ہونے کا سرچشمہ ہے۔

---

[۱] اسی تاثیر خصوصاً ایک درخت کے پھلوں پر خوب واضح ہے۔ وہ کہ جو درخت کی اُوپر کی شاخوں پر لگتے ہیں نیچے کی شاخوں پر لگنے والوں پھلوں کی نسبت تر اور خوب پکے ہوئے ہوتے ہیں اور زیادہ عمدہ ہوتے ہیں۔

Marfat.com

پروردگار کے ان کلمات طیبہ ــــ عظیم و باایمان جوانمردوں ــــ کی زندگی برکت کا باعث ہے اور ان کی موت حرکت کا سبب ہے، ان کے آثار، ان کے کلمات، ان کی باتیں، ان کے شاگرد، ان کی کتابیں، ان کی پُرافتخار تاریخ حتیٰ کہ ان کی خاموش قبریں سب کی سب الہام بخش سرچشمہ ہدایت، انسان ساز اور تربیت کنندہ ہیں۔

جی ہاں! "خدا اس طرح سے لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے کہ شاید وہ سمجھ جائیں" (ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون)۔

یہاں مفسرین کے درمیان ایک سوال پیدا ہوا اور وہ یہ کہ کیا کوئی درخت مذکورہ بالا صفات کا وجودِ خارجی رکھتا ہے کہ جس سے کلمہ طیبہ کو تشبیہ دی گئی ہے (ایسا درخت کہ جو سال بھر سرسبز رہے اور پھلوں سے لدا رہے)۔

بعض کا خیال ہے کہ ایسا درخت موجود ہے اور وہ کھجور کا درخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مجبوراً "کل حین" کی تفسیر چھ ماہ بیان کی ہے۔

لیکن کسی وجہ سے بھی ضروری نہیں کہ ہم اس قسم کے درخت کے وجود پر اصرار کریں بلکہ مختلف زبانوں میں ایسی بہت سی تشبیہیں موجود ہیں جو بالکل وجودِ خارجی نہیں رکھتیں مثلاً ہم کہتے ہیں کہ قرآن ایسے آفتاب کی مانند ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا (حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آفتاب ہمیشہ غروب کرتا ہے) یا کہا جاتا ہے کہ میرا ہجر ایسی رات کی طرح ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتی (حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر شب ختم ہو جاتی ہے)۔

بہرحال تشبیہ کا مقصد چونکہ حقائق کو مجسم کرنا ہے اور عقلی مسائل کو محسوس کے قالب میں ڈھالنا ہے لہٰذا ایسی تشبیہات میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ پوری طرح دلنشیں، مؤثر اور جاذب ہیں۔

اس کے باوجود دنیا میں ایسے درخت موجود ہیں جن کی شاخوں پر سے سارا سال پھل ختم نہیں ہوتے یہاں تک کہ ہم نے خود گرم علاقوں میں بعض ایسے درخت دیکھے ہیں کہ ان پر پھل بھی موجود تھا اور تازہ پھول بھی اُگے ہوتے تھے اور نئے پھل کے آثار بھی موجود تھے جب کہ موسم سردیوں کا تھا۔

مسائل سمجھنے اور افہام و تفہیم کا بہترین طریقہ چونکہ موازنہ کرنا ہے لہٰذا شجرہ طیبہ کے ذکر کے بعد بلا فاصلہ اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

رہی مثال کلمہ خبیثہ کی، تو وہ خبیث، ناپاک اور بے ریشہ درخت کی مانند ہے کہ جو زمین سے اکھڑ چکا ہے اور طوفان آتے ہیں تو روز زمانہ کسی اور کونے میں جا گرتا ہے اور اسے قرار و ثبات میسر نہیں (ومثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالھا من قرار)۔

"کلمہ خبیثہ" وہی کفر و شرک کا کلمہ ہے، گھٹیا، قبیح اور بری گفتار ہے، گمراہ کن اور غلط پروگرام ہے اور ناپاک و آلودہ انسان ہیں خلاصہ یہ کہ ہر خبیث اور ناپاک چیز کلمہ خبیثہ ہے۔

واضح ہے کہ ہر ناکارہ اور قبیح و منحوس درخت کہ جس کی جڑیں اکھڑ گئی ہوں اس میں نہ نشو و نما ہوگی، نہ ترقی و تکامل، نہ پھل پھول، نہ سایہ و منظر اور نہ ثبات و قرار۔ وہ تو ایک لکڑی ہے جو سوائے جلانے اور آگ لگانے کے کسی کام کی نہیں بلکہ راستے کی رکاوٹ ہے ایسا درخت کبھی گزند پہنچاتا اور مجروح کرتا ہے یا لوگوں کے لیے تکلیف و آزار کا باعث بنتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ شجرہ طیبہ کی تعریف میں قرآن تفصیل سے بات کرتا ہے لیکن جب شجرہ خبیثہ کے ذکر کا موقع آتا ہے تو ایک

Marfat.com

مختصر سا جملہ کہہ کر گزر جاتا ہے۔ صرف اتنا کہتا ہے۔

اجتثت من فوق الارض مالها من قرار

یہ زمین سے اکھڑا ہوا ہے اور اسے ثبات و قرار نہیں ہے۔

کیونکہ جس وقت یہ ثابت ہو گیا کہ یہ درخت جڑ کے بغیر ہے تو پھر شاخ و برگ اور پھل پھول کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں یہ ایک طرح کی لطافتِ بیان ہے کہ انسان محبوب کا ذکر کرتا ہے تو اس کی تمام خصوصیات بیان کرتا ہے لیکن جب "مبغوض" کے ذکر کا موقع آتا ہے تو بس ایک نفرت انگیز جملہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین اس درخت کے متعلق کہ جو مشبہ بہ کے طور پر آیا ہے کے بارے میں سوال اٹھاتے ہیں کہ یہ کونسا درخت ہے۔

بعض نے اسے حنظل سمجھا ہے کہ جس کا پھل بہت تلخ اور برا ہوتا ہے

بعض نے اسے "کشوث" (بروزن سقوط) کہا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ سا پودا ہے، جو بیابانوں میں خاردار بوٹوں سے لپٹ کر اوپر ملا جاتا ہے۔ نہ اس کی جڑ ہوتی ہے نہ پتے (توجہ رہے کہ "شجر" لغت میں درخت کو بھی کہا جاتا ہے اور پودے کو بھی)۔

لیکن جیسا کہ ہم نے "شجرہ طیبہ" کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر تشبیہ میں "مشبہ بہ" ان تمام صفات کے ساتھ وجودِ خارجی رکھتا ہو بلکہ یہاں مقصد کلمہ شرک، انحرافی طرزِ عمل اور خبیث لوگوں کے حقیقی چہرہ کو مجسم طور پر پیش کرنا ہے اور بتانا ہے کہ وہ ان درختوں کی طرح ہیں جن کی ہر چیز خبیث اور ناپاک ہے اور ان کا ثمر سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ راستے میں مزاحم ہوتے ہیں اور دردِ سر کا باعث بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے ناپاک درخت کم نہیں کہ جو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے ہوں اور بیابان میں طوفان اور تیز آندھی کی زد پر ہوں۔

مذکورہ بالا آیات میں دو ناطق مثالوں کے ذریعے ایمان و کفر، مومن و کافر اور کلی طور پر ہر پاک و ناپاک وجود کو مجسم شکل میں ذکر کیا گیا ہے لہٰذا آخری زیرِ نظر آیت میں نتیجہ کار اور ان کا انجام آخر ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ایمان لانے والوں کو خدا ان کی ثابت و پائدار گفتار و اعتقاد کے سبب ثابت قدم رکھتا ہے، اس جہاں میں بھی اور اُس جہاں میں بھی (یثبت الله الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیٰوة الدنیا و فی الاٰخرة)۔ کیونکہ ان کا ایمان سطحی اور متزلزل نہیں ہوتا نہ ان کی شخصیت کھوکھلی اور متلون ہوتی ہے بلکہ وہ ایک شجرہ طیبہ ہیں کہ جس کی جڑیں ثابت و پائدار ہیں اور جس کی شاخیں آسمان کی طرح بلند ہیں اور چونکہ کوئی شخص لطفِ خدا سے بے نیاز نہیں، دوسرے لفظوں میں ہر نعمت بالآخر اس کی ذاتِ پاک کی طرف لوٹتی ہے لہٰذا ایسے ثابت قدم مومنین لطفِ خدا کے بھروسہ پر ہر حادثے کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح استقامت دکھاتے ہیں۔ لغزش کہ جس سے زندگی میں بچا نہیں جا سکتا ان کے راستے میں آتی ہے تو خدا ان کی حفاظت کرتا ہے۔ شیاطین ہر طرف سے انہیں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس دنیا کی زرق برق چیزوں کے ذریعے انہیں پھسلانے کی سعی کرتے ہیں مگر ان کا خدا انہیں محفوظ رکھتا ہے۔ جہنمی طاقتیں اور سنگدل ظالم انہیں طرح طرح کی دھمکیوں کے ذریعے جھکانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ انہیں ثباتِ قدم عطا کرتا ہے کیونکہ ان کی جڑ اور بنیاد ثابت و مستحکم ہوتی ہے۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ یہ خدائی حفاظت و ثبات ان کی ساری زندگی پر محیط ہے۔ اس جہاں کی زندگی پر بھی اور اُس جہاں کی زندگی پر بھی۔ یہاں وہ ایمان و پاکیزگی پر باقی رہتے ہیں اور ان کا دامن آلودگیوں کے عار و ننگ سے پاک ہوتا ہے اور وہاں وہ خدا تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں

Marfat.com

میں ہمیشہ رہیں گے۔

پھر ان کے مقابل افراد کے بارے میں فرمایا گیا ہے: اور خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے (ویضل الله الظالمین و یفعل الله ما یشاء)۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ جہاں جہاں بھی ہدایت وضلالت کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے اس کے لیے پہلے انسان خود قدم اٹھاتا ہے۔ خدا کا کام تو تاثیر پیدا کرنا ہے جو اس نے ہر عمل میں کی ہے نیز خدا کا کام نعمتیں عطا کرنا اور انہیں سلب کرنا ہے اور ایسا وہ اہلیت اور عدم اہلیت کی بنا پر کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔

"یضل الله" کے بعد "ظالمین" کی تعبیر اس امر کے لیے بہترین قرینہ ہے یعنی جب تک کوئی شخص ظلم وستم سے آلودہ نہ ہو اس سے نعمتِ ہدایت سلب نہیں ہوگی لیکن جب کوئی ظلم وستم سے آلودہ ہو جاتا تو گناہ کی تاریکی اس کے وجود پر چھا جاتی ہے اور ہدایتِ الٰہی کا نور اس کے دل سے نکل جاتا ہے اور یہ بالکل ارادہ واختیار کی آزادی ہے۔ ایسا شخص اگر فوری طور پر اپنی سمت درست کرلے تو نجات کا راستہ اس کے سامنے کھلا ہوا ہے لیکن گناہ میں مستحکم ہو جانے کے بعد پلٹنا بہت ہی مشکل ہے

چند اہم نکات

۱۔ **کیا آخرت سے مراد قبر ہے؟** بہت سی روایات میں ہے کہ جب انسان قبر میں پہنچتا ہے اور فرشتے اس سے اس کی حقیقت کے متعلق سوال کرتے ہیں تو اللہ تعالٰی اسے ایمان کے راستے پر ثابت قدم رکھتا ہے اور اس کا یہی معنی ہے:

یثبت الله الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیٰوة الدنیا وفی الاٰخرة

ان میں سے بعض روایات میں صراحت کے ساتھ لفظ "قبر" آیا ہے[1] جب کہ بعض دوسری روایات میں ہے کہ شیطان موت کے وقت صاحبِ ایمان کے پاس آتا ہے اور کبھی داہنی طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے اسے گمراہ کرنے کے لیے وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن خدا اسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ مومن کو گمراہ کرے "یثبت الله الذین اٰمنوا ......" کا یہی مفہوم ہے۔

امام صادق علیہ السلام کی اس روایت کا بھی یہی مفہوم ہے:

ان الشیطان لیاتی الرجل من اولیاءنا عند موته عن یمینه وعن شماله لیضله عما هو علیه فیأبی الله عز وجل له ذٰلك قول الله عز وجل یثبت الله الذین اٰمنوا بالقول الثابت فی الحیٰوة الدنیا وفی الاٰخرة[2]

مفسرِ عظیم طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ دار آخرت نہ لغزش کی جگہ ہے اور نہ عمل کی بلکہ صرف نتائج اعمال کا سامنا کرنے کا مقام ہے۔ لیکن وہ لمحہ کہ جب موت آپہنچے اور حتیٰ کہ عالم برزخ (وہ جہان کہ جو اس عالم اور عالم آخرت کے درمیان ہے) میں تھوڑا بہت لغزش کا امکان ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں لطفِ الٰہی انسان کی مدد کو آپہنچتا ہے، اس کی

---

[1] و [2] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۴۰، ۵۴۱ و ۵۴۱۔

Marfat.com

حفاظت کرتا ہے اور اسے ثابت قدم رکھتا ہے۔

۲۔ ثبات واستقامت کا اثر: شجرہ طیبہ اور شجرہ خبیثہ کی تمام صفات میں سے کہ جو مندرجہ بالا آیات میں ذکر ہوئی ہیں سب سے زیادہ ثبات و عدم ثبات کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ شجرہ طیبہ کے ثمر کے طور پر آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خدا صاحب ایمان افراد کو اپنے ثابت و محکم عقیدے کی بنا پر دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ اس سے ثبات اور اس کی تاثیر کے مسئلے کی انتہائی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

عظیم لوگوں کی کامیابی کے عوامل کے بارے میں بہت گفتگو ہوتی ہے لیکن ان تمام میں سے استقامت و پامردی کا درجہ پہلا ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سمجھ بوجھ اور استعداد کے لحاظ سے درمیانے درجے کے ہوتے ہیں یا عمل میں پیش قدمی کے لحاظ سے اوسط درجے کے ہوتے ہیں لیکن انہیں زندگی میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ان کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کی کامیابیوں کی وجہ ثبات واستقامت کے سوا اور کچھ نہیں۔

اجتماعی لحاظ سے ہر مؤثر پروگرام کی پیش رفت صرف ثبات و استقامت کے سائے میں ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخریب کاروں کی تمام تر کوشش ثبات و استقامت کو ختم کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ اصولی طور پر حقیقی مومنین کو زندگی کے سخت حوادث اور طوفانوں کے مقابلے میں ان کے ثبات و استقامت کے حوالے سے پہچاننا چاہیے۔

۳۔ روایاتِ اسلامی میں شجرہ طیبہ اور شجرہ خبیثہ: جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ "طیبہ" اور "خبیثہ" کہ جنہیں دو درختوں سے تشبیہ دی گئی ہے ایک وسیع مفہوم رکھتے ہیں اور یہ ہر طرح کے شخص، پروگرام، مکتب، فکر و نظر، سوچ بچار اور گفتار و عمل پر محیط ہے لیکن بعض اسلامی روایات میں ان کی خاص حوالوں سے تفسیر کی گئی ہے۔ واضح ہے کہ مفہوم آیت ان میں منحصر نہیں ہے۔

ان میں سے ایک روایت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے آپ "اصلها ثابت و فرعها فی السماء" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

رسول الله اصلها و امیر المؤمنین فرعها،
والائمة من ذریتهما اغصانها، وعلم الائمة ثمرها، و شیعتهم
المؤمنون ورقها، هل فیها فضل؟
قال: قلت لا و الله،
قال و الله ان المؤمن لیولد فتورق ورقة فیها و ان المؤمن لیموت فتسقط
ورقة منها.

رسول اللہ اس درخت کی جڑ ہیں۔ امیر المومنین علیؑ اس کا تنا ہیں اور وہ امام جو ان دونوں کی ذریت میں سے ہیں اس کی ٹہنیاں ہیں۔ ائمہ کا علم اس درخت کا پھل ہے اور ان کے صاحبِ ایمان شیعہ اس کے پتے ہیں۔

پھر امام نے فرمایا کیا کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے؟

راوی کہتا ہے: میں نے کہا نہیں، خدا کی قسم۔

Marfat.com

فرمایا: واللہ جس وقت ایک صاحبِ ایمان پیدا ہوتا ہے تو اس درخت پر ایک پتے کا اضافہ ہو جاتا ہے اور جس وقت کوئی حقیقی مومن مر جاتا ہے تو اس درخت کا ایک پتہ گر جاتا ہے[1]

ایک اور روایت میں یہی مضمون امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ اس میں ہے:

راوی نے سوال کیا: "توٴتی اکلها کل حین باذن ربها" کا کیا مفہوم ہے۔

امام نے فرمایا: آئمہ کے علم کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر سال اور ہر علاقے میں تم تک آ پہنچتا ہے[2]

ایک اور روایت میں ہے:

"شجرہ طیبہ" رسول اللہ، علی، فاطمہ، حسن اور حسین اور ان کے فرزندانِ گرامی ہیں اور "شجرہ خبیثہ" بنی اُمیہ ہیں[3]

نیز بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ "شجرہ طیبہ" کھجور کا درخت ہے اور "شجرہ خبیثہ" حنظل (تمّہ) کا درخت ہے[4]

بہر حال ان تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اور جو کچھ ہم نے آیہ کے عمومی معنی میں ذکر کیا ہے اس میں ہم آہنگی موجود ہے کیونکہ یہ تو اس عمومی مفہوم کے مصادیق میں سے ہیں

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۵۲۵۔

[2] و [3] نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۵۳۵ و صفحہ ۵۳۸۔

[4] المیزان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ تفسیر درِ منثور۔

Marfat.com

۲۸۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ
دَارَ الْبَوَارِ ۝

۲۹۔ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۗ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝

۳۰۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ
مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝

ترجمہ

۲۸۔ کیا تو نے (انہیں) نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمت کو ناشکری میں بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے کی طرف کھینچ لے گئے۔

۲۹۔ (دار البوار وہی) جہنم ہے کہ جس کی آگ میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

۳۰۔ انہوں نے خدا کے ہمسر قرار دیئے تاکہ (لوگوں کو) اس کی راہ سے (منحرف اور) گمراہ کریں۔ ان سے کہہ دو (کہ چند دن) دنیا کی زندگی (اور اس کی لذتوں سے) فائدہ اُٹھا لو مگر بالآخر تمہیں (جہنم کی) آگ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تفسیر

کفرانِ نعمت کا انجام

ان آیات میں رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ دراصل ان میں شجرۂ خبیثہ کے ایک موقع کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے نعمتِ خدا کو کفران میں تبدیل کر دیا ہے (الم تر الی الذین بدلوا نعمۃ اللہ کفرًا) اور بالآخر انہوں نے اپنی قوم کو دار البوار اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا (و احلوا قومھم دار البوار)۔

یہ وہی شجرۂ خبیثہ کی جڑیں اور کفر و انحراف کے رہبر ہیں جن کے دامن میں نعمتیں تھیں مثلاً وجودِ پیغمبرؐ کی سی نعمت کہ جس سے بڑھ کر کوئی نعمت

Marfat.com

نہتی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ان سے استفادہ کرتے اور شب بھر میں سو سال کی مسافت طے کر لیتے لیکن اندھے تعصب، ہٹ دھرمی، خود غرضی اور خود پسندی کے سبب وہ اس عظیم ترین نعمت سے استفادہ نہ کر سکے۔ وہ نہ فقط خود کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوئے بلکہ اپنی قوم کو بھی وسوسہ میں مبتلا کیا اور ہلاکت و بدبختی کی انہیں سوغات دی۔

بزرگ مفسرین نے منابعِ اسلامی میں آنے والی روایات کے پیشِ نظر کبھی اس نعمت کو وجودِ پیغمبرؐ کہا ہے، کبھی آئمہ اہلِ بیتؑ اور کفرانِ نعمت کرنے والے کبھی بنو امیہ قرار دیئے ہیں کبھی بنی مغیرہ اور کبھی زمانۂ پیغمبرؐ کے سب کفار لیکن آیت کا مفہوم یقیناً وسیع ہے اور یہ کسی معین گروہ کے لیے مختص نہیں ہے اور اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خدا کی کسی نعمت کا کفران کریں۔

ضمناً مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ خدائی نعمتوں خصوصاً عظیم ہادیوں کی رہبری کی نعمت کہ جو اہم ترین نعمتوں میں سے ہے، سے استفادہ کرنا خود انسان کے فائدے میں ہے۔ اب ان نعمتوں کا کفران اور آخری رہبری سے منہ پھیرنا سوائے ہلاکت اور دارالبوار میں گرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن "دارالبوار" کی تفسیر کرتا ہے: یہ جہنم ہے کہ وہ جس کے جلا ڈالنے والے شعلوں میں جا گریں گے اور یہ بدترین ٹھکانا ہے (جھنم یصلونھا و بئس القرار)۔[1]

اگلی آیت میں کفرانِ نعمت کی ایک بدترین قسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ جس کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: انہوں نے خدا کے لیے شریک قرار دیئے تا کہ اس طریقے سے لوگوں کو اس کی راہ سے گمراہ کریں (وجعلوا للہ انداداً لیضلوا عن سبیلہ)۔

شرک و کفر اختیار کر کے اور لوگوں کو دین و طریقِ حق سے منحرف کر کے وہ لوگوں پر چند روزہ مادی اقتدار حاصل کرتے ہیں۔

اے رسول! ان سے کہو: اس ناپائیدار اور بے وقعت مادی زندگی سے فائدہ اٹھا لو لیکن یہ جان لو کہ تمہارا انجام کار آگ ہے (قل تمتعوا فان مصیرکم الی النار)۔

نہ تمہاری یہ زندگی کوئی زندگی ہے بلکہ بدبختی ہے اور نہ تمہارا یہ اقتدار کوئی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تباہ کاری اور مصیبت ہے لیکن اس کے باوجود اپنے انجام کے بدلے تم اس سے فائدہ اٹھا لو۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے:

قل تمتع بکفرك قلیلاً انك من اصحاب النار

کہہ دو: اپنے کفر سے تھوڑا سا فائدہ اٹھا لے آخرکار تو اصحابِ نار میں سے ہے۔ (زمر — ۸)

چند اہم نکات

۱۔ **نعمت کو کفر میں بدل دیا:** عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے نعمتِ الٰہی کا کفران کیا لیکن زیرِ بحث آیت میں ہے: انہوں نے نعمتِ خدا کو کفر میں تبدیل کیا اور کفران کیا۔ ہو سکتا ہے یہ خاص تعبیر دو میں ایک وجہ کی بنا پر ہو:

---

[1] یصلون " صلی" کے مادہ سے آگ جلانے، آگ میں جلنے، آگ میں مبتلا ہونے اور آگ میں جل کر کباب ہونے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

الف مراد ہے "شکر نعمت" کو "کفران" میں تبدیل کرنا یعنی ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ پروردگار کی نعمتوں پر شکرگزار ہوں لیکن انہوں نے اس شکر کو کفران میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت میں لفظ شکر مقدر ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا:

الذین بدلوا شکر نعمۃ اللہ کفرا

ب مراد یہ ہے کہ انہوں نے خود نعمت کو کفر میں تبدیل کر دیا۔ درحقیقت خدائی نعمتیں وسیلہ ہیں۔ ان سے استفادہ کا طریقہ خود انسان کے ارادہ سے وابستہ ہے۔ جیسا کہ ممکن ہے نعمتوں سے ایمان، خوش بختی اور نیکی کی راہ میں فائدہ اٹھایا جائے اسی طرح انہیں کفر، ظلم اور برائی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یہ نعمتیں خام مال کی طرح ہیں جن سے مختلف قسم کی چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں اگرچہ اصل میں یہ خیر و سعادت کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

۲۔ **نعمت سے سوئے استفادہ کفرانِ نعمت ہے:** کفرانِ نعمت صرف یہ نہیں کہ انسان خدا کی ناشکری کرے بلکہ نعمت سے ہر طرح کا انحرافی فائدہ حاصل کرنا اور سوئے استفادہ کفرانِ نعمت ہے۔ اصولی طور پر کفرانِ نعمت کی حقیقت یہی ہے۔ ناشکری اور شکر ادا نہ کرنا تو دوسرے مرحلے کی بات ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ نعمت کو اس مقصد کے مطابق صرف نہ کرنا جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے کفرانِ نعمت ہے اور زبانی شکرگزاری ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ ہزار مرتبہ زبان سے "الحمد للہ" کہیں لیکن عملی طور پر نعمت سے سوءِ استفادہ کریں تو کفرانِ نعمت اور کیا ہے۔

دورِ حاضر میں نعمت کو کفران میں تبدیل کرنے کے انتہائی واضح نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

فطرت کی بہت سی قوتیں انسان کی خداداد بصیرت اور پیش قدمی کی وجہ سے انسان کے ہاتھ لگی ہیں اور ان سے فائدہ حاصل کرنا اب انسان کی دسترس میں ہے۔

سائنسی انکشافات اور صنعتی ایجادات نے پوری دنیا کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ ان انکشافات و ایجادات نے انسان کے کندھوں سے بہت بھاری بوجھ اتار کر کارخانوں کے پہیوں پر ڈال دیا ہے۔ آج نعماتِ الٰہی ہر دور سے زیادہ ہیں۔ آج انسان اپنے افکار اور علم کو پوری دنیا میں پھیلا سکتا ہے۔ ساری دنیا کی خبروں سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ اس دور میں لوگ ہر زمانے سے زیادہ خوشحال ہوتے، مادی لحاظ سے بھی اور روحانی لحاظ سے بھی۔

آج خدا کی ان عظیم نعمتوں کو کفر میں تبدیل کرنے کا راستہ اپنایا گیا ہے۔ مادے کی عجیب و غریب توانائیوں کو ظلم و طغیان کی راہ میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ انکشافات و ایجادات کو برائی اور تخریبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہر نیا صنعتی شاہکار پہلے تخریبی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کے تعمیری پہلو کی نوبت بعد کی بات ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ عظیم ناشکری ہے جو انبیاء الٰہی کی اصلاحی اور تربیتی تعلیمات سے دور رہنے کا نتیجہ ہے اور ایسا کرنے والے اپنی قوم کو نعماتِ الٰہی کا کفران کر کے اسے دارالبوار کی طرف کھینچے لے جا رہے ہیں۔

۳۔ **"انداد" کا مفہوم:** "انداد" جمع ہے "ند" کی۔ اس کا معنی ہے "مثل"، لیکن جیسا کہ راغب نے مفردات میں اور زبیدی نے تاج العروس میں (بعض اہلِ لغت سے) نقل کیا ہے "ند" اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دوسری چیز سے شباہت جوہری رکھتی ہو لیکن "مثل" کا اطلاق ہر قسم کی شباہت پر ہوتا ہے۔ لہٰذا "ند" کا استعمال "مثل" کی نسبت زیادہ عمیق، رسا اور عمدہ ہے۔

Marfat.com

اس معنی کے مطابق زیرِ نظر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ کفر کی کوشش تھی کہ خدا کے کچھ ایسے شریک بنائیں کہ جنہیں جو ہر ذات میں خدا کا شبیہ قرار دیں تاکہ مخلوق کو خدا کی پرستش سے روک سکیں اور اس طرح اپنے منحوس مقاصد پورے کر سکیں۔

بعض اوقات وہ قربانیوں کا کچھ حصہ ان کے لیے قرار دیتے اور کبھی نعمات الٰہی کا کچھ حصہ (جیسے بعض جانور) بتوں کے لیے مخصوص کر دیتے اور کبھی پرستش و عبادت کے ذریعے انہیں خدا کا ہم پلہ خیال کرتے۔ سب سے بڑھ کر وقیح و قبیح یہ بات تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں مراسمِ حج میں کہ جو دینِ ابراہیمی کے مطابق تھا اس میں انہوں نے بہت سی خرافات شامل کر دی تھیں یہاں تک کہ "لبیک" کہتے ہوئے یوں کہتے تھے؛

لبیک لا شریک لک،

لا شریک ھو لک،

تملکہ و ما ملک۔

میں تیری دعوت کو قبول کرتا ہوں، اے خدا جس کا کوئی شریک نہیں۔

سوائے اس شریک کے کہ جو تیرا شریک ہے۔

اس کا بھی تو مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی[1]

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

۳۱۔ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ
لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ○
۳۲۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ
الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ○
۳۳۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ
الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ○
۳۴۔ وَ اٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ○

ترجمہ

۳۱۔ میرے ان بندوں سے کہہ دو کہ جو ایمان لائے ہیں کہ نماز قائم کریں اور ہم نے جو انہیں روزی دی ہے اُس میں سے پنہاں و آشکار انفاق کریں، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ جس میں خرید و فروخت ہے نہ دوستی (نہ مال کے ذریعے عذابِ خدا سے نجات مل سکے گی اور نہ کسی اور مادی رشتے سے)۔

۳۲۔ اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمان سے پانی نازل کیا ہے اس کے ذریعے تمہارے رزق کے طور پر پھل اُگائے ہیں اور کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ وہ اس کے حکم سے صفحۂ دریا پر چلے اور نہریں بھی تمہارے لیے مسخر کی ہیں۔

Marfat.com

۳۳۔ منظم پروگرام کے ماتحت کام کرنے والے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور رات اور دن کو (بھی) تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔

۳۴۔ اور تم نے جس چیز کا اس سے تقاضا کیا تھا وہ اُس نے تمہیں دے دی اور نعمات الٰہی کا شمار کرنے لگو تو ہرگز شمار نہیں کر سکو گے انسان ستمگر اور کفران کرنے والا ہے۔

تفسیر

قرآن کی نگاہ میں انسان کی عظمت

گزشتہ آیات میں مشرکین اور ان لوگوں کے طرز عمل کے بارے میں گفتگو تھی کہ جنہوں نے نعمات الٰہی کا کفران کیا اور آخر کار دارالبوار کی طرف کھینچے گئے۔ زیر نظر آیات میں خدا کے سچے بندوں کا ذکر ہے اور اللہ کی بندوں پر نازل ہونے والی غیر متناہی نعمات کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار خرچ کریں (قل لعبادی الذین اٰمنوا یقیموا الصلوٰۃ و ینفقوا مما رزقنٰھم سرًّا و علانیۃ) اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ جس میں نہ خرید و فروخت ہے کہ اس طرح عذاب سے نجات کے لیے راہِ سعادت خرید سکیں اور نہ وہاں کسی کی دوستی کام آئے گی (من قبل ان یأتی یوم لا بیع فیہ ولا خلٰل)۔

اس کے بعد معرفتِ خدا کے لیے اس کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے ایسی معرفت کہ جس سے دلوں میں اُس کا عشق زندہ ہو جائے نیز انسان کو اس کی عظمت اور اس کے لطف کے حوالے سے اس کی تعظیم پر ابھارا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک فطری امر ہے کہ مدد اور لطف و رحمت کرنے والے سے انسان کے دل میں لگاؤ اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ یہی بات چند ایک آیات میں یہاں اس طرح بیان کی گئی ہے:

خدا وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (اللہ الذی خلق السمٰوٰت و الارض) اور اُس نے آسمان سے پانی نازل کیا جس کے ذریعے تمہاری روزی کے لیے مختلف ثمرات پیدا ہوتے ہیں (و انزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقًا لکم)۔

اور اُس نے تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا، اس کی ساخت کے مواد کے لحاظ سے بھی کہ جسے طبیعتِ مادہ سے پیدا کیا اور سمندروں پر منظم ہواؤں کی صورت میں اس کی قوت محرکہ کے لحاظ سے بھی (و سخر لکم الفلک) تاکہ یہ کشتیاں اس کے حکم سے سطح سمندر پر چلیں اور پانی کا سینہ چیر کر ساحلِ مقصود کی طرف بڑھیں اور انسانوں اور اُن کے وسائل ایک سے دوسری جگہ کی طرف آسانی سے اٹھائے جائیں (لتجری فی البحر بامرہ)۔

اسی طرح "نہریں بھی تمہارے لیے مسخر کر دی گئیں" (و سخر لکم الانھار)۔ تاکہ ان کے حیات بخش پانی سے تم اپنی فصلوں کی

Marfat.com

آبیاری کرو اور تم خود اور تمہارے مویشی اس سے سیراب ہوں۔ نیز اکثر اوقات کے لیے سطح آب کو ہموار رکھا گیا ہے تاکہ چھوٹی بڑی کشتیاں اس میں آمد و رفت کر سکیں۔ نیز یہ نہریں مسخر کی گئی ہیں تاکہ تم ان کی مچھلیوں بلکہ یہاں تک کہ ان کی گہرائیوں میں موجود اصداف سے استفادہ کر سکو۔

نہ صرف زمینی موجودات کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے بلکہ سورج اور چاند کو جو ہمیشہ مصروفِ کار ہیں انہیں تمہارے فرمان کے زیرِ گردش قرار دیا ہے (وسخر لکم الشمس والقمر دائبین[1])۔

نہ صرف اس جہان کے موجودات کو تمہارے زیرِ فرمان کر دیا گیا ہے بلکہ اُن کے عارضی حالات کو بھی تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے جیسا کہ "رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے" (وسخر لکم الیل والنہار)۔

اور تم نے جس چیز کا اُس سے تقاضا کیا اور فرد اور معاشرے کی روح اور بدن کے لیے تمہیں جس چیز کی احتیاج ہوئی یا اپنی سعادت کے لیے تمہیں جس چیز کی ضرورت پڑی وہ سب کچھ اُس نے تمہارے اختیار میں دے دیا (واتاکم من کل ما سألتموہ)۔

اور اس طرح سے "اگر تم خدائی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہ کر سکو گے" (وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا)۔ کیونکہ پروردگار کی مادی و روحانی نعمتوں نے تمہارے وجود اور محیطِ زندگی کو اس طرح سے گھیر رکھا ہے کہ ان کا شمار ممکن نہیں اور جن خدائی نعمتوں کو تم جانتے ہو وہ ان کے مقابلے میں جنہیں تم نہیں جانتے دریا کے مقابلے میں قطرے کی مانند ہیں لیکن خدا کے اس تمام لطف و رحمت کے باوجود یہ انسان ظالم ہے اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہے (ان الانسان لظلوم کفار)۔

انسان کو ایسی نعمتیں عطا کی گئی ہیں کہ اگر وہ ان سے صحیح طریقے سے استفادہ کرتا تو سارے جہاں کو گلستان بنا دیتا اور "مدینہ فاضلہ" کی تشکیل کا خواب پورا ہو جاتا لیکن سوئے استفادہ، ظلم و ستم اور کفرانِ نعمت کے سبب وہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اس کی زندگی کا افق تاریک ہو گیا، شہدِ حیات اس کے دہن میں جاں گداز زہر بن چکا ہے اور طاقت فرسا مشکلات نے طوق و زنجیر بن کے اُسے جکڑ رکھا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **خالق اور مخلوق سے رشتہ:** ان آیات میں ایک مرتبہ پھر سچے مومنین کے لائحہ عمل میں سے "نماز" اور "انفاق" کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ابتدائی نظر سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام عملی پروگراموں میں سے یہاں صرف دو کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے۔

اس کی علت یہ ہے کہ اسلام کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کا خلاصہ تین میں پیش کیا جا سکتا ہے:

(۱) انسان کا خدا سے رابطہ۔

(۲) انسان کا مخلوقِ خدا سے رابطہ۔

(۳) انسان کا اپنی ذات سے رابطہ۔

---

[1] "دائبین" "دؤب" کے مادہ سے ایک عادت کے مطابق یا محکم سنت کے مطابق کام جاری رکھنے کے معنی میں ہے۔ سورج اور چاند چونکہ لاکھوں سال سے ایک معین و مستحکم طریقے سے نور افشانی کرنے، زندہ موجودات کی پرورش کرنے، سمندروں میں مدوجزر پیدا کرنے اور کئی دوسری خدمات میں مصروف ہیں لہٰذا ان کے لیے "دائبین" سے بہتر تعبیر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

درحقیقت تیسرا حصہ پہلے اور دوسرے حصے کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ دو پروگرام (نماز اور انفاق) دراصل انہی دو حصوں میں سے ایک ایک کی طرف اشارہ ہیں۔

نماز اللہ سے ہر قسم کے رابطے کا مظہر ہے کیونکہ نماز کے دوران یہ رابطہ ہر دوسرے عمل کی نسبت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ جب کہ انفاق مخلوقِ خدا سے رشتے کی طرف اشارہ ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر نعمتِ رزق میں سے انفاق کا وسیع مفہوم پیشِ نظر رکھا جائے جس میں ہر طرح کی مادی و روحانی نعمت شامل ہے۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس سورہ کی بحث جاری ہے وہ مکی ہے اور اس کے نزول کے وقت ابھی زکوٰۃ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس انفاق کو زکوٰۃ سے مربوط نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں نزولِ حکم کے بعد زکوٰۃ بھی شامل ہے۔

بہرحال ایمان اسی صورت میں حقیقی قرار پا سکتا ہے کہ جب وہ عمل میں ظاہر ہو اور ایک طرف انسان کو اللہ کے قریب کرے اور دوسری طرف اس کے بندوں کے نزدیک کرے۔

۲۔ **انفاق پنہاں اور آشکار کیوں؟** ہم بارہا قرآنی آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ سچے مومنین پنہاں بھی انفاق اور صدقہ کرتے ہیں اور آشکار بھی۔ اس طرح سے انفاق کا وسیع معنی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کیفیت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کیونکہ بعض اوقات مخفی انفاق زیادہ مؤثر اور زیادہ آبرو مندانہ ہوتا ہے اور بعض اوقات آشکار ہو تو دوسروں کی تشویق کا باعث بنتا ہے، اسلامی طرزِ عمل کے لیے نمونہ مہیا کرتا ہے اور شعائرِ دین کی تعظیم و تکریم شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ جسے کچھ دیا جا رہا ہو وہ لینے سے ناراحت ہوتا ہے۔

اس وقت جب کہ ہم خونخوار دشمن سے جنگ میں مصروف ہیں (یا کسی مسلمان قوم کو ایسی حالت کا سامنا ہو) تو اہلِ ایمان ہر روز جنگ زدگان یا مجروحین یا خود جنگجویان کی امداد کے لیے مختلف قسم کا بہت زیادہ سامان لے کر سرحدوں اور جنگی علاقوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور ان کی خبریں ذرائع ابلاغ سے نشر ہوتی ہیں ایک تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری ملت جنگ کرنے والوں کی پشت پر ہے اور دوسرا ان لوگوں کے لیے باعثِ تشویق ہوتا ہے جو اس قافلے سے پیچھے رہ گئے ہیں تاکہ جتنا جلدی ہو سکے وہ قافلے سے آملیں۔ واضح ہے کہ ایسے مواقع پر اعلانیہ انفاق زیادہ مؤثر ہے۔

ان دونوں میں فرق کے سلسلے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اعلانیہ انفاق واجبات کے ساتھ مربوط ہے کہ جس میں عام طور پر تظاہر کا پہلو نہیں ہوتا کیونکہ ذمہ داری کی ادائیگی سب پر لازم ہے اور اس میں کوئی پنہاں معاملہ نہیں لیکن مستحب انفاق چونکہ واجب سے زائد چیز ہے لہٰذا ہو سکتا ہے اس میں تظاہر یا ریا کا معاملہ ہو لہٰذا بہتر ہے کہ اسے مخفی طور پر انجام دیا جائے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تفسیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ درحقیقت پہلی تفسیر کی ایک شاخ ہے۔

۳۔ **اس دن "بیع" اور "خلال" نہیں ہے:** ہم جانتے ہیں کہ روزِ قیامت کی ماہیت و حقیقت یہ ہے کہ ہم اعمال کے نتائج اور ردِ عمل کا سامنا کریں گے۔ لہٰذا کوئی شخص وہاں عذاب سے نجات کے لیے کوئی فدیہ نہیں دے گا۔ یہاں تک کہ اگر بالفرض روئے زمین کی ساری دولت اس کے قبضے میں ہو اور وہ اسے خرچ کر کے ذرہ بھر اپنے اعمال کی سزا کم کروانا چاہے تو ممکن نہیں کیونکہ دار العمل تو یہی دنیا ہے اور یہاں سے اس کا روزنامچہ مکمل ہو کر لپیٹا جا چکا ہے اور وہاں دار الحساب ہے، وہ محاسبہ کا گھر ہے۔ اسی طرح مادی دوستی کا رشتہ جس

Marfat.com

شخص سے جس صورت میں بھی ہو وہاں نجات بخش نہیں ہو سکتا۔ (توجہ رہے کہ "خلال" اور "خلۃ" دوستی کے معنی میں ہے)۔

آسان لفظوں میں ۔۔۔ لوگ اس دنیاوی زندگی میں سزا سے بچنے کے لیے عام طور پر پیسے کا سہارا لیتے ہیں یا پارٹی اور دوستی کا ذریعہ استعمال کرتے ہیں یعنی رشوتوں اور رشتوں کے ذریعے سزا سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ سمجھیں کہ وہاں بھی اسی طرح کوئی صورت نکل آئے تو یہ ممکن نہیں۔ یہ ان کی بے خبری اور انتہائی نادانی کی دلیل ہے۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں جس طرح کی دوستی کی نفی کی گئی ہے وہ عالم قیامت میں مومنین کی باہمی دوستی کے منافی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں بعض آیات میں تصریح کی گئی ہے کیونکہ یہ تو ایمان کے زیر سایہ ایک معنوی دوستی اور مودت ہے۔

باقی رہا مسئلہ شفاعت تو جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ اس کا مادی مفہوم نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں وارد ہونے والی صریح آیات کے پیش نظر یہ صرف معنوی اور روحانی تعلق کے زیر سایہ اور بعض اعمال خیر کی وجہ سے حاصل ہونے والی اہلیت کے باعث میسر آتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۵۴ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں[1]

۴۔ **اے انسان! تمام موجودات تیرے فرمان پر تسلیم خم ہیں:** ان آیات میں دوبارہ زمین و آسمان کی مختلف موجودات کے انسان کے لیے تسخیر ہونے کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اس گفتگو کے چھ حصے ہیں۔

(۱) کشتیوں کی تسخیر

(۲) نہروں اور دریاؤں کی تسخیر

(۳) سورج کی تسخیر

(۴) چاند کی تسخیر

(۵) رات کی تسخیر

(۶) دن کی تسخیر

ان میں سے بعض کا تعلق آسمان سے ہے اور بعض (رات اور دن) کا دونوں سے ہے۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور پھر یاد دہانی ضروری ہے کہ انسان قرآن کی نگاہ میں اس قدر باعظمت ہے کہ اللہ کے حکم سے تمام موجودات اس کے لیے مسخر ہیں یعنی یا اس کے اختیار میں ہیں اور ان کی مہار اس کے ہاتھ میں ہے یا ان کی حرکت انسان کی خدمت کے لیے ہے اور اس انسان کو ہر حالت میں اس قدر عظمت حاصل ہے کہ تمام آفرینش کا یہ ایک ہدف عالی بن گیا ہے۔

سورج اس کے لیے نور افشانی کرتا ہے، اس کا بستر حیات گرم کرتا ہے، اس کے لیے طرح طرح کی نباتات اور پودے اُگاتا ہے، اس کی زندگی کے ماحول کو ضرر رساں جراثیم سے پاک کرتا ہے، اسے مسرت و شادمانی کا پیغام دیتا ہے اور اسے راہ حیات کی نشاندہی کرتا ہے۔

چاند انسان کی تاریک راتوں کا چراغ ہے یہ طبیعی، فطری اور جاوداں تقویم ہے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والا جوار بھاٹا انسان کی بہت سی مشکلات حل کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول صفحہ ۱۸۱ اور تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۱۵۵ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

سمندروں اور دریاؤں سے جاری نہروں کا پانی اُوپر آجاتا ہے۔ یہ بہت سے درختوں کی آبیاری کرتا ہے۔ خاموش، ساکن اور رکے ہوئے سمندروں کو حرکت میں لے آتا ہے اور اسے گندا اور متعفن ہونے سے بچاتا ہے۔ اور موجوں کے اٹھنے سے دریاؤں اور سمندروں کے زندہ موجودات کے لیے ضروری آکسیجن میسر آجاتی ہے۔

ہوائیں بحری جہاز اور کشتیاں سمندر کے سینے پر چلاتی ہیں۔ وسیع ترین شاہراہ انہی سمندروں میں میسر ہے اور عظیم ترین سواری بھی یہی جہاز ہیں۔ یہاں تک کہ بعض بحری جہاز ایک چھوٹے شہر کی مانند ہیں اور چھوٹے شہر ہی کی آبادی کو لیے سمندروں میں رواں دواں ہوتے ہیں۔

دریا اور نہریں ــــ انسان کی خدمت گزار ہیں۔ یہ زراعت کی آبیاری، جانوروں کی سیرابی اور ماحولِ زندگی کو تروتازہ رکھنے کے لیے ہیں یہاں تک کہ خود ان میں انسان کے لیے مچھلیوں کی صورت میں غذائی مواد پل رہا ہوتا ہے۔

تاریکیِ شب ــــ انسان کو لباس کی طرح ڈھانپ دیتی ہے، اسے سکون وراحت پہنچاتی ہے اور سورج کی جلانے والی حرارت سے اس طرح بچاتی ہے جیسے سائے میں پنکھے کی ہوا درات انسان کو حیات تازہ بخشتی ہے۔

اسی طرح دن کی روشنی ــــ انسان کو اٹھ کھڑا ہونے اور سعی و کوشش کی دعوت دیتی ہے اور اس کے اندر گرمی اور حرارت پیدا کرتی ہے اور ہر مقام پر جنبش و حرکت پیدا کرتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام چیزیں انسان کی فرمانبردار ہیں۔ ان تمام نعمتوں کا بیان اور ان کی وضاحت انسان میں ایک نئی روح پھونکنے کے علاوہ اسے اس کی عظمت سے آگاہ کرتی ہے اور اس میں احساسِ تشکر ابھارتی ہے۔

اس گفتگو سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآنی لغت میں تسخیر دو معانی کے لیے آتا ہے۔

ایک انسان کے مفادات اور مصالح کے لیے مصروفِ خدمت ہونے (جیسے سورج اور چاند کی تسخیر) اور دوسرا انسانی اختیار میں ہونے (مثلاً کشتیوں اور دریاؤں کی تسخیر) کے معنی میں آیا ہے اور یہ جو بعض کا خیال ہے کہ یہ آیات موجودہ زمانے میں تسخیر کے اصطلاحی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں (جیسے خلائی سفر کے ذریعے تسخیرِ ماہتاب)، یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ بعض قرآنی آیات میں ہے،

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض جمیعًا منہ

جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب تمہارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ (جاثیہ - ۱۳)

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ تمام چیزیں جو زمین میں ہیں انسان کے لیے مسخر ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ فضانوردوں کا تمام آسمانی کرات میں پہنچنا قطعاً محال ہے۔

قرآن میں بعض دوسری آیات ہیں کہ جو ممکن ہے اس قسم کی تسخیر کی طرف اشارہ ہوں۔ اس کے بارے میں ہم انشاء اللہ سورہ رحمٰن کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

(موجودات کے انسان کے سامنے مسخر ہونے کے بارے میں سورہ رعد کی آیہ ۲ کے ذیل میں بھی بحث کی جائے گی)۔

۵ - دائبین ؛ ہم کہہ چکے ہیں کہ " دائب " مادہ " دؤب " سے ہے اس کا معنی ہے ایک عادت یا محکم سنت کے مطابق کام جاری رکھنا۔ البتہ سورج زمین کے گرد حرکت نہیں کرتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ سورج ہمارے گرد گھومتا ہے لیکن " دائب " کے معنی میں کسی جگہ میں حرکت کرنے کا مفہوم نہیں ہے بلکہ کسی کام کو مسلسل جاری رکھنے کا مفہوم اس میں مضمر ہے اور ہم جانتے

Marfat.com

ہیں کہ سورج اور چاند نور افشانی کرتے ہیں اور نشوونما کا ذریعہ ہیں۔ کرۂ زمین اور انسانوں کے لیے ان کا یہ پروگرام مسلسل اور پوری طرح منظم ہے (اور اس بات کو فراموش نہ کیجئے گا کہ "دأب" کا ایک معنی عادت بھی ہے)[1]

۶۔ جو کچھ ہم خدا سے چاہتے ہیں کیا وہ دیتا ہے؟ زیرِ بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ:

خدا نے تم پر لطف کیا اور جو کچھ تم نے اُس سے طلب کیا اس کا کچھ حصہ تمہیں دیا۔

(توجہ رہے کہ "من کل ماسألتموہ" میں "من" تبعیضیہ ہے)۔

یہ اس بناء پر ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان خدا سے کوئی چیز چاہتا ہے کہ جس میں یقینی طور پر اس کا نقصان بلکہ بعض اوقات ہلاکت پنہاں ہوتی ہے لیکن وہ اس سے بے خبر ہوتا ہے لیکن عالم، حکیم اور رحیم خدا ہرگز اس قسم کا تقاضا پورا نہیں کرتا اور اس کی بجائے شاید بہت سے مواقع پر انسان اپنی زبان سے خدا سے کوئی چیز طلب نہیں کرتا لیکن زبان حال سے اور اپنی فطرت سے اس کی تمنا کرتا ہے اور خدا اسے دے دیتا ہے اور کوئی مانع نہیں کہ "ماسألتموہ" میں زبانِ قال کا تقاضا بھی شامل ہو اور زبانِ حال کی آرزو بھی۔

۷۔ اس کی نعمتیں کیوں قابلِ شمار نہیں: یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارا وجود سرتاپا اس کی نعمتوں میں مستغرق ہے۔ اگر مختلف طبیعی علوم، علم عمرانیات، علم نفسیات اور علم نباتات وغیرہ کی کتب کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان نعمتوں کا دامن کس قدر وسیع ہے۔ اصولی طور پر ایک عظیم ادیب کے بقول ہر سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر نعمت پر شکر واجب ہے۔

اس سے قطع نظر ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان کے بدن میں اوسطاً دس ملین ارب زندہ خلیے موجود ہیں ان میں سے ہر ایک ہمارے فعال بدن کا حصہ ہے۔ یہ عدد اس قدر بڑا ہے کہ اگر ہم ان خلیوں کو گننا چاہیں تو سینکڑوں سال درکار ہیں اور پھر یہ تو ہم پر خدا کی نعمتوں کا صرف ایک حصہ ہے۔ لہٰذا اگر ہم واقعاً اس کی نعمتوں کو گننا چاہیں تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں (وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا)۔

انسان کے خون میں دو قسم کے گلوبول (GLOBULES)[2] ہوتے ہیں۔ سرخ گلوبول کئی ملین ہیں اور اسی طرح سفید گلوبول بھی۔ سرخ گلوبول بدن کے خلیوں کی سوخت و ساز کے لیے آکسیجن پہنچاتے ہیں اور سفید گلوبول انسان کی صحت و سلامتی کی حفاظت کرتے ہیں اور جب جراثیم جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ بغیر کسی استراحت اور آرام کے ہمیشہ خدمتِ انسان کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔

۸۔ افسوس کہ انسان "ظلوم" اور "کفار" ہے: گزشتہ مباحث سے ہم اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ خدا نے تمام موجودات کو حکمِ انسان کے سامنے مسخر کر دیا ہے اور اس قدر نعمتیں اسے عطا کر دی ہیں کہ اب کسی پہلو سے اس کے لیے کوئی کمی نہیں۔ لیکن یہ انسان نورِ ایمان اور تربیت سے دُور رہنے کی بناء پر طغیان اور ظلم و ستم کے راستے پر قدم رکھتا ہے اور کفرانِ نعمت میں مشغول ہو جاتا ہے۔

خود غرض افراد کی کوشش ہوتی ہے کہ خدا کی وسیع و عریض نعمتوں کو اپنے لیے منحصر کر لیں اور زمین کے وسائلِ حیات پر اپنا قبضہ جمالیں وہ

---

[1] البتہ موجودہ زمانے کے ماہرین سورج کی دوسری قسم کی گردشوں کے قائل ہیں۔ مثلاً وہ اپنے مدار کے گرد گھومتا ہے اور جس نظامِ شمسی سے اس کا تعلق ہے اس کے ساتھ اس کہکشاں کے اندر حرکت کرتا ہے جس میں وہ موجود ہے۔

[2] چھوٹے چھوٹے زندہ موجودات جو خون میں تیرتے ہیں اور زندگی کے بارے میں بھاری ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔

Marfat.com

خود تو تھوڑی سی مقدار کے علاوہ صرف نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود دوسروں کو ان تک پہنچنے سے محروم رکھتے ہیں۔

یہ مظالم جو خودغرضی، استعمار اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اس کی زندگی کے پُرسکون ماحول کو طوفانوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ان کے باعث جنگیں برپا ہوتی ہیں، خون بہتا ہے اور اموال و نفوس کی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

درحقیقت قرآن کہتا ہے: اے انسان! تیرے دستِ اختیار میں تمام چیزیں اس قدر ہیں جو کافی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تو "ظلوم" اور "کفار" نہ بنے، اپنے حق پر قناعت کرے، دوسروں کے حقوق پر تجاوز نہ کرے اور کسی کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالے۔

Marfat.com

۳۵۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ
اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ ○
۳۶۔ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ
وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○
۳۷۔ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ
الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ
اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ○
۳۸۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ
فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ○
۳۹۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ
رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ○
۴۰۔ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ
دُعَآءِ ○
۴۱۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ○

ترجمہ

۳۵۔ وہ وقت (یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: پروردگارا، اس شہر (مکہ) کو شہر امن قرار دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دُور رکھ۔

Marfat.com

۳۶۔ پروردگارا! انہوں (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے۔ پس جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

۳۷۔ پروردگارا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے گھر کے پاس کہ جو تیرا حرم ہے بے آب و گیاہ سرزمین میں ٹھہرایا ہے تاکہ نماز قائم کریں تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف موڑ دے اور انہیں ثمرات میں سے رزق دے، شاید وہ تیرا شکر بجا لائیں۔

۳۸۔ پروردگارا! جو کچھ ہم چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں تو اسے جانتا ہے اور زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ پر مخفی نہیں ہے۔

۳۹۔ حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق عطا کیے یقیناً میرا خدا دعا سنتا ہے (اور قبول کرتا ہے)۔

۴۰۔ خدایا! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی ایسا کر۔ پروردگارا! (ہماری) دعا قبول فرما۔

۴۱۔ پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ کو اور تمام مومنین کو اُس روز بخش دینا جب حساب قائم ہو گا۔

تفسیر

ابراہیمؑ بت شکن کی اصلاحی دعائیں

گزشتہ آیات میں سچے مومنین اور نعمات الٰہی کا شکر ادا کرنے والوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں راہِ خدا میں استقامت دکھانے والے اور اُس کے عبدِ شاکر ابراہیم علیہ السلام کی کچھ دعائیں بیان کی گئی ہیں تاکہ گزشتہ تمام بحثوں کی تکمیل ہو جائے اور یہ امر خدائی نعمتوں سے بہترین فائدہ اٹھانے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے نمونہ بن جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب ابراہیم نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا، پروردگارا! اس شہر (مکہ) کو سرزمینِ امن و امان قرار دے (واذ قال ابراهیم رب اجعل هٰذا البلد امنا)۔ اور مجھ پر اور میرے بیٹے پر اپنا لطف و عنایت فرما اور بتوں کی پرستش سے دُور رکھ (واجنبنی و بنیّ ان نعبد الاصنام)۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بت پرستی کتنی بڑی مصیبت اور گھروں کو ویران کرنے والی ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس راستے میں برباد ہونے والوں کو دیکھا ہے۔

Marfat.com

پروردگارا! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے (رب انھن اضللن کثیرًا من الناس)۔ گمراہی بھی کیسی خطرناک کہ جس میں وہ اپنی عقل و خرد تک گنوا بیٹھے ہیں۔

میرے اللہ میں تیری توحید کی دعوت دیتا ہوں اور سب کو تیری طرف پکارتا اور بلاتا ہوں۔ "جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے اگر وہ قابلِ ہدایت و بخشش ہے تو اس کے بارے میں محبت و احسان فرما کیونکہ تو بخشنے والا مہربان ہے" (فمن تبعنی فانہ منی و من عصانی فانک غفور رحیم)

دراصل ان الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ بارگاہِ خداوندی میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر میری اولاد بھی راہِ توحید سے منحرف ہو جائے اور بت پرستی کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ مجھ سے نہیں ہے اور اگر غیر اس راستے پر گامزن ہو جائیں تو وہ میرے بیٹوں اور بھائیوں کی مانند ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ مؤدبانہ اور انتہائی محبت آمیز تعبیر اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ نہیں کہتے کہ جو شخص میری نافرمانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے اور اسے اس طرح یا اس طرح سزا دے بلکہ کہتے ہیں: جو شخص میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

پھر اپنی دعا اور درخواست جاری رکھتے ہیں: پروردگارا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے گھر کے پاس کہ جو تیرا حرم ہے بے آب و گیاہ سرزمین میں ٹھہرایا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں (ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ)۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب خدا نے انہیں ان کی کنیز ہاجرہ سے فرزند عطا کیا۔ جس کا نام انہوں نے اسماعیل رکھا۔ اس پر ان کی پہلی بیوی سارہ کے دل میں حسد پیدا ہو گیا۔ وہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے کی موجودگی برداشت نہ کر سکی۔ اُس نے ابراہیمؑ سے تقاضا کیا کہ اس ماں بیٹے کو کہیں اور لے جائیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمانِ خدا پر یہ بات مان لی اور اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو لے کر سرزمین مکہ میں چلے آئے۔ ان دنوں یہ علاقہ بالکل خشک بنجر اور ویران تھا۔ آپؑ نے انہیں وہاں ٹھہرایا اور خدا حافظ کہہ کر چلے آئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس گرم اور تپتی ہوئی زمین پر ماں اور بیٹے کو پیاس لگی۔ ہاجرہ نے اپنے ننھے سے بچے کی جان بچانے کی بہت کوشش کی۔

دوسری طرف خدا کا ارادہ تھا کہ یہ سرزمین ایک عظیم مرکز عبادت بنے۔ اس موقع پر زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صحرا نورد قبیلہ "جرہم" وہاں سے گزرا۔ اُسے سارے ماجرے کا پتہ چلا۔ اس نے وہیں پڑاؤ ڈال لیا اور رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ ایک آبادی کی شکل اختیار کرنے لگا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا کو اس طرح سے جاری رکھا: اب جبکہ وہ تیرے عظیم گھر کے احترام میں اس جلا ڈالنے والے بیابان میں سکونت پذیر ہو گئے ہیں تو تو کچھ لوگوں کا دل ان کی طرف موڑ دے اور ان کی محبت ان کے دلوں میں ڈال دے (فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم)۔ اور انہیں طرح طرح کے (مادی و معنوی) ثمرات سے بہرہ مند کر دے، شاید وہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کریں (وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون)۔

ایک مؤحد اور آگاہ انسان جانتا ہے کہ علمِ الٰہی کے مقابلے میں اس کا علم محدود ہے اور اس کے مصالح کو صرف خدا جانتا ہے، اکثر وہ خدا سے ایسی چیزوں کا تقاضا کرتا ہے جو اس کے لیے قرینِ مصلحت نہیں ہوتیں اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جن میں اُس کی مصلحت ہے لیکن وہ

Marfat.com

ان کے لیے درخواست نہیں کرتا اور کبھی اس کے دل کی آرزوئیں ہوتی ہیں کہ جن سب کو وہ زبان پر نہیں لاسکتا لہٰذا مذکورہ دعاؤں اور تقاضوں کے بعد حضرت ابراہیم یوں عرض کرتے ہیں: پروردگارا! تو ان سب چیزوں سے اچھی طرح آگاہ ہے جنہیں ہم چھپاتے ہیں یا آشکار کرتے ہیں (ربنا انك تعلم ما نخفی و ما نعلن)۔ اور زمین و آسمان میں کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں ہے (و ما یخفی علی الله من شیء فی الارض و لا فی السماء)۔

اگر میں اپنے بیٹے اور بیوی کے فراق میں غمگین ہوں تو تو جانتا ہے اور اگر آشکار بھی میری آنکھ سے آنسو چھلکتے ہیں تو تو انہیں دیکھتا ہے۔

اور اگر غم فراق میرے دل پر چھایا ہوا ہے تو بھی تو جانتا ہے اور تیرے حکم کی اطاعت سے میرا دل ساتھ ساتھ مطمئن بھی ہے تو بھی تجھے خبر ہے۔

اور اگر وقتِ جدائی میری بیوی مجھ سے کہتی ہے ا

الی من تکلنی ؟

مجھے کس کے سہارے چھوڑے جاتے ہو ؟

تو اس سے بھی تو آگاہ ہے۔

تو ان سب چیزوں سے آگاہ ہے۔ اس سرزمین اور ان کا مستقبل ایک دوسرے سے مضبوطی سے بندھا ہوا ہے، یہ سب تیری بارگاہِ علم میں روشن ہے۔

اس کے بعد نعماتِ پروردگار کے شکر کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں سے اہم ترین یہ تھی کہ پروردگار نے عالم پیری میں حضرت ابراہیم کو دو آبرومند بیٹے اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے تھے۔ بارگاہِ ایزدی میں عرض کرتے ہیں: حمد و سپاس ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق بخشے (الحمد لله الذی وهب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحاق)۔[1]

جی ہاں! یقیناً میرا خدا دعاؤں کو سنتا ہے (ان ربی لسمیع الدعاء)۔

پھر بھی درخواست اور دعا جاری رکھتے ہیں اور عرض کرتے ہیں: پروردگارا! مجھے نماز قائم کرنے والا قرار دے اور اے میرے خدا! میری اولاد میں سے بھی اسی طرح قرار دے (رب اجعلنی مقیم الصلوٰة و من ذریتی)۔ پروردگارا! میری دعا قبول کرلے (ربنا و تقبل دعاء)۔

اور آخری تقاضا ابراہیم نے یہ کیا: پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ کو سب مومنین کو اس روز بخش دینا جس دن حساب قائم ہو (ربنا اغفر لی و لوالدی و للمؤمنین یوم یقوم الحساب)۔

---

[1] جب حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر کیا تھی۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ۹۹ سال کے تھے کہ پہلے فرزند اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور ۱۱۲ سال کے تھے جب اسحاق نے آنکھ کھولی۔ بعض نے اس سے کم اور بعض نے زیادہ عمر لکھی ہے تاہم یہ مسلم ہے کہ اس وقت آپ کی عمر اتنی تھی کہ معمولاً اس عمر میں بچے کی پیدائش بہت بعید معلوم ہوتی تھی۔

چند اہم نکات

۱۔ **کیا مکہ اس وقت شہر تھا؟** زیرِ نظر آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اچانک عرض کرتے ہیں کہ خداوندا! میں اپنے بیٹے کو ایک ایسی سرزمین میں چھوڑ رہا ہوں جہاں پانی ہے نہ آبادی اور نہ زراعت۔

یقیناً یہ سرزمین مکہ میں ورود کا آغاز ہے کہ جب پانی تھا نہ آبادی، نہ مکان تھا نہ مکین۔ صرف خانہ خدا کے باقی ماندہ آثار تھے جو وہاں دکھائی دیتے تھے اور کچھ خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑ تھے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے اس علاقے کا یہی ایک سفر نہ کیا تھا۔ اس کے بعد بھی آپ نے اس سرزمینِ مقدس پر بار بار قدم رکھا جب کہ تدریجاً مکہ شہر کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ قبیلہ "جرہم" وہاں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ چشمۂ زمزم پیدا ہونے پر علاقہ رہائش کے قابل ہو چکا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعائیں ان کے کسی بعد کے سفر سے تعلق رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کہتے ہیں: خداوندا! اس شہر کو مقامِ امن و امان قرار دے۔

اور یہ جو وادیٔ "غیر ذی زرع" کہا ہے تو یا یہ گزشتہ زمانے کی بات کر رہے ہیں اور اپنے پہلے سفر کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ سرزمینِ مکہ ایک شہر بن جانے کے بعد بھی ناقابلِ زراعت ہے لہٰذا اس کی ضروریات باہر سے آنا چاہئیں کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ خشک پہاڑوں پر مشتمل ہے جہاں پانی بہت کم ہے۔

۲۔ **مکہ سرزمینِ امن:** یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ سے جو سب سے پہلی دعا کی وہ "امن" مکہ کے لیے تھی۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ امن کی نعمت انسانی زندگی کے لیے، کسی جگہ قیام کرنے کے لیے اور ہر قسم کی تعمیر، آبادی اور ترقی کے لیے پہلی شرط ہے اور ہے بھی ایسا ہی۔ اگر کسی جگہ امن و امان نہ ہو تو وہ رہنے کے قابل نہیں اگرچہ دنیا کی تمام نعمتیں وہاں موجود ہوں۔ اصولی طور پر وہ شہر، آبادی اور ملک کہ جو امن کی نعمت سے محروم ہو گویا وہ تمام نعمتیں کھو بیٹھا ہے۔

یہاں اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کے امن کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو دو طرح سے قبول کیا ہے۔ اسے امنیتِ تکوینی بھی دی کیونکہ یہ ایسا شہر ہو گیا کہ جس نے پوری تاریخ میں امن کے لیے تباہ کن حوادث بہت کم دیکھے ہیں اور اسے امنیتِ تشریعی بھی دی۔ یعنی خدا نے حکم دیا ہے کہ تمام انسان بلکہ جانور تک اس سرزمین میں امن و امان میں رہیں۔ یہاں کے جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہے[ؔلہ] یہاں تک کہ جو مجرم اس حرم اور خانہ خدا میں پناہ لیں ان کا تعاقب بھی جائز نہیں۔ ایسے مجرمین کا صرف کھانا پانی بند کیا

ؔلہ اس وقت جب کہ ہم تفسیر کے اس حصے کو مرتب کر رہے ہیں امت اسلامی پر ایک نہایت اندوہناک سانحہ گزرا ہے۔ سرزمینِ حرم پر اطرافِ خانہ خدا میں سعودی پولیس نے وحشت و درندگی کی انتہا کر دی۔ اس نے ایرانی حاجیوں پر گولی چلائی۔ سینکڑوں مرد، عورتیں، بچے بوڑھے شہید ہو گئے۔ ایک انتہائی منظم، پُرامن اور باوقار جلوس پر یہ ظلم صرف اس "جرم" پر ہوا کہ وہ عالمی طاغوتی طاقتوں امریکہ، روس اور اسرائیل کے خلاف اظہارِ نفرت کر رہے تھے۔ یہ واقعہ ان دنوں میں ہوا جب خلیج فارس میں امریکہ نے کھلم کھلا فوجی مداخلت شروع کر دی ہے تاکہ ایران کے اسلامی انقلاب سے اپنی رسوائی کا بدلہ لے سکے۔ ایسے میں

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

Marfat.com

جا سکتا ہے تاکہ وہ بالکل آئیں اور تسلیم خم کر دیں۔

۳۔ ابراہیمؑ بت پرستی سے دُوری کی دعا کیوں کرتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ابراہیمؑ معصوم نبی تھے اور ان کے بلاواسطہ بیٹے جو آیت کے لفظ "بنیّ" کے یقینی مصداق ہیں یعنی اسماعیلؑ اور اسحاقؑ وہ بھی معصوم پیغمبر تھے اس کے باوجود وہ تقاضا کرتے ہیں: خدایا! مجھے اور انہیں بتوں کی پوجا سے دُور رکھ!

یہ بات بت پرستی کے خلاف جہاد کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے دلیل ہے۔ یہاں تک کہ معصوم نبی اور بت شکن بھی اس سلسلے میں خدا سے دعا کرتے ہیں۔ یہ بعینہٖ پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے اپنی وصیتوں میں حضرت علیؑ یا دوسرے آئمہؑ کہ جو ان کے جانشین تھے انہیں نماز کی تاکید کرنے کے مشابہ ہے جبکہ ان کے بارے میں ترکِ نماز کے احتمال کا ہرگز کوئی مفہوم نہیں بلکہ اصولی طور پر نماز ان کی سعی و کوشش سے برپا ہوئی ہے۔

تو اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ابراہیمؑ نے کس طرح سے کہا کہ پروردگارا! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے حالانکہ وہ پتھر اور لکڑی کے سوا کچھ نہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ:

اولاً ـــ بت ہمیشہ پتھر اور لکڑی کے نہیں ہوتے تھے بلکہ کبھی کبھی فرعون اور نمرود جیسے افراد لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دیتے تھے اور اپنے آپ کو "ربِ اعلیٰ"، "زندہ کرنے والا" اور "مارنے والا" کی حیثیت سے متعارف کرواتے تھے۔

ثانیاً ـــ بعض اوقات پتھر اور لکڑی کے بتوں کو ان کے متولی اور کارندے اس طرح سے آراستہ و پیراستہ کرتے اور ان کے لیے ایسے احترامات بجا لاتے کہ وہ واقعاً سادہ لوح عوام کے لیے گمراہ کن ہو جاتے۔

۴۔ ابراہیمؑ کے تابع کون ہیں؟ زیرِ بحث آیات میں ہے کہ ابراہیمؑ کہتے ہیں: خداوندا! وہ لوگ جو میری پیروی اور اتباع کرتے ہیں۔

یہاں سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار صرف وہ لوگ تھے جو ان کے زمانے میں تھے یا ان کے بعد ان کے دین پر تھے یا ساری دنیا کے توحید پرست اور خدا پرست اس میں شامل ہیں کیونکہ ابراہیمؑ توحید اور بت شکنی کی علامت اور نمونہ ہیں۔

قرآنی آیات میں ملتِ اسلامیہ اور دینِ اسلام کو ملت و دینِ ابراہیمی کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا ہے[1] اس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کی دعا تمام توحید پرستوں اور راہِ توحید میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: جب کہ مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط استعماری ایجنٹوں، فوجی آمروں اور بادشاہوں نے ایران کی اسلامی حکومت کے خلاف ایکا کر لیا ہے اور سب امریکہ سے تعاون پر کمربستہ ہیں۔ سعودیوں نے نہ فقط سرزمین کعبہ کو اسلام کے صریح احکام کے خلاف زائرین حرم کے خون سے لالہ زار بنایا بلکہ اس پوری دنیا میں ان مظلوموں کے خلاف پراپیگنڈا کیا۔ صیہونیت اور استعماری قوتوں کے تمام نشریاتی ادارے ان مظلوموں کے خلاف استعمال ہوئے۔ قاتلوں کو امن کا محافظ اور مشرکین اور دشمنانِ اسلام کے خلاف فریاد کرنے والوں کو امن کا دشمن قرار دیا گیا۔

سعودی ایسا کیوں نہ کرتے کیونکہ یہ اسی یزید اور حجاج کے افکار کے وارث ہیں جنہوں نے خانہ خدا کی حرمت پامال کی تھی (ثاقب) (اگست ۱۹۸۷ء)۔

[1] حج ـــ ۷۸۔

Marfat.com

آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی روایات میں بھی اس تفسیر کی تائید کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

من احبنا فهو منا اهل البيت قلت، جعلت فداك منكم قال، منا والله اما سمعت قول ابراهيم: "من تبعني فانه مني"

جو شخص ہم سے محبت رکھے (اور اہل بیت کی سیرت پر چلے) وہ ہم میں سے ہے۔

راوی نے پوچھا: میں آپ پر قربان، واقعاً آپ میں سے ہے؟

فرمایا: واللہ ہم میں سے ہے۔ کیا تم نے ابراہیم کی گفتگو نہیں سنی جو کہتے ہیں من تبعنی فانہ منی (جو شخص میری اتباع کرے وہ مجھ سے ہے)[1]

یہ حدیث نشاندہی کرتی ہے کہ کسی مکتب کی پیروی اور اس کے پروگرام میں سے تعلق کسی خاندان سے روحانی طور پر تعلق ہونے کے مترادف ہے۔

ایک اور حدیث میں امام امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

نحن آل ابراهيم افترغبون عن ملة ابراهيم وقد قال الله تعالى فمن تبعني فانه مني

ہم آل ابراہیم ہیں۔ تو کیا ابراہیم کی ملت اور دین سے منہ موڑتے ہو؟ حالانکہ خداوند عالم (ابراہیم کا قول نقل کرتے ہوئے) فرماتا: جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے۔

۵۔ وادی "غیر ذی زرع" اور خدا کا پُر امن حرم: جو لوگ مکہ گئے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خانۂ خدا، مسجد حرام اور پورا مکہ مکرمہ چند خشک اور بے آب وگیاہ پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ گویا پتھروں کو پہلے ایک جلتے ہوئے تنور میں بھونا گیا ہے اور پھر انہیں ان کی جگہ پر نصب کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ خشک اور جلا دینے والی زمین عبادت کا عظیم ترین مرکز اور روئے زمین پر توحید کا اولین مرکز ہے علاوہ ازیں خدا کا حرم امن ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے امنیت تکوینی کا بھی حامل ہے اور امنیت تشریعی کا بھی۔

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسا مرکز ایسی سرزمین پر کیوں بنایا۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام نے خطبۂ قاصعہ میں نہایت خوبصورت اور عمدہ الفاظ میں اس کا فلسفہ بیان فرمایا ہے:-

وضعه باوعر بقاع الارض حجرًا واقل نتائق الدنيا مدرًا....
...... بين جبال خشنة ورمال دمثة...... ولو اراد سبحانه ان يضع بيته الحرام ومشاعره العظام بين جنات وانهار وسهل وقرار جم الاشجار، دانى الثمار، ملتف البنى، متصل القرى، بين برة سمراء وروضة خضراء، وارياف

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۲ ص۵۴۸۔

Marfat.com

محدقة ، و عراص مغدقة و رياض ناظرة و طرق عامرة لكان قد صغر قدر الجزاء على حسب ضعف البلاء، ولو كان الاساس المحمول عليها و الاحجار المرفوع بها ، بين زمردة خضراء ، وياقوتة حمراء ، ونور و ضياء ، لخفف ذلك مصارعة الشك فى الصدور، ولوضع مجاهدة ابليس عن القلوب ، ولنفى معتلج الريب من الناس . ولكن الله يختبر عباده بانواع الشدائد ، ويتعبدهم بانواع المجاهد و يبتليهم بضروب المكاره، اخراجًا للتكبر من قلوبهم ، واسكانًا للتذلل فى نفوسهم، وليجعل ذلك ابوابًا فتحًا الى فضله، و اسبابًا ذللا لعفوه

خدا نے اپنا گھر سنگلاخ ترین علاقے، نہایت بے آب وگیاہ زمین، سخت پہاڑوں اور ریگستانی علاقے میں قرار دیا ہے۔
اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنا گھر اور حرم اور حج جیسی عظیم عبادت کا مقام کسی ایسے علاقے میں بنا سکتا تھا کہ جہاں باغات ہوتے، نہریں بہہ رہی ہوتیں، زمین ہموار ہوتی، ہر طرف درخت ہوتے، جہاں پھلوں پھولوں کی فراوانی ہوتی، اردگرد محلات اور آبادیاں ہوتیں، گندم کے کھیت ہوتے سبزہ ہی سبزہ ہوتا، خوبصورت کیاریاں ہوتیں، پانی سے سیراب چمن ہوتے، شاداب گلستاں ہوتے اور آباد شاہراہیں ہوتیں ___
لیکن عظیم حج اور عبادت کی آزمائش جس قدر سہل اور آرام دہ ہوتی اجر و جزا بھی اسی قدر کم ہوتی۔
نیز اگر خدا چاہتا تو کعبہ کے ستون اور اس کی عمارت کے پتھر سبز زمرد اور سرخ یاقوت کے ہوتے جن سے روشنی ہوتی لیکن یہ چیز سینوں میں شک و شبہات کا ٹکراؤ کم کر دیتی اور دلوں سے شیطان کی دوڑ دھوپ کا اثر زائل کر دیتی اور لوگوں سے شکوک کے ہیجان دور کر دیتی مگر اللہ اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے اور اُن سے ایسی عبادت کا خواہاں ہے جو طرح طرح کی مشقتوں سے بجا لائی گئی ہو اور انہیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے تاکہ اُن کے دلوں سے غرور و تکبر کو نکال باہر کرے اور اُن کے نفوس میں عجز و فروتنی کو جگہ دے اور یہ کہ اس آزمائش کی راہ سے اپنے فضل و امتنان کے کھلے ہوئے دروازوں تک انہیں پہنچائے اور اُسے اپنی معافی و بخشش کا آسان وسیلہ قرار دے[1]

۶۔ حضرت ابراہیمؑ کی سات دعائیں: زیرِ نظر آیات میں توحید و دعا کے ہیرو اور بتوں، بت پرستی اور ظالموں کے خلاف قیام کرنے والے حضرت ابراہیمؑ کی بارگاہِ خدا میں سات دعائیں مذکور ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ، خطبہ نمبر ۱۹۲۔

Marfat.com

پہلی دعاء توحیدی معاشرے کے عظیم مرکز شہر مکہ کی امنیت کے بارے میں ہے اور یہ دعا بہ نہایت معنی خیز ہے۔

دوسری دعاء، بتوں کی پرستش سے دُور رہنے کے بارے میں ہے کہ جو تمام دینی عقائد اور پروگراموں کی اساس ہے۔

تیسری دعاء، ان کی اولاد اور ان کے مکتب کے پیروکاروں کی طرف تمام لوگوں اور خدا پرستوں کے قلبی میلان اور فکری رجحان کے بارے میں ہے کہ جو معاشرے میں کسی انسان کا عظیم ترین سرمایہ ہو سکتا ہے۔

چوتھی دعاء، شکرگزاری کے مقدمہ کے طور پر اور خالق نعمات کی طرف مزید توجہ کے جذبے سے انواع و اقسام کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کے بارے میں ہے۔

پانچویں دعاء، قیام نماز کی توفیق کے متعلق ہے اور یہ انسان کے خدا کے ساتھ عظیم ترین رشتے کی علامت ہے اور یہ دعا حضرت ابراہیمؑ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی کرتے ہیں۔

چھٹی دعاء، قبولیتِ دعاء کے بارے میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا وہ دعاء قبول کرتا ہے کہ جو پاک دل اور بے آلائش روح سے نکلے۔ یہ دعاء درحقیقت ضمناً قلب و روح کی پاکیزگی کی توفیق کے لیے ہے۔

ساتویں دعاء، اور حضرت ابراہیمؑ کا آخری تقاضا اس بارے میں ہے کہ اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہوئی ہے تو بخشنے والا اور مہربان خدا انہیں اپنے لطف و بخشش سے نوازے اور اسی طرح روزِ قیامت ان کے ماں باپ اور تمام مومنین کو اپنے لطف و رحمت سے بہرہ ور کرے۔

اس طرح حضرت ابراہیمؑ کی سات دعائیں امنیت سے شروع ہوتی ہیں اور مغفرت و بخشش پر تمام ہوتی ہیں۔ یہ امر جاذب نظر ہے کہ ان دعاؤں میں حضرت ابراہیمؑ صرف اپنے لیے تقاضا نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے لیے بھی طلب کرتے ہیں کیونکہ مردانِ خدا کبھی بھی صرف اپنے لیے نہیں سوچتے۔

۷۔ **کیا ابراہیمؑ اپنے والد کے لیے دعاء کر رہے ہیں؟** اس میں شک نہیں کہ آزر بت پرست تھا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ اس کی ہدایت کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی کوششیں مؤثر ثابت نہ ہو سکیں اور اگر ہم یہ مان لیں کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ تھا تو یہ سوال سامنے آئے گا کہ ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ اس کی بخشش کی دعاء کیوں کر رہے ہیں حالانکہ قرآن صراحت سے مومنین کو مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے روکتا ہے (توبہ — ۱۱۳)۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آزر کو حضرت ابراہیمؑ کا باپ نہیں سمجھا جا سکتا اور یہ جو علماء نے کہا ہے کہ لفظ "اب" عربی زبان میں کبھی چچا کے لیے بھی بولا جاتا ہے، زیرِ بحث آیات کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو یہ بات پوری طرح قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ "اب" اور "والد" میں فرق ہے۔ لفظ "والد" کہ جو زیرِ بحث آیات میں بھی استعمال ہوا ہے صرف باپ کے معنی میں ہے لیکن لفظ "اب" کہ جو آزر کے متعلق آیا ہے چچا کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات اور سورہ توبہ کی آیات کہ جن میں مشرکین کے استغفار کی ممانعت کی گئی ہے کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آزر یقیناً حضرت ابراہیمؑ کا باپ نہیں تھا[1]

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۵ صفحہ ۲۴۸ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۶

Marfat.com

۴۲۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۚ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ
لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝
۴۳۔ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ
اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝
۴۴۔ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۗ
اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝
۴۵۔ وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ
كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۝

ترجمہ

۴۲۔ اور یہ گمان نہ کر کہ خدا ظالموں کے اعمال سے غافل ہے (ایسا نہیں ہے بلکہ اُس نے) ان کے لیے (سزا کو) اُس دن کے لیے مؤخر کیا ہے کہ جس دن (خوف و وحشت کے مارے) آنکھیں پتھرا جائیں گی۔

۴۳۔ وہ گردنیں اُوپر کیے اور سر اٹھائے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بے حرکت ہو کر رہ جائیں گی (کیونکہ وہ جدھر دیکھیں گے عذاب کی نشانیاں نظر آئیں گی) اور ان کے (ڈوبتے ہوئے) دل بالکل ویران ہوں گے۔

۴۴۔ اور لوگوں کو اُس دن سے ڈراؤ جس روز عذابِ الٰہی ان کی طرف آئے گا وہ دن کہ جب ظالم کہیں گے: پروردگارا! ہمیں تھوڑی سی مدت کے لیے مہلت دے دے تاکہ ہم تیری دعوت قبول کرلیں اور رسولوں کی اتباع کرلیں (لیکن انہیں فوراً جواب دیا جائے گا کہ) کیا پہلے تم قسم کھا کر نہ کہتے تھے کہ تمہارے لیے زوال و فنا نہیں ہے۔

۴۵۔ (کیا وہ تمہی نہ تھے کہ) جنہوں نے ان لوگوں کے گھروں (اور محلات) میں سکونت اختیار کی کہ جنہوں نے اپنے اُوپر

Marfat.com

ظلم کیا تھا جب کہ تم پر یہ امر آشکار ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ہم نے تم سے (گزشتہ لوگوں کے انجام کی) مثالیں بیان کر دی تھیں (پھر بھی تم بیدار نہ ہوئے)۔

تفسیر

جس روز آنکھیں پتھرا جائیں گی

گزشتہ آیات میں یوم حساب کے بارے میں گفتگو تھی۔ اسی مناسبت سے زیر نظر آیات میں ظالموں اور ستمگروں کی کیفیت مجسم کی گئی ہے اور ان کے انجام کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جو ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی ہے۔ ضمناً مسائل معاد کے اس حصے کے ذکر سے گزشتہ مباحث توحید کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔

پہلے ظالموں اور ستمگروں کو تہدید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبر! انہیں یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ظالموں اور ستمگروں کے کام سے غافل ہے ولا تحسبن الله غافلا عما یعمل الظٰلمون)۔

یہ بات درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے کہ جو کہتے ہیں کہ اگر اس عالم کا کوئی عادل خدا ہے تو پھر اس نے ظالموں کو کیوں ان کی حالت پر چھوڑ رکھا ہے۔ کیا وہ ان کی حالت سے غافل ہے یا پھر کیا وہ جانتا تو ہے لیکن انہیں روکنے کی قدرت نہیں رکھتا؟

اس سوال کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ خدا ہرگز غافل نہیں ہے۔ اگر وہ انہیں فوراً سزا نہیں دیتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جہان میدان عمل ہے اور یہ انسان کی آزمائش و پرورش کا مقام ہے اور یہ مقصد آزادیٔ عمل کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن آخر کار ان کا یوم حساب آکے رہے گا۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: خدا نے ان کی سزا اور عذاب ایسے دن پر اٹھا رکھا ہے جس میں خوف و وحشت کے مارے آنکھیں پتھرا جائیں گی اور ایک نقطہ پر لگی بے حس و حرکت ہو کر رہ جائیں گی (انما یؤخرھم لیوم تشخص فیہ الابصار)

اس روز کی سزا اور عذاب اس قدر وحشت ناک ہو گا کہ شدت خوف کے باعث یہ ستمگر اپنی گردنیں اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے یہاں تک کہ ان کی پلکیں بھی حرکت نہ کریں گی اور شدتِ اضطراب سے ان کے دل ویران ہو جائیں گے (مھطعین مقنعی رءوسھم لا یرتد الیھم طرفھم و افئدتھم ھواء)۔

"تشخص" "شخوص" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے آنکھوں کا بے حرکت ہو کر ایک ہی نقطے پر جم کر رہ جانا۔

"مھطعین" "اھطاع" کے مادہ سے گردن اونچی کرنے کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے تیز ہونے کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ذلت و عجز کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں ہے لیکن آیت کے دیگر حصوں کی طرف توجہ کرنے سے پہلا معنی ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"مقنعی" "اقناع" کے مادہ سے آسمان کی طرف سر بلند کرنے کے معنی میں ہے۔

"لا یرتد الیھم طرفھم" کا مفہوم یہ ہے کہ وحشت کے مارے ان کی پلکیں ایک دوسرے سے نہیں ٹکرائیں گی گویا مُردوں کی

Marfat.com

آنکھوں کی طرح بے کار ہو چکی ہیں۔
" افئدتھم ھواء " ان کے دلوں کے ویران ہو جانے کی طرف اشارہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھے وحشت ناک خبر سنائی تو اچانک میرا دل بیٹھ گیا اور ویران ہو گیا۔ گویا وہ یوں حواس کھو دیں گے کہ انہیں کسی چیز کی ہوش نہ رہے گی یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جائیں گے گویا ان میں نہ دل ہے نہ جان، کوئی چیز انہیں یاد نہیں۔

یہاں ان کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں:-

آنکھوں کا خیرہ ہونا،

گردنوں کا اونچا ہونا،

سروں کا بلند ہونا،

پلکیں نہ جھپک سکنا اور

سب کچھ بھول جانا۔

یہ اضطراب و وحشت کے عالم کی انتہائی عمدہ اور بولتی ہوئی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس روز ظالموں کی یہ حالت ہو گی۔ وہ ظالم کہ جو غرور و تکبر میں ہر چیز کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے تھے۔ اس دن ان کی بے چارگی کا یہ عالم ہو گا کہ پلکیں بھی نہ جھپک سکیں گے۔ ان ہولناک مناظر سے آنکھیں چرانے کے لیے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوں گے کیونکہ وہ جدھر بھی دیکھیں گے وحشت ناک مناظر اُن کے سامنے ہوں گے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو عقل کل خیال کرتے تھے اور دوسروں کو بے عقل تصور کرتے تھے۔ اس روز عقل و ہوش گنوا بیٹھیں گے اور دیوانے معلوم ہوں گے بلکہ اُن کی آنکھیں مُردوں کی آنکھوں کی طرح ویران اور بے حرکت ہوں گی۔

واقعاً جب قرآن کسی منظر کی تصویر کشی کرتا ہے تو نہایت مختصر عبارت میں کامل ترین تصویر پیش کر دیتا ہے۔ زیرِ نظر آیت بھی اس کا ایک نمونہ ہے۔
اس کے بعد اس لیے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ خدائی عذاب کسی خاص گروہ سے مربوط ہے خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایک عمومی حکم دیتا ہے: تمام لوگوں کو اس دن سے ڈرا جس دن پروردگار کا دردناک عذاب بدکاروں کا رخ کرے گا، جس وقت ظالم اپنے اعمال کے وحشت ناک نتائج دیکھیں گے تو پریشان ہوں گے اور ان کی تلافی کے لیے سوچیں گے اور عرض کریں گے: پروردگارا! ہمیں کچھ دیر کی مہلت دے دے (وانذر الناس یوم یأتیھم العذاب فیقول الذین ظلموا ربنا اخرنا الیٰ اجل قریب)۔ تاکہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "ہم تیری دعوت قبول کریں اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں" (نجب دعوتك ونتبع الرسل)۔

لیکن فوراً ان کی بات مسترد کر دی جائے گی اور انہیں ہولناک پیغام دیا جائے گا کہ ایسا ہونا اب محال ہے، عمل کا دور ختم ہو چکا ہے "کیا تمہی نہ تھے جو قسم کھایا کرتے تھے کہ تمہاری طاقت زوال پذیر نہیں ہے" (اولم تکونوا اقسمتم من قبل مالکم من زوال)۔

تم وہی نہیں جو ان کے گھروں اور محلات میں رہتے تھے جنہوں نے ظلم کیا تھا (وسکنتم فی مساکن الذین ظلموا انفسھم) جب کہ تم پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ ہم نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا (وتبین لکم کیف فعلنا بھم) اور ہم نے تم سے گزشتہ امتوں کی ہلا دینے والی مثالیں بیان کیں (وضربنا لکم الامثال)۔ لیکن ان عبرت انگیز درسوں میں سے کوئی بھی تم پر اثر انداز نہ ہوا اور تم نے اُسی طرح اپنے شرمناک اعمال اور ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رکھا اور اب جبکہ تم الٰہی کیفر کردار کو پہنچے ہو تو مہلت دیے جانے کا تقاضا کر رہے ہو۔

Marfat.com

کیسی مہلت؟ اب موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کیوں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ پیغمبر کبھی تصور بھی نہیں کرتے کہ خدا ظالموں کے کام سے غافل ہے لیکن اس کے باوجود زیرِ نظر آیات میں رسول اللہؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہیں یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ظالموں کے اعمال سے غافل ہے۔

یہ درحقیقت بالواسطہ طور پر دوسروں کو پیغام دیا گیا ہے اور یہ بھی فصاحت کا ایک فن ہے کہ کبھی کسی ایک شخص کو مخاطب کیا جاتا ہے لیکن مراد دوسرا شخص یا دیگر اشخاص ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ تعبیر دراصل تہدید کے لیے کنایہ ہے۔ مثلاً کبھی ہم کسی قصوروار سے کہتے ہیں "فکر نہ کرو ہم تیری تقصیریں بھول چکے ہیں" یعنی موقع پر ہم تیرا حساب چکائیں گے۔

بہرحال اس دنیا کی اساس اس پر ہے کہ تمام افراد کو کافی حد تک مہلت دی جائے تاکہ جو کچھ اُن کے اندر ہے ظاہر ہو جائے اور آزمائش اور تکامل کا میدان وسیع ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ کسی کے لیے عذر و بہانہ باقی نہ رہے اور سب کو بازگشت، اصلاح اور تلافی کا موقع دیا جائے۔ اسی لیے گنہگاروں کو مہلت دی جاتی ہے۔

۲۔ "یوم یأتیھم العذاب" سے کونسا دن مراد ہے؟ زیرِ نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ رسول اللہ کو اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں جس دن عذاب ان کی طرف آئے گا۔ اس دن سے کونسا دن مراد ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین نے تین احتمالات ذکر کیے ہیں:

پہلا یہ کہ یہ قیامت کا دن ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ موت آنے کا دن ہے کہ جس دن عذابِ الٰہی کا مقدمہ ظالموں کا رُخ کرے گا۔

تیسرا یہ کہ کچھ دنیاوی سزاؤں کے نزول کا دن ہے۔ مثلاً جس روز قوم لوط، قوم عاد و ثمود، قوم نوح اور فرعونیوں پر عذاب ہوا۔ یہ لوگ دریا کی دھاڑتی ہوئی موجوں کا شکار ہوئے، یا غرقِ طوفاں ہوئے، یا زلزلوں سے تباہ ہوئے، یا شدید ویران گر آندھیوں سے برباد ہوئے۔

اگرچہ بہت سے مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے لیکن بعد میں آنے والے جملے واضح طور پر تیسرے احتمال کو تقویت دیتے ہیں اور نشاندہی کرتے ہیں کہ مراد دنیاوی نابود کرنے والے عذاب ہیں ــــ اور ان کا شکار ہونے والے کہتے ہیں کہ پروردگارا! ہمیں تلافی کے لیے تھوڑی سی مہلت دے دے۔

"اخرنا" (ہمیں تاخیر میں ڈال دے) ــــ یہ تعبیر دنیاوی زندگی جاری رکھنے کی درخواست کے لیے واضح قرینہ ہے۔ اگر وہ یہ بات روزِ قیامت آثارِ عذاب دیکھ کر کہتے تو انہیں کہنا چاہیے تھا: خداوندا! ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دے، جیسا کہ سورہ انعام کی آیہ ۲۷ میں ہے:

ولو تریٰ اذ وقفوا علی النار فقالوا یالیتنا نرد ولا نکذب بایات ربنا ونکون من المؤمنین

Marfat.com

اگر تو انہیں اس عالم میں دیکھے کہ جب وہ آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو تُو دیکھے گا کہ وہ کہتے ہیں: کاش! ہم دنیا کی طرف پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیات کی تکذیب نہ کرتے اور ہم مومنین میں سے ہو جاتے (تو تجھے ان کی حالت پر افسوس ہوگا)۔

کیونکہ فوراً بعد والی آیت میں ان کا جواب اس طرح دیا گیا ہے:

ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه وانهم لكاذبون

یہ جھوٹ کہتے ہیں اگر لوٹ بھی جائیں تو انہی اعمال میں مشغول ہو جائیں گے جن سے انہیں روکا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ اگر یہ آیت عذابِ دنیا سے ڈرانے کے لیے ہے جب کہ اس سے پہلی آیت "لا تحسبن الله غافلا" میں تو عذابِ آخرت سے ڈرایا گیا ہے تو یہ امر ایک دوسرے سے کس طرح سے مناسبت رکھتا ہے؟ نیز لفظ "انما" اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں صرف قیامت میں سزا دی جائے گی اور وہاں ان پر عذاب ہوگا نہ کہ اس دنیا میں۔

لیکن اس نکتے کی طرف توجہ سے جواب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ سزا اور عذاب کہ جس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہے عذابِ قیامت ہے جو سب ظالموں کو لاحق ہوگا لیکن دنیاوی سزائیں ایک تو عمومیت نہیں رکھتیں اور دوسرا بازگشت کے بھی قابل ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ تباہ کن دنیاوی عذاب — مثلاً وہ المناک عذاب جو قومِ نوح یا آلِ فرعون اور ان جیسے لوگوں کو دامن گیر ہوا — ایسا عذاب شروع ہو جائے تو توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور لوٹ آنے کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب گنہگار لوگ ایسی سزاؤں کا سامنا کرتے ہیں تو اظہارِ پشیمانی کرتے ہیں لیکن یہ درحقیقت ایک اضطراری ندامت ہوتی ہے جس کا کوئی وزن نہیں۔ لہٰذا ایسا عذاب شروع ہونے سے پہلے تلافی کے درپے ہونا چاہیے۔[1]

۲۔ **مہلت کا تقاضا کیوں قبول نہیں کیا جاتا؟** قرآن مجید کی مختلف آیات میں ہے کہ بُرے عمل کرنے والے اور ظالم مختلف مواقع پر تقاضا کریں گے کہ انہیں اپنے گزشتہ کی تلافی کے لیے پھر سے دنیاوی زندگی مل جائے۔ ان میں سے بعض آیات روزِ قیامت سے مربوط ہیں مثلاً سورۂ انعام کی آیہ ۲۸ جس کی طرف ہم نے سطورِ بالا میں اشارہ کیا ہے۔ بعض دیگر آیات وقتِ موت آ پہنچنے سے مربوط ہیں مثلاً سورہ مومنون کی آیہ ۹۹۔ اس میں فرمایا گیا ہے:

حتّٰی اذا جاء احدهم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت

یہی حالت رہتی ہے یہاں تک کہ جب کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو وہ عرض کرتا ہے: خداوندا! مجھے پلٹا دے۔ شاید میں اپنے کیے کی تلافی کر سکوں اور عمل صالح انجام دوں۔

کچھ آیات تباہ کن عذاب کے نزول کے موقع سے مربوط ہیں۔ مثلاً زیرِ بحث آیات میں ہے کہ نزولِ عذاب کے وقت ظالم مہلت کا تقاضا کریں گے۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ ان تمام مواقع پر جواب نفی میں ہے۔ اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ ان میں سے کوئی تقاضا بھی حقیقی نہیں ہے یہ سب اس اضطراری حالت اور انتہائی پریشانی کا ردِعمل ہیں جو ان بدترین افراد کو لاحق ہوگی۔ ان کے یہ تقاضے کسی داخلی انقلاب اور زندگی میں تغیر کے لیے

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد سوم سورہ نساء آیہ ۱۸ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

عزم حقیقی کی دلیل نہیں ہیں۔

یہ تو بالکل ان مشرکین کی سی حالت ہے جو دریاؤں کے ہولناک گردابوں میں پھنس جائیں تو بڑے خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں لیکن طوفان رکتے ہی اور ساحل نجات تک پہنچتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

اسی لیے قرآن مذکورہ آیات میں صراحت سے کہتا ہے:

ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه

اگر یہ معمول کی زندگی کی طرف لوٹ جائیں تو پھر وہی طرزِ عمل جاری رکھیں گے ان کی روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔

یعنی — وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔

Marfat.com

۴۶۔ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ ۖ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ
لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝
۴۷۔ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ رُسُلَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝
۴۸۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ ۖ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ
الْقَهَّارِ ۝
۴۹۔ وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝
۵۰۔ سَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ۝
۵۱۔ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝
۵۲۔ هَٰذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ
وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۴۶۔ انہوں نے اپنا پورا مکر کیا اور ان کے سارے مکر (اور سازشیں) خدا کے سامنے آشکار ہیں اگرچہ ان کے مکر سے
پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں۔

۴۷۔ اور یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ان وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا کہ جو اُس نے اپنے رسولوں سے کیے ہیں کیونکہ
خدا قادر و منتقم ہے۔

۴۸۔ وہ دن کہ جب یہ زمین دوسری زمین میں بدل جائے گی اور آسمان (دوسرے آسمانوں میں) تبدیل ہو جائیں گے
اور خدائے واحد و قہار کی بارگاہ میں ظاہر ہوں گے۔

Marfat.com

۴۹۔ اور تُو اُس دن مجرموں کو اکٹھا طوق و زنجیر میں دیکھے گا (ایسے طوق و زنجیر جن سے ان کے ہاتھ اور گردنیں اکٹھے بندھی ہوں گی)۔

۵۰۔ اور ان کا لباس قطران (جلانے والا چپکا ہوا بدبودار مادہ) کا ہوگا اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی۔

۵۱۔ تاکہ خدا ہر شخص کو جو کچھ اُس نے انجام دیا ہے اُس کی جزا دے کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔

۵۲۔ یہ (قرآن) (سب) لوگوں کے لیے اعلان ہے تاکہ سب کو تہدید ہو جائے اور (سب) جان لیں کہ وہ اکیلا معبود ہے نیز اس لیے کہ صاحبانِ عقل (اور غور و فکر کرنے والے) نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر

ظالموں کی کمزور سازشیں

گزشتہ آیات میں ظالموں کی کچھ سزاؤں کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ ان آیات میں بھی پہلے ان کے بعض کاموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر ان کے لیے بعض سخت اور دردناک سزاؤں کا ذکر ہے۔

پہلی آیت میں ہے: انہوں نے مکر کیا اور جس قدر اُن سے بن پڑتا تھا سازش اور شیطنت کی (وقد مکروا مکرھم)۔

خلاصہ یہ کہ تیرے دشمنوں نے اسلام کو مٹانے اور نابود کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ڈرانے دھمکانے سے لے کر اذیت و آزار اور قتل تک کی سازش کی۔ نیز وہ پراپیگنڈا کرتے رہے اور طرح طرح کی تہمتیں لگاتے رہے۔

لیکن ان سب کے باوجود اللہ ان کی تمام سازشوں سے آگاہ ہے اور ان کے تمام کام اس کے ریکارڈ میں ہیں (وعند اللہ مکرھم)۔

بہرحال پریشان نہ ہو۔ یہ نیرنگیاں، منصوبے اور سازشیں تجھ پر اثر نہیں ڈالیں گی "اگرچہ وہ اپنے مکر سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیں" (وان کان مکرھم لتزول منہ الجبال)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "مکر" ہر قسم کی چارہ جوئی اور چارہ اندیشی کے معنی میں ہے۔ یہ کام کبھی برائی کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی اس کے بغیر۔ اگرچہ موجودہ فارسی زبان میں یہ لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن عربی ادب کے لحاظ سے اس کا معنی عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی یہ لفظ خدا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

"عند اللہ مکرھم" کی تفسیر کے بارے میں دو احتمالات ذکر کیے گئے ہیں۔

بعض مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے المیزان میں کہا ہے کہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ان کے تمام منصوبوں، چالبازیوں اور سازشوں پر پورا احاطہ رکھتا ہے۔

Marfat.com

بعض دیگر مثلاً مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے مکر کی سزا خدا کے ہاں ثابت ہے لہٰذا یہ جملہ "عند اللہ جزاء مکرھم" کی تقدیر میں ہے اور لفظ "جزاء" جو مضاف ہے محذوف ہے۔

البتہ پہلا معنی بلاشبہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ آیت کے ظاہری مفہوم سے بھی مطابقت رکھتا ہے اور کسی قسم کے حذف و تقدیر کا بھی محتاج نہیں ہے۔

یہ پہلا جملہ کہ جس میں ہے "اگرچہ ان کا مکر پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے" یہ بھی اسی تفسیر کو تقویت دیتا ہے۔ یعنی اگرچہ وہ منصوبہ بندی اور سازشوں میں بڑے طاق ہوں۔ خدا ان سے زیادہ آگاہ اور زیادہ قدرت والا ہے اور ان کی سازشوں کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

دوبارہ روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے اور ظالموں اور بدکاروں کو دھمکی دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تم یہ گمان نہ کرنا کہ خدا نے انبیاء سے جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی کرے گا (فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ رسلہ)۔ کیونکہ وعدہ خلافی تو وہ کرتا ہے جو قادر و توانا نہ ہو یا سزا و انتقام اس کی لغت میں نہ ہو لیکن "خدا توانا بھی ہے اور صاحب انتقام بھی" (ان اللہ عزیز ذوانتقام)۔

یہ آیت درحقیقت ایک گزشتہ آیت "ولا تحسبن اللہ غافلاً عما یعمل الظالمون" کی تکمیل کرتی ہے۔ یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ ظالموں کو مہلت ملی ہوئی ہے تو وہ اس لیے نہیں کہ پروردگار ان کے اعمال سے غافل ہے اور نہ اس لیے کہ وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرے گا بلکہ ان کا تمام حساب ایک ہی دن چکا دے گا اور انہیں عادلانہ طور پر سزا دے گا۔

لفظ "انتقام" موجودہ فارسی میں تلافی کرنا، کینہ نکالنا اور معاف نہ کرنا کا مفہوم بھی لیے ہوئے ہے۔ دراصل اس کا یہ معنی نہیں۔ بلکہ "انتقام" کا مفہوم سزا دینا اور عذاب کرنا ہی ہے۔ ایسی سزا کہ جو خدا استحقاق اور عدالت کی بناء پر دے گا بلکہ انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر خدا کی طرف سے ایسا انتقام نہ ہو تو یہ اس کی حکمت و عدالت کے خلاف ہو گا۔

مزید فرمایا گیا ہے: یہ سزا ایسے دن دی جائے گی جب یہ زمین دوسری زمین میں تبدیل ہو جائے گی اور یہ آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائے گا (یوم تبدل الارض غیر الارض والسمٰوٰت)۔

اس روز ہر چیز تباہی کے بعد پھر سے صورت پذیر ہو گی اور انسان نئے حالات کے ساتھ نئے عالم میں قدم رکھے گا۔ ایسا عالم کہ جس کی تمام چیزیں اس عالم سے مختلف ہوں گی "اس کی وسعت، اس کی نعمتیں اور اس کی سزائیں سب مختلف ہوں گی" اور اس روز جو کچھ بھی کسی کے پاس ہے وہ سب پوری طرح واحد و قہار خدا کے سامنے ظاہر ہو جائے گا (وبرزوا للہ الواحد القھار)۔

"برزو" اصل میں "براز" (بروزن "فراز") کے مادہ سے فضا اور وسیع جگہ کے معنی میں لیا گیا ہے۔ "بروز" کا معنی ایسی فضا اور وسیع علاقہ میں ہونا ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ ظاہر اور آشکار ہونا ہے۔ اسی وجہ سے "بروز" عام طور پر "ظھور" کے معنی میں آتا ہے (غور کیجئے گا)۔

روز قیامت انسان کے خدا کے سامنے ظاہر ہونے کا کیا معنی ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں۔

— بہت سوں نے اسے قبروں سے نکلنے کے معنی میں لیا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بروز کا مطلب انسان کے اندر اور باہر کا سب کچھ ظاہر ہو جانا ہو جیسا کہ سورہ مومن کی آیہ ۱۶ میں فرمایا گیا ہے!

یوم ھم بارزون لا یخفٰی علی اللہ منھم شیٔ

وہ دن کہ جب ان کا سب کچھ آشکار ہو جائے گا اور ان کی کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔

Marfat.com

نیز سورہ طارق کی آیہ ۹ میں ہے :

یوم تبلی السرائر

وہ دن کہ جب ہر شخص کے اندرونی اسرار آشکار ہو جائیں گے ۔

بہرحال اس حالت میں خدا کی قہاریت کا ذکر ہر چیز پر اس کے تسلط اور سب کے اندر اور باہر پر اس کے غلبے کی دلیل ہے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی چیز خدا پر مخفی ہے کہ جو وہاں آشکار ہو جائے گی ؟ ۔ کیا خدا قبروں میں مُردوں کے وجود سے بے خبر ہے ؟ یا کیا وہ یہاں انسان کے اندرونی اسرار کو نہیں جانتا ؟

ایک نکتے کی طرف توجہ سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے ۔ وہ یہ کہ اس جہاں میں ایک ہمارا ظاہر ہے اور ایک باطن ۔ بعض اوقات ہمارے علم کے محدود ہونے کی بناء پر یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ خدا ہمارے باطن کو نہیں جانتا لیکن دوسرے جہان میں ہر چیز اس طرح آشکار ہو جائے گی کہ ظاہر و باطن کا فرق نہیں ہوگا ۔ سب کچھ آشکار ہوگا ۔ یہاں تک کہ کسی کے دل میں یہ احتمال بھی پیدا نہیں ہوگا کہ ہو سکتا ہے کوئی چیز خدا سے مخفی رہ گئی ہے ۔

دوسرے لفظوں میں بروز و ظہور ہماری فکر و نظر کے اعتبار سے ہے نہ کہ علم خدا کے اعتبار سے ۔

اگلی آیت میں مجرمین کی حالت کی ایک اور پہلو سے تصویر کشی کی گئی ہے : اس روز تو مجرموں کو دیکھے گا کہ وہ طوق و زنجیر میں جکڑے ہوں گے ۔ ان کے ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوں گے اور وہ ایک دوسرے سے بھی بندھے ہوں گے (وتری المجرمین یومئذ مقرنین فی الاصفاد) ۔

" اصفاد " جمع ہے " صفد " (بروزن " نمد ") کی اور " صفاد " (بروزن " معاد ") طوق کے معنی میں ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ " صفاد " خاص طور پر اس طوق و زنجیر کو کہتے ہیں جو ہاتھ اور گردن کو ایک دوسرے سے باندھ دے ۔

" مقرنین " ، " قرن " اور " اقتران " کے مادہ سے اسی معنی میں ہے ۔ البتہ جب اسے باب تفعیل میں منتقل کیا جائے تو اس سے " تکثیر " کا مفہوم حاصل ہوتا ہے ۔ لہٰذا " مقرنین " کا معنی ہے : " وہ لوگ جو ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں " ۔

اس لفظ سے زیر نظر آیت میں کون لوگ مراد ہیں ۔ اس سلسلے میں مفسرین نے تین تفسیریں ذکر کی ہیں ۔

پہلی : یہ کہ اس روز مجرمین کو طوق و زنجیر کے ایک لمبے سلسلے میں ایک دوسرے سے باندھا جائے گا وہ لوگ اسی حالت میں میدانِ حشر میں پیش ہوں گے ۔ طوق و زنجیر کا یہ سلسلہ ان گنہگاروں کے عملی و فکری رشتے اور تعلق کا مظہر ہے ۔ اس تعلق کی بناء پر وہ اس جہان میں باہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے ، ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور ظلم و فساد کی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے ۔ ان کا یہ باہمی ربط وہاں طوق و زنجیر کے اس سلسلے میں مجسم ہوگا ۔

دوسری : تفسیر یہ ہے کہ اس روز مجرم زنجیروں کے ذریعے شیطانوں کے ساتھی ہو جائیں گے اور اس دنیا میں ان کا باطنی تعلق اُس جہان میں ایک زنجیر کے ذریعے آشکار ہو جائے گا ۔

تیسری : تفسیر یہ ہے کہ زنجیروں کے ذریعے ان کے ہاتھوں کو ان کی گردن کا قرین بنا دیا جائے گا ۔

کوئی مضائقہ نہیں کہ مجرموں کے بارے میں یہ سب معانی صحیح ہوں اگرچہ آیت کا ظاہری مفہوم زیادہ تر پہلے معنی کی تائید کرتا ہے ۔

Marfat.com

اس کے بعد ان کے لباس کے بارے میں بتایا گیا ہے اور یہ بھی ان کے لیے ایک عذاب عظیم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کے لباس قطران کے مادہ سے بنے ہوئے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ کے شعلے ڈھانپ لیں گے (سرابیلھم من قطران وتغشٰی وجوھھم النار)۔

"سرابیل" "سربال" (بروزنِ "مثقال") کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے "قمیص" چاہے وہ کسی بھی چیز سے بنی ہو۔ نیز بعض نے کہا ہے کہ یہ ہر قسم کے لباس کے معنی میں ہے لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور ہے۔

"قطران" لغت میں کبھی قاف پر زبر اور طاء پر سکون اور کبھی قاف کے نیچے زیر اور طاء پر سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اس کا معنی ہے ایسا مادہ جو ابہل نامی درخت سے لیا جاتا ہے۔ پھر اسے سخت کرنے کے لیے جوش دیا جاتا ہے اور پھر اسے "جرب" نامی بیماری کے موقع پر اونٹ کے بدن پر ملا جاتا ہے تاکہ اس بیماری کے باعث ہونے والی سوزش کو ختم کیا جا سکے اور اس کے مادہ کو جڑ سے ختم کیا جا سکے۔ بہرحال یہ ایک ایسا بدبودار سیاہ رنگ مادہ ہے جو شعلہ ور ہو سکتا ہے۔[1]، [2]

بہرکیف "سرابیلھم من قطران" کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے بدن لباس کی بجائے ایک طرح کے سیاہ رنگ بدبودار جل اٹھنے والے مادے سے ڈھانپے جائیں گے۔ یہ ایسا لباس ہوگا جو ویسے بھی بُرا ہوگا اور دیکھنے میں بھی بہت قبیح ہوگا، بدبو بھی دے گا اور خود بخود جل اٹھنے والا بھی ہوگا۔ جب لباس میں یہ چار عیب ہوں گے تو گویا وہ بدترین لباس ہوگا۔ کیونکہ لباس زینت کے لیے بھی ہوتا ہے اور گرمی سردی سے بچنے کے لیے بھی جب کہ یہ لباس بُرا اور قبیح صورت بھی ہوگا اور جلانے والا بھی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ لباسِ گناہ پہن کر مجرم اس جہان میں بارگاہِ الٰہی میں بھی اپنے تئیں روسیاہ کرتے ہیں اور ان کے گناہ کا تعفن اس معاشرے کو بھی آلودہ کرتا ہے۔ نیز اُن کے اعمال اس معاشرے میں فساد و گناہ کی آگ بھڑکانے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ "قطران" کہ جس کا لباس انہیں اُس جہان میں پہنایا جائے گا گویا اُن کے اس جہان کے اعمال کی تجسیم ہے۔

یہ جو آیت میں ہے کہ آگ کے شعلے اُن کے چہروں کو ڈھانپ دیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس حصے پر "قطران" نہیں ہوگا وہ اس کے شعلوں میں جلے گا۔

یہ اس لیے ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے کیے کے مطابق جزا دے (لیجزی اللہ کل نفس ما کسبت)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "انہیں اُن کے اعمال کی جزا دے گا" بلکہ کہتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے، انہیں جزا کے طور پر دے گا۔ دوسرے لفظوں میں ان کی جزا اُن کے اعمال مجسم ہونا ہے۔ اس خاص تعبیر کے باعث یہ آیت تجسیمِ اعمال کی ایک اور دلیل ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے: اللہ سریع الحساب ہے (ان اللہ سریع الحساب)۔

بالکل واضح ہے کہ جب انسان کے اعمال ختم نہ ہوں اور چہرہ بدل کر انسان کے پاس آ جائیں تو اس سے زیادہ جلدی حساب اور کیا ہوگا اور دراصل انسان کا حساب اس کے ساتھ ساتھ ہی ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر، فخر الدین رازی جلد ۱۹ صفحہ ۱۴۸۔

[2] فرید وجدی دائرۃ المعارف میں قطران کے مادہ میں کہتا ہے:
یہ ایسا مائع ہے جو پتھر کے کوئلہ کی تقطیر کے وقت ہاتھ آتا ہے جب کہ ایک خاص گیس حاصل کرنے کے لیے عمل تقطیر کیا جاتا ہے اور نباتی قطران بعض درختوں سے لیا جاتا ہے۔

Marfat.com

بعض روایات میں ہے۔

ان اللہ تعالٰی یحاسب الخلائق کلھم فی مقدار لمح البصر

اللہ تعالیٰ چشم زدن میں تمام مخلوقات کا حساب کرے گا۔

اصولی طور پر پروردگار کی طرف سے محاسبہ مدت کا محتاج نہیں۔ مذکورہ بالا روایت نے دراصل مختصر ترین زمانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ ص۴۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

یہ سورہ اور تمام قرآن چونکہ لوگوں کو دعوتِ توحید دیتا ہے، احکام الٰہی کی تبلیغ کرتا ہے اور احکام الٰہی کی خلاف ورزیوں سے ڈراتا ہے لہٰذا اس سورہ کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے، قرآن کا ابلاغ سب لوگوں کے لیے عمومی ہے (ھٰذا ابلاغ للناس) - اور انہیں ڈرانے والا ہے (ولینذروا بہ)۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جان لیں کہ ان کا معبود بس وہی ایک ہے (ولیعلموا انما ھو الٰہ واحد)۔ نیز ہدف یہ ہے کہ صاحبانِ عقل وفکر متوجہ ہوں (ولیذکر اولوا الالباب)۔

چند اہم نکات

۱۔ زمین اور آسمان بدل جائیں گے: زیرِ نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ قیامت میں یہ زمین کسی دوسری زمین میں اور اسی طرح آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

کیا اس تبدیلی سے مراد ذاتی وجود کی تبدیلی ہے یعنی کیا یہ زمین بالکل نابود ہو جائے گی اور کوئی دوسری زمین خلق کر دی جائے گی اور قیامت اُس زمین میں برپا ہوگی یا مراد صفات کی تبدیلی ہے یعنی یہ کرۂ خاکی اور یہ آسمان ویران ہو جائیں گے اور ان کے ویرانوں پر نئے زمین و آسمان پیدا ہوں گے جو اس زمین و آسمان کی نسبت تکامل و ارتقاء میں زیادہ ہوں گے۔؟

قرآن مجید کی بہت سی آیات کا ظاہری مفہوم دوسرے معنیٰ کی تائید کرتا ہے:۔

سورہ فجر کی آیہ ۲۱ میں ہے:

کلا اذا دکت الارض دکا دکا

ایک ایسا وقت آئے گا کہ زمین درہم برہم ہو جائے گی۔

سورہ زلزال میں اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اذا زلزلت الارض زلزالھا و اخرجت الارض اثقالھا

جب زمین میں زلزلہ آئے گا اور وہ اپنے مخفی بوجھ اُگل دے گی۔

سورۂ حاقہ کی آیت ۱۴ اور ۱۵ میں ہے:

وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ فیومئذ وقعت الواقعۃ

زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھا لیے جائیں گے اور وہ درہم برہم ہو جائیں گے اور اُس روز وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا۔

سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۰۵ تا ۱۰۸ میں ہے:

Marfat.com

ويسئلونك عن الجبال فقل ينسفها ربي نسفًا ○ فيذرها قاعًا صفصفًا ○ لا ترى فيها عوجًا ولا امتًا ○ يومئذ يتبعون الداعي لا عوج له وخشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا همسًا

تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: میرا پروردگار انہیں سرگرداں اور ریزہ ریزہ کردے گا اور پھر انہیں ہموار زمین کی صورت دے گا اس طرح کہ تجھے اس میں ٹیڑھاپن اور پستی و بلندی نظر نہیں آئے گی۔ اس روز لوگ اس پکارنے والے کی پیروی کریں گے کہ جس سے انحراف نہیں ہوسکے گا اور مہربان خدا کے سامنے آوازیں جھکی ہوں گی اور تجھے دھیمی دھیمی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دے گا۔

سورہ تکویر کی ابتداء میں بھی چراغ آفتاب گل ہوجانے، ستاروں کے تاریک ہوجانے اور پہاڑوں کے چلنے کا تذکرہ ہے۔

نیز سورہ انفطار کے آغاز میں بھی آسمانوں کے پھٹ جانے، تاروں کے بکھر جانے اور مُردوں کے قبروں سے اُٹھنے (غور کیجئے گا) کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

یہ آیات اور ایسی بہت سی آیات کو مجموعی طور پر دیکھا جائے اور اسی طرح انسان کے قبروں سے اٹھنے[1] کے متعلق آیات کو ملحوظِ نظر رکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا موجودہ نظام اس صورت میں باقی نہیں رہے گا لیکن یہ بالکل نابود بھی نہیں ہوگا بلکہ زمین درہم برہم ہوکر ہموار اور صاف ہوجائے گی اور لوگ گویا ایک نئی زمین پر قدم رکھیں گے۔ البتہ واضح ہے کہ وہ زمین کامل تر اور عالی تر ہوگی کیونکہ اس عالم کی تمام چیزیں اس جہان کی نسبت زیادہ وسیع اور زیادہ کامل ہوں گی۔

فطری امر ہے کہ ہمارا آج کا جہان قیامت کے مناظر قبول کرنے کی استعداد نہیں رکھتا اور قیامت اور دوسرے جہان میں ہماری زندگی کے لیے تنگ اور محدود ہے اور جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے شاید اس جہان کی نسبت اُس جہان سے اسی طرح ہے جیسے رحمِ مادر کی زندگی کی نسبت ہماری اس زندگی سے۔

بعض آیات میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اس دنیا کے دنوں کی نسبت بہت طویل ہوں گے۔[2] یہ امر بھی اس حقیقت پر ایک اچھا شاہد ہے۔

البتہ ہم اُس جہان کی تفصیلات کی تصویر کشی اس جہان میں نہیں کرسکتے جیسے شکمِ مادر میں بچہ سوجھ بوجھ بھی رکھتا ہو تو بھی باہر کی دنیا کی خصوصیات نہیں سمجھ سکتا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں اس جہان میں ایک عظیم تغیر ہوگا۔ یہ جہان بالکل ویران ہوکر بالکل ایک نئے جہان میں بدل جائے گا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مصادرِ اسلامی میں موجود متعدد روایات میں ہے کہ اس وقت زمین اور عرصۂ محشر طیب و پاک اور سفید روٹی میں بدل جائے گا کہ انسان جسے کھا سکیں گے تاکہ اُن کا حساب واضح ہوجائے اور ہر کوئی اپنے انجام کی طرف چل پڑے۔

تفسیر نور الثقلین میں یہ روایات مختلف حوالوں سے درج کی گئی ہیں۔[3]

---

[1] یٰس۔ ۵۱، قمر۔ ۷، معارج۔ ۴۳، حج۔ ۷، وغیرہ۔

[2] معارج۔ ۴۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۵۵ تا صفحہ ۵۵۸۔

Marfat.com

اہل سنت کے بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے بھی اسی آیت کے ذیل میں ایسی روایات کی نشاندہی کی ہے[1]
بعید نہیں کہ ان روایات سے مراد یہ ہو کہ اُس جہان میں زمین بجائے اس کے کہ مٹی نے اسے ڈھانپ رکھا ہو ایک ایسا غذائی مادہ اس پر محیط ہو کہ جو بدن انسانی کا حصہ بن سکتا ہو۔ کیونکہ مٹی ایسی چیز نہیں جو بدن انسانی کا حصہ بن سکے بلکہ اس میں موجود غذائی مواد نباتات کے ذریعے باہر نکلتا ہے تاکہ بدن انسانی کا حصہ بننے کے قابل ہو سکے لیکن اُس روز سطح زمین پر مٹی کی بجائے ایسا مادہ محیط ہو گا جو آسانی سے جزو بدن بن سکے۔ اسے روٹی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ انسان کی غذا کا زیادہ تر حصہ روٹی پر ہی مشتمل ہوتا ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ **سورہ ابراہیم کا آغاز اور اختتام:** جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے سورہ ابراہیم قرآن کے ایک حساس موضوع سے شروع ہوتی ہے اور یہ موضوع ہے انسان کو جہالت و شرک کے اندھیروں سے علم و توحید کے اجالوں کی طرف نکال لے جانا۔ اس سورت کا اختتام تمام لوگوں کو جہالت و شرک کے نتائج سے ڈرانے، تعلیم توحید اور اولوالالباب کو متوجہ کرنے پر ہوتا ہے۔

اس ابتداء اور انتہاء سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی ہم چاہتے ہیں وہ اسی قرآن میں موجود ہے۔ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

فیہ ربیع القلب و ینابیع العلم

دلوں کی بہار اور علوم و دانش کے سوتے اسی قرآن سے پھوٹتے ہیں[2]

اسی طرح تمام فکری، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی بیماریوں کا علاج اسی قرآن میں تلاش کرنا چاہیے۔ بقول امیرالمومنینؑ:

فاستشفوہ من ادوائکم

اسی قرآن سے اپنی بیماریوں کی دوا حاصل کرو[3]

یہ بیان اس امر کی دلیل ہے کہ آج کے مسلمان جو سمجھتے ہیں کہ قرآن صرف ایک ایسی مقدس کتاب ہے جو پڑھنے اور ثواب حاصل کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے اس کے برعکس یہ ایک ایسی کتاب ہے جو انسانوں کی ساری زندگی کے دستور العمل کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ یہ آگہی عطا کرنے والی اور بیدار کرنے والی کتاب ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ ایسی کتاب ہے جو عالم اور دانشور کو متوجہ کرتی ہے اور عامۃ الناس اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ چاہیے کہ یہ کتاب مسلمانوں کی زندگی میں جگہ پائے اور ان کی زندگی کا آئین بن جائے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ کتاب ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر عمل کرنے کے لیے تحقیق، مطالعہ اور غور و خوض کا موضوع بنی رہے۔ مسلمانوں کے زوال اور پس ماندگی کا موثر عامل اور سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس عظیم آسمانی کتاب کو فراموش کر دیا ہے اور مشرق و مغرب کے انحرافی مکاتب فکر کی طرف رُخ کر لیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے کیا عمدہ ارشاد فرمایا ہے:

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۵ صـ ۳۶۶۳
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔
[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔

Marfat.com

واعلموا انہ لیس علی احد بعد القراٰن من فاقۃ ولا لاحد قبل القراٰن من غنی

یقین جانیے کہ آپ میں سے کوئی شخص بھی حاملِ قرآن ہو جائے تو اسے ذرہ بھر فقر و احتیاج نہیں رہے گی اور حاملِ قرآن ہونے سے پہلے بے نیازی اور تونگری ممکن نہیں[1]

کس قدر دردناک ہے ـــــ قرآن سے ہماری بے گانگی اور بیگانوں کی قرآن سے آشنائی۔

کس قدر تکلیف دہ ہے ـــــ کہ بہترین وسیلۂ سعادت ہمارے گھر میں موجود ہے اور ہم اُس سعادت کے لیے دنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

کس قدر اندوہناک ہے ـــــ کہ آبِ حیات کا چشمہ ہمارے پاس ہو اور ہم تشنہ کام جان دے دیں یا تپتے ہوئے بے آب بیابانوں میں سراب کے پیچھے بھاگتے رہیں۔

خداوندا! ہمیں وہ عقل و ایمان عطا فرما کہ جس کے ذریعے ہم سعادت کا یہ عظیم وسیلہ کھو نہ بیٹھیں جو تیری راہ کے شہداء نے ہم تک پہنچایا ہے اور ہمیں وہ شعور مرحمت فرما کہ ہم جان لیں کہ ہماری گمشدہ متاعیں اسی عظیم کتاب میں ہیں ـــــ تاکہ ہم کبھی اِس کے سامنے اور کبھی اُس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتے پھریں۔

۳۔ **اوّل و آخر ـــــ توحید:** زیرِ نظر آیات کا ایک اور پہلو توحید پر تاکید ہے۔ یہاں آخری ذکر بھی توحید کا ہے اور اسی کی طرف اولوا الالباب کو متوجہ کیا گیا ہے۔

جی ہاں ـــــ توحید اسلام کی عمیق بنیاد ہے۔ عقیدۂ توحید اسلام کا وہ شجر ہے جس کی جڑیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلامی تعلیم و تربیت کے سب راستے اسی پر اختتام پذیر ہوتے ہیں ـــــ اسلام کی ابتداء بھی توحید ہے اور انتہاء بھی توحید۔ اسلام کا تانا بانا توحید ہی سے بُنا گیا ہے۔ توحید کا تعلق فقط معبود اور اللہ کے عقیدے ہی سے نہیں بلکہ اس کے ہر نظریے، عقیدے اور پروگرام کا ہدف بھی توحید ہے ـــــ ہر ایک کی بنیاد توحید پر ہے۔

آج مسلمانوں کی عظیم ابتلا کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے توحید کو عملی طور پر اسلام سے حذف کر دیا ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عرب ممالک ـــــ کہ جہاں اسلام پروان چڑھا ـــــ آج شرک آلود نعروں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ آج وہ نسل پرستی، عرب تفاخر، احیاءِ عربیت اور عظمتِ عرب کے بھنور میں گرفتار ہیں۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں سے بھی ہر کسی نے اپنے لیے اسی قسم کا کوئی بت تراش لیا ہے۔ انہوں نے اسلامی توحید کو اپنے سے بالکل الگ کر دیا ہے کہ جس نے کسی وقت مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا تھا۔ اس طرح یہ سب ممالک اپنے آپ میں ڈوب کر خود اپنے آپ سے بے گانہ ہو گئے ہیں۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کی آپس میں جنگ خون کے پیاسے دشمنوں سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ بات کتنی شرمناک ہے کہ ہم سنیں کہ عرب ممالک کی باہمی جنگوں میں مرنے والوں کی تعداد اسرائیلی یہودیوں کے مقابلے میں مرنے والوں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶۔

Marfat.com

سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت جب کہ ان کا ایک مشترک خطرناک دشمن ہے تو ان کے انتشار کا یہ عالم ہے اگر ایسا دشمن نہ ہوتا تو ان کی کیسی حالت ہوتی۔

اس وقت جب کہ ہم تفسیر کا یہ حصہ لکھ رہے ہیں حکومت عراق نے بڑی بے رحمی سے اسلامی جمہوریہ ایران پر حملہ کردیا ہے اور بہانہ بھی اس کے پاس سرحد کا معمولی سا تنازعہ ہے جو یقیناً مذاکرات سے حل ہو سکتا تھا۔ یہ وہی حکومت عراق ہے جس نے اسرائیلی سپاہیوں پر آج تک ایک گولی بھی نہیں چلائی۔ آج اس نے اس سفاکی سے حملہ کیا ہے کہ جیسے ان دو قوموں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ جیسے یہ نہ آپس میں ہمسایہ ہیں، نہ ان میں تہذیب و ثقافت کا کوئی رشتہ ہے اور نہ گہرا دینی تعلق ہے۔

اُدھر ہم دیکھتے ہیں کہ مشترک دشمن — یہودی — خوش ہو کر کہتا ہے:

اس سے بہتر منصوبے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ عراق ایران پر حملہ کردے اور دونوں میں شدید تباہ کن طولانی جنگ شروع ہو جائے — اور ہمیں ایک مدت کے لیے آسودگی مل جائے۔

یہ وہ مقام ہے کہ ایک موحد، متعہد اور صاحب ایمان مسلمان پر لازم ہے کہ ان طاغوتوں کا شر ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو — ایسے شرک آلود، نفاق ڈالنے والوں، تباہیاں پھیلانے والوں اور دشمن کو خوش کرنے والوں کو قعرِ جہنم میں پہنچائے۔

سورہ ابراہیم کی تفسیر اختتام کو پہنچی

Marfat.com

بت شکن پیغمبر

ابراہیم علیہ السلام

کی زندگی پر ایک نظر

Marfat.com

حضرت ابراہیمؑ

یہی وہ سورت ہے جو قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے اگرچہ ان کے حالات زندگی صرف اسی سورت میں نہیں ہیں بلکہ مختلف مناسبتوں سے دیگر سورتوں میں بھی خدا کے اس عظیم پیغمبر کا ذکر موجود ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ مکتب توحید کے اس ہیرو کی پُر افتخار زندگی کے مختصر حالات زندگی اس سورہ کے آخر میں بیان کر دیں تاکہ اس سلسلے میں بعد میں آنے والی مختلف آیات کی تفسیر میں قارئین محترم کے لیے مددگار ثابت ہو سکیں کیونکہ ان میں حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کی ضرورت پیش آئے گی۔

زندگی کے تین دَور

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو واضح طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قبل بعثت کا دَور۔

۲۔ دورِ نبوت اور بابل کے بت پرستوں سے مقابلہ۔

۳۔ بابل سے ہجرت اور مصر، فلسطین اور مکہ میں مساعی کا دَور۔

بچپن

حضرت ابراہیمؑ بابل میں پیدا ہوئے۔ یہ دنیا کا حیرت انگیز اور عمدہ خطہ تھا۔ اس پر ایک ظالم و جابر اور طاقتور حکومت مسلط تھی[1]

حضرت ابراہیمؑ نے آنکھ کھولی تو بابل پر نمرود جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ وہ اپنے آپ کو بابل کا بڑا خدا سمجھتا تھا۔

البتہ بابل کے لوگوں کے لیے یہی ایک بُت نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مختلف مواد کے بنے ہوئے مختلف شکلوں کے کئی ایک بت تھے۔ وہ ان کے سامنے جھکتے اور اُن کی عبادت کرتے تھے۔

حکومت وقت سادہ لوح افراد کو بیوقوف بنانے اور انہیں افیون زدہ رکھنے کے لیے بت پرستی کو ایک مؤثر ذریعہ سمجھتی تھی لہٰذا وہ بت پرستی کی سخت حامی تھی۔ وہ کسی بھی بت کی اہانت کو بہت بڑا ناقابلِ معافی جرم قرار دیتی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ولادت کے سلسلے میں مؤرخین نے عجیب و غریب داستان نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

بابل کے نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو نمرود کی غیر متنازعہ طاقت سے مقابلہ کرے گا۔ لہٰذا اس نے اپنی تمام قوتیں اس بات پر صرف کر دیں کہ ایسا بچہ پیدا نہ ہو۔ اُس کی کوشش تھی کہ ایسا بچہ پیدا ہو بھی جائے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور یہ بچہ آخرکار پیدا ہو گیا۔

اس بچے کی جائے ولادت کے قریب ہی ایک غار تھی۔ اس کی ماں اس کی حفاظت کے لیے اسے اس میں لے گئی اور اس کی پرورش

---

[1] بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ ملک بابل کے شہر اُور میں پیدا ہوئے۔

Marfat.com

ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی عمر کے تیرہ برس وہیں گزر گئے۔
اب ہر نمرود کے جاسوسوں سے بچ بچا کر نوجوانی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اس عالم تنہائی کو چھوڑ دیا جائے اور لوگوں تک وہ درسِ توحید پہنچائے جو اُس نے باطنی الہام اور فکری مطالعے سے حاصل کیا تھا۔

بت پرستوں سے مقابلہ

بابل کے لوگ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کے علاوہ سورج، چاند اور ستاروں جیسے آسمانی موجودات کی پرستش کرتے تھے۔
حضرت ابراہیمؑ نے عزم صمیم کر لیا کہ واضح منطق اور استدلال کے ذریعے ان کے خوابیدہ وجدان کو بیدار کیا جائے اور ان کی پاک فطرت کے چہرے سے غلط تعلیمات کے تاریک پردے ہٹا دیئے جائیں تاکہ نورِ فطرت چمک اٹھے اور وہ توحید پرستی کے راستے پر گامزن ہو سکیں۔
انہوں نے مدتوں آسمان و زمین کی خلقت پر غور کیا تھا، ان پر حکمران قدرت کا مطالعہ کیا تھا اور آسمان و زمین کے شگفت انگیز اور تعجب خیز نظام کے بارے میں فکر کی تھی۔ نورِ یقین ان کے دل میں چمک رہا تھا (انعام۔ ۷۵)۔

منطق واستدلال کے سہارے

پہلے انہیں ستارہ پرستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ "زہرہ" ستارہ کہ جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افقِ مغرب پر چمک اٹھتا ہے، یہ لوگ اس کی پرستش و تعظیم میں مشغول تھے۔
حضرت ابراہیمؑ نے استفہامِ انکاری کے طور پر یا ان کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہم آہنگی کے اظہار کے طور پر پہلے کہا: یہ میرا خدا ہے۔
لیکن جس وقت وہ غروب ہو گیا تو کہا: مجھے غروب ہو جانے والے اچھے نہیں لگتے۔
جس وقت چاند افق کا سینہ چاک کر کے اُبھرا اور چاند کی پرستش کرنے والوں نے مراسم عبادت شروع کیے تو ان کے ساتھ ہم صدا ہو کر کہنے لگے: یہ میرا خدا ہے۔
اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا: اگر میرا پروردگار میری راہنمائی نہ کرے تو میں تو گمراہوں میں سے ہو جاؤں۔
آفتاب نے شبِ تیرہ کا پردہ ہٹایا اور کوہ و صحرا پر اپنی طلائی شعاعیں چھڑکیں تو سورج پرست عبادت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔
اس پر ابراہیمؑ نے کہا: یہ میرا خدا ہے، یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔
مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو گویا ہوئے: اے قوم! میں ان شریکوں سے بیزار ہوں کہ جو تم نے خدا کے لیے بنا رکھے ہیں۔ یہ تو سب غروب ہو جاتے ہیں، یہ تو سب خوبصورت تغیر و تبدل کا شکار اور قوانین آفرینش کے اسیر ہیں۔ ان کے تو اپنے بس میں کوئی ارادہ و اختیار نہیں چہ جائیکہ یہ خود اس جہان کے خالق اور اسے گردش دینے والے ہوں۔ میں تو اپنا رُخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس کے لیے میں اپنے ایمان میں خالص اور ثابت قدم ہوں اور میں ہرگز مشرکین میں شامل نہ ہوں گا (انعام۔ ۷۵، تا ۷۹)۔
ابراہیمؑ نے بت پرستوں سے مقابلہ نہایت خوبصورتی سے جیت لیا۔ کچھ لوگ بیدار ہو گئے اور باقی کم از کم اپنے عقائد کے بارے میں

Marfat.com

شک و شبہ میں پڑ گئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ علاقے میں یہ بات دھوم گئی۔ ہر کوئی سوچتا کہ یہ جوان کون ہے، اس کی باتیں کتنی منطقی ہیں، اس کا پیغام کتنا دلنشین ہے، اس کی آواز تو عوام کے دلوں میں اترتی جاتی ہے۔

آزر سے گفتگو

ایک اور مرحلہ آیا۔ ابراہیمؑ کی اپنے چچا آزر سے بحث ہونے لگی۔ کبھی بہت مضبوط انداز سے، محبت کے سلیقے سے اور کبھی تنبیہ و سرزنش کے لہجے میں، آپ نے اسے بت پرستی کے بارے میں خبردار کیا اور اُس سے کہا: تو ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتا ہے جو نہ سن سکتی ہے، نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی تیری کوئی مشکل حل کر سکتی ہے؟

آپؑ نے چچا سے کہا: اگر تو میری پیروی کرے تو میں تجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر تو شیطان کی پیروی کرتا ہے تو کہیں تجھے عذابِ الٰہی دامن گیر نہ ہو جائے۔

یہاں تک کہ ان کا چچا ان نصیحتوں کے جواب میں انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دیتا۔ آپؑ "سلام علیک" کہتے ہوئے اُسے جواب دیتے، میں تمہارے لیے استغفار کروں گا۔

اس طرح آپ کوشش کرتے کہ اُس سنگدل کے دل میں کوئی گنجائش نکل آئے۔ (مریم۔ ۴۷)

دورِ نبوت

حضرت ابراہیمؑ کب مبعوث بنبوت ہوئے، اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔ البتہ سورہ مریم سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپؑ نے اپنے چچا آزر سے بحث چھیڑی تو آپ مقامِ نبوت پر فائز ہو چکے تھے کیونکہ سورہ کہتی ہے:

واذکر فی الکتاب ابراهیم انه کان صدیقا نبیا اذ قال لابیه یا ابت لم تعبد ما لا یسمع و لا یبصر و لا یغنی عنك شیئا (مریم۔ ۴۱، ۴۲)

ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ بت پرستوں کے ساتھ شدید معرکہ آرائی اور آپ کو آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آگ میں ڈالے جانے کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۱۶ سال تھی۔ ہم اس کے ساتھ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ عظیم کارِ رسالت آغازِ نوجوانی ہی میں آپ کے دوش پر آن پڑا تھا۔

عملی مقابلے کا آغاز

بہرحال بت پرستوں کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی معرکہ آرائی روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک روز موقع پا کر آپ نے بابل کے بت خانے کے بڑے بت کے علاوہ تمام بت توڑ دیئے۔ یہاں سے زبانی محاذ آرائی عملی مقابلے کی شکل اختیار کر گئی۔

Marfat.com

سلطانِ جابر کے سامنے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخالفت اور محاذ آرائی کا ماجرا آخر کار نمرود کے کان تک پہنچ گیا۔ آپ کو دربار میں حاضر کیا گیا تاکہ وہ بزعم خویش پند و نصیحت کے ذریعے، یا ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے یا پھر دھمکی سے کام لے کر انہیں خاموش کردے۔

نمرود بہت چالاک تھا۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا: اگر تو ان بتوں کی پوجا نہیں کرتا تو پھر تیرا پروردگار کون ہے؟

آپؑ نے کہا: وہی —— جس کے قبضے میں موت و حیات ہے۔

وہ چلا کر کہنے لگا: اے بے خبر! یہ تو میرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ جس مجرم کو قتل کی سزا ملی ہو میں اسے آزاد کر دیتا ہوں اور ایسے قیدی کو جسے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، میں چاہوں تو اسے قتل کر دیتا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ دندان شکن جواب میں بہت ماہر تھے۔ نبوت کی طاقت سے مدد لیتے ہوئے آپؑ نے اس سے کہا: خدا کے ہاتھ میں صرف موت و حیات ہی نہیں بلکہ تمام عالم ہستی اس کے تابعِ فرمان ہے۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ ہر صبح سورج اس کے حکم سے افقِ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور وقتِ شام اس کے حکم سے مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ اگر تو عالمِ ہستی کی اس وسعت کا فرماں روا ہے تو کل معاملہ اس کے برعکس کردے تاکہ سورج مغرب سے نکلے اور مشرق میں ڈوب جائے۔

نمرود مبہوت ہو گیا۔ ایسا چکرایا کہ اس کی زبان میں جواب کی سکت نہ رہی (بقرہ - ۲۵۸)

اس میں شک نہیں کہ ابراہیمؑ خوب جانتے تھے کہ موت و حیات پر قدرت کے بارے میں نمرود کا دعویٰ بس چکر بازی اور تیز طراری ہے لیکن استدلال پر آپ کی مہارت اجازت نہ دیتی تھی کہ اسی موضوع پر بات کرتے رہیں کہ جسے مکار دشمن نے دستاویز بنا لیا ہے لہٰذا اسے چھوڑ کر فوراً ایسے موضوع پر بات شروع کی کہ جس پر وہ ہاتھ پاؤں مارنے کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا۔

ہجرت

آخر کار نمرود کی ظالم حکومت کی مشینری کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ جوان آہستہ آہستہ حکومت کے لیے خطرے کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ اس کی زبانِ گویا، فکرِ توانا اور منطقِ رسا کہیں پسے ہوئے محروم عوام کی بیداری اور آگاہی کا باعث نہ بن جائے کہیں لوگ استعمار کی زنجیر توڑ کر ان کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں لہٰذا حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ بت پرستوں کے جاہلانہ تعصب کا سہارا لے کر ابراہیم کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ انہیں ایک خاص انداز اور حالات پیدا کر کے لوگوں کے سامنے آگ کے دریا میں پھینکنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ سورہ انبیاء میں اس واقعے کی تفصیلات آئیں گی۔ یہ آگ درحقیقت لوگوں کی جہالت اور حکمران نظام کے ظلم کے ایندھن سے جلائی گئی تھی۔ حکومت اس طرح اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے آسودہ فکر کرنا چاہتی تھی۔

لیکن —— جب آگ حکمِ خدا سے خاموش ہو گئی اور ابراہیمؑ اس سے صحیح و سالم نکل آئے تو نمرود کے نظامِ حکومت میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ اب ابراہیمؑ ایک اور حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ ایک عام تفرقہ پرواز انسان نہ تھے کہ جسے وہ قتل کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو ایک خدائی رہبر تھے وہ ایک ایسے بہادر ہیرو تھے جو تن تنہا خالی ہاتھ طاقتور ظالم حکمرانوں پر حملہ کر سکتے تھے۔

Marfat.com

لہٰذا عوام کا خون چوسنے والے نمرود اور اُس کے درباریوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پوری قوت سے ابراہیمؑ کا مقابلہ کریں گے اور جب تک انہیں ختم نہ کرلیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

دوسری طرف ابراہیمؑ یہاں اپنا کردار ادا کر چکے تھے۔ آمادہ دل لوگ اُن پر ایمان لا چکے تھے۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ مومنین اور اپنے حامیوں کو ساتھ لے کر بابل سے نکل جائیں اور اپنی دعوتِ حق کو دُور دُور تک پھیلانے کے لیے شام، فلسطین اور فرعون کی سرزمین مصر کی طرف روانہ ہوں۔ آپ نے ان علاقوں میں حقیقتِ توحید کی تبلیغ کی اور بہت سے لوگ خدائے واحد پر ایمان لائے۔

رسالت کا آخری مرحلہ

حضرت ابراہیمؑ نے تمام عمر ہر طرح کی بت پرستی خصوصاً انسان پرستی کے خلاف جہاد کرتے گزاری۔ آپ نے آمادہ دلوں کو نورِ توحید سے روشن کیا۔ آپ نے انسانی جسموں میں نئی روح پھونک دی اور بہت سے لوگوں کو خود غرضوں اور خود سروں کی قید سے رہائی دلائی۔ اب ضروری تھا کہ آپ بندگی و خدا کے آخری مرحلے میں قدم رکھیں اور اپنی متاعِ حیات کو طبقِ اخلاص میں رکھ کر بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیں تاکہ خدا کی عظیم آزمائشوں سے گزر کر ایک عظیم روحانی انقلاب کے ذریعے انسانوں کی امامت کے مرحلے میں داخل ہوں۔

اس کے ساتھ ساتھ اب انہیں خانۂ توحید یعنی خانۂ کعبہ کی بنیادوں کو بھی بلند کرنا تھا اور اسے خدا پرستی کے ایک بے نظیر مرکز میں تبدیل کرنا تھا اور تمام آمادہ دل مومنین کو اس عظیم مرکزِ توحید کے پاس ایک عظیم کانفرنس کی دعوت دینا تھا۔

آپ نے اپنی کنیز ہاجرہ کو اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ اس سے انہیں اسماعیل جیسا بیٹا نصیب ہوا۔ آپ کی پہلی بیوی سارہ نے اُن سے حسد کیا۔ یہی حسد سبب بنا کہ آپ ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے کو حکمِ خدا سے فلسطین سے لے کر مکہ کی جلتی ہوئی سنگلاخ پہاڑوں کی سرزمین میں لے گئے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پانی کی ایک بوند بھی دستیاب نہ تھی۔ آپ حکمِ خدا سے ایک عظیم امتحان سے گزرتے ہوئے انہیں وہاں چھوڑ کر واپس فلسطین آ گئے۔

وہاں چشمۂ زمزم پیدا ہوا۔ اس اثنا میں جرہم قبیلہ ادھر سے گزرا۔ اُس نے جناب ہاجرہ سے وہاں قیام کی اجازت چاہی ـــــ گویا واقعات کا ایک طولانی سلسلہ ہے کہ جو اس علاقے کی آبادی کا باعث بنا۔

حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے دُعا کی تھی کہ اس جگہ کو آباد اور پُر برکت شہر بنا دے اور لوگوں کے دل میری اولاد کی طرف مائل کر دے۔ ان کی اولاد وہاں پھلنے پھولنے لگی تھی [1]

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ بعض مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ ہاجرہ اور شیر خوار اسماعیل کو مکہ میں چھوڑ کر واپس جانا چاہتے تھے تو جناب ہاجرہ نے فریاد کی، اے ابراہیم آپ کو کس نے حکم دیا ہے کہ ہمیں ایسی جگہ پر چھوڑ جائیں کہ جہاں نہ کوئی سبزہ ہے، نہ دودھ دینے والا کوئی جانور، یہاں تک کہ جہاں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں ہے۔ آپ پھر بھی ہمیں بغیر زادِ توشہ اور مونس و مددگار کے چھوڑے جا رہے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے مختصر سا جواب دیا: میرے پروردگار نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔

---

[1] سورہ ابراہیم ۳۷ تا ۴۱۔

Marfat.com

ہاجرہ نے یہ سنا تو کہنے لگیں: اگر ایسا ہے تو پھر خدا ہرگز ہمیں یونہی نہیں چھوڑے گا۔[1]

حضرت ابراہیمؑ بار بار فلسطین سے اسماعیلؑ کو ملنے کے لیے مکہ آئے۔ ایک سفر کے موقع پر آپ مراسم حج بجا لائے اور حکم خدا سے اپنے آبرومند اور نہایت پاکیزہ صاحب ایمان نوجوان بیٹے اسماعیل کو لے کر قربان گاہ میں آئے۔ اسماعیلؑ آپ کی زندگی کا بہترین ثمر تھے۔ آپ بالکل تیار تھے کہ انہیں راہ خدا میں قربان کر دیں۔

اس اہم ترین آزمائش سے جب آپ نہایت عالی طریقے سے عہدہ برآ ہو چکے اور آخری مرحلے تک اپنی آمادگی کا مظاہرہ کر چکے تو اللہ تعالٰے نے ان کی قربانی کو قبول کر لیا اور اسماعیلؑ کو بچا لیا اور قربانی کے لیے ایک دُنبے کو بھیج دیا۔[2]

حضرت ابراہیمؑ ان سب امتحانات سے کامیابی سے گذر چکے اور آزمائشوں کی اس کٹھالی سے کامیاب نکل آئے تو آپ کو ایک ایسا مقام حاصل ہوا جو وہ بلند ترین مقام ہے جو ایک انسان ترقی کر کے حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

اللہ نے کچھ کلمات کے ذریعے ابراہیم کا امتحان لیا۔ وہ ان سب سے کامیاب گزرے تو اس پر اللہ نے اُن سے کہا: میں تجھے لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیتا ہوں۔ (ابراہیم اس خوشخبری پر وجد میں آ گئے) کہنے لگے: یہ مقام میری کچھ اولاد کو بھی عطا کر دے۔ (ان کی دعا قبول ہو گئی لیکن ایک شرط کے ساتھ) اللہ نے کہا: یہ مقام ہرگز کسی ایسے شخص کو نصیب نہ ہو گا جس سے ظلم و ستم اور انحراف سرزد ہوا ہو۔[3]

قرآن اور ابراہیمؑ کا مقام بلند

آیات قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰے نے حضرت ابراہیمؑ کو بہت بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ ایسا بلند مقام اللہ تعالٰے نے کسی اور گذشتہ نبی کو عطا نہیں فرمایا۔

اس پیغمبر خدا کی عظمت ان تعبیرات سے واضح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے:

۱۔ خدا نے ابراہیمؑ کی ایک "امت" قرار دیا ہے اور ان کی شخصیت کو ایک امت کی مانند گردانا ہے (نحل - ۱۲۰)۔

۲۔ اللہ نے آپ کو خلیل اللہ کا مرتبہ عطا فرمایا ہے:

واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً (نساء - ۱۲۵)

یہ امر قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں ہے:

یہ مقام انہیں اس بناء پر حاصل ہوا کہ ابراہیمؑ نے خود کبھی کسی چیز کے لیے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا اور کبھی کسی سائل کو محروم نہیں لوٹایا۔[4]

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۱ صفحہ ۱۰۳۔

[2] صٰفٰت ۱۰۴ تا ۱۰۷۔

[3] بقرہ - ۱۲۴۔

[4] سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۴۶۷۔

Marfat.com

۳۔ قرآن کے مطابق وہ نیک[1]، صالح[2]، قانتین میں سے[3]، صدیقین میں سے[4]، صابرین میں سے[5] اور ایفائے عہد کرنے والوں میں سے تھے[6]

۴۔ ابراہیمؑ بہت زیادہ مہمان نواز تھے[7] یہاں تک کہ بعض روایات میں انہیں ابو اضیاف (مہمانوں کا باپ یا مہمانوں کا ساتھی) کا لقب دیا گیا ہے[8]

۵۔ ان کا توکل بے مثال تھا۔ یہاں تک کہ کسی کام اور کسی مشکل میں خدا کے علاوہ کسی پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ بھی مانگتے خدا ہی سے مانگتے اور اُس کے علاوہ کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے تھے[9]

جب ہٹ دھرم قوم آپ کو آگ کے سمندر میں پھینک رہی تھی۔ فرشتوں نے خواہش کی کہ ہم آپ کو بچالیں۔ ابراہیمؑ نے اُن کے اس تقاضے کو قبول نہ کیا۔ تاریخ میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔ آپؑ نے کہا: میں سرتاپا نیاز و احتیاج ہوں لیکن مخلوق سے نہیں صرف خالق سے[10]

۶۔ شجاعت و بہادری میں بے مثال تھے۔ بت پرستوں کے دھاڑتے ہوئے سیلاب کے سامنے تنہا کھڑے ہوگئے۔ ان کا دل لمحہ بھر کے لیے بھی ان سے وحشت زدہ نہ ہوا۔ آپ نے ان کے بتوں کا مذاق اڑایا اور ان کے بت کدے کو ڈھا کر پتھروں کا ڈھیر بنادیا نیز نمرود اور اُس کے جلادوں کے سامنے بڑی جرأت سے بات کی جو قرآنی آیات میں موجود ہے۔

۷۔ ابراہیمؑ بڑی قوی منطق سے بات کرتے تھے۔ آپ نے گمراہوں کو بہت مختصر، محکم، دندان شکن استدلال سے جواب دیئے اور اپنے منطقی استدلال سے مخالفین کو رسوا کر دیا۔

آپ کبھی سختی و خشونت سے پیش نہیں آتے تھے بلکہ بڑے اطمینان سے بات کرتے۔ آپ کا یہ انداز آپ کی عظیم روحانی قوت کا ترجمان تھا۔ آپ نے گفتار و کردار سے مخالفین کو شکست دی۔ نمرود کے سامنے آپ کی بات چیت اور اپنے چچا آزر سے آپ کی گفتگو بابل کے قائیوں

1۔ ص ۔ ۴۷
2۔ نحل ۔ ۱۲۲
3۔ نحل ۔ ۱۲۰
4۔ مریم ۔ ۴۱
5۔ توبہ ۔ ۱۱۴
6۔ نجم ۔ ۳۷
7۔ ذاریات ۲۴ تا ۲۷
8۔ سفینۃ البحار جلد ۱ ص۹
9۔ شعراء ۔ ۷۸ تا ۸۲
10۔ کامل ابن اثیر جلد ۱ ص۹۹

Marfat.com

سے آپ کا مناظرہ بڑی وضاحت سے مرقوم ہے۔ بابل کے قاضی آپ کو خدا پرستی اور بت شکنی کے جرم میں سزا دینا چاہتے تھے آپ نے بڑے اعتماد اور اطمینان سے مدلل جوابات دیئے۔ اس سلسلے میں سورہ انبیاء کی مندرجہ ذیل آیات کو غور سے پڑھنا چاہیے:

قاضیوں نے آپ سے پوچھا: کیا وہ تم ہی ہو جس نے ہمارے خداؤں کے سر پر یہ مصیبت ڈھائی ہے اور ان سب چھوٹے بڑے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔

قالوا ءانت فعلت هٰذا بالٰهتنا یا ابراهیم

(کہنے لگے: اے ابراہیم کیا وہ تم ہی ہو جس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے؟)۔

آپ نے انہیں ایسا جواب دیا کہ ان کے لیے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ رہی۔ قرآن کے الفاظ میں:

قال بل فعله کبیرهم هٰذا فاسئلوهم ان کانوا ینطقون

بولے، ہو سکتا ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہو اگر یہ بات کر سکتے ہیں تو انہی سے پوچھو۔

اس ایک ہی جملے سے آپ نے اپنے دشمنوں کے لیے تمام راستے بند کر دیئے۔ اب اگر وہ کہیں کہ بت گونگے ہیں، لب بستہ ہیں اور بات کرنے کی سکت نہیں رکھتے، تو ان گونگے اور بے عزت خداؤں کی کتنی رسوائی ہے اور اگر کہیں کہ یہ بات کر سکتے ہیں تو پھر ان سے پوچھنا پڑتا اور انہیں جواب دینا پڑتا۔

اس پر ان کا خوابیدہ وجدان جاگ اٹھا۔ ان کے اندر سے آواز آئی، تم ظالم اور خود پرست ہو، نہ اپنے اوپر رحم کرتے ہو اور نہ اپنے معاشرے پر۔

قرآن کے الفاظ میں:

فرجعوا الی انفسهم فقالوا انکم انتم الظالمون

بہر حال جواب تو انہیں دینا ہی تھا۔

ثم نکسوا علی رءوسهم لقد علمت ما هٰؤلاء ینطقون

بڑی بے دلی سے سر شکستہ ہو کر کہنے لگے، تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔

یہاں حضرت ابراہیم کی بات ان کے سر پر بجلی بن کر گری۔ آپ نے پکار کر کہا:

اف لکم و لما تعبدون من دون الله افلا تعقلون

حیف ہے تم پر اور ان پر کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری عقلوں کو؟۔

آخر کار جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ابراہیمؑ کی قوی منطق کے مقابلے کی سکت نہیں رکھتے تو انہوں نے پھر تمام بھولے سرکشوں کی طرح طاقت کا سہارا لیا اور کہنے لگے، انہیں چاہیے کہ اسے جلا دو۔

اس کام کے لیے انہوں نے بت پرستوں کے جاہلانہ تعصبات سے مدد لی اور پکار کر کہا، اگر تم میں طاقت ہے تو اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ (قالوا حرقوه وانصروا الٰهتکم ان کنتم فاعلین)[1]

---

[1] انبیاء - ۶۲ تا ۶۸ -

یہ ابراہیم کی رسا، استدلالی اور قاطع منطق کا ایک نمونہ تھا۔

۸ - یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ایک امزاز یہ شمار کرتا ہے کہ وہ دینِ ابراہیم پر ہیں[۱] اور قرآن کہتا ہے کہ انہی نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے[۲] یہاں تک کہ مسلمانوں کو شوق دلانے کے لیے ان کے چند احکام پر عمل درآمد کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں ابراہیم اور ان کے انصار کی اقتداء کرنا چاہیے[۳]

۹ - اس عظمت وشکوہ سے مراسمِ حج کی بنیاد حکمِ الٰہی سے حضرت ابراہیمؑ نے رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مراسمِ حج میں ابراہیمؑ کا نام، اُن کی یاد اور ان کا ذکر موجود ہے[۴]

۱۰ - ابراہیمؑ کی شخصیت اس قدر بلند ہے کہ ہر گروہ کی کوشش تھی کہ انہیں اپنے میں سے قرار دے۔ یہودی اور عیسائی ابراہیمؑ کے ساتھ اپنے تعلق پر بہت زور دیتے تھے یہاں تک کہ قرآن ان کے جواب میں یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ وہ ایک مسلمان اور سچے مؤحد تھے یعنی وہ سراسر حکمِ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم تھے، اس کے علاوہ انہیں کوئی سوچ نہ تھی اور بس اسی کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے[۵]

تفسیر نمونہ دسویں جلد اختتام کو پہنچی

۱؎ و ۲؎ ملة ابیکم ابراهیم ...... (حج - ۷۸)۔

۳؎ ممتحنہ - ۴ ۔ ۴؎ ملاحظہ ہو سورہ حج ۲۶ ۔ ۵؎ آل عمران ۶۷ ۔

Marfat.com

تفسیر نمونہ

جلد ۱۰

کا ــــ ترجمہ

اس حقیر پرتقصیر ــــ سید صفدر حسین نجفی ولد سید غلام سرور نقوی (مرحوم)
کے قلم سے ــــ
۱۵ صفر المظفر ۱۴۰۶ھ ــــــ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۵ء بروز بدھ
ساڑھے نو بجے صبح ــــ حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر پرسٹن لنکا شائر ــــ برطانیہ
کے دفتر میں اختتام پذیر ہوا۔

الحمد للہ اولا و اٰخرا وصلوٰۃ اللہ علی نبیہ
و اٰلہ ابدًا سرمدًا

سید صفدر حسین نجفی

سرٹیفکیٹ

تفسیر نمونہ جلد دہم طبع اوّل کو میں نے بغور پڑھا ہے اس میں کوئی لفظی یا اعرابی غلطی نہیں ہے

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل

مدرسہ امامیہ قرأت کالج موچی دروازہ
لاہور

Marfat.com